

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہی ہیں



توضیح الدلائل

بجواب

پانچ اہم مسائل

مُصنّف

استاذ العلماء قاضی محمد عظیم نقشبندی

ریٹائرڈ ضلع قاضی کوٹلی آزاد کشمیر

مجلس علماء اہلسنت

وادی بناہ کھوئی رٹہ آزاد کشمیر

نام کتاب: توضیح الدلائل بجواب پانچ اہم مسائل

مؤلف: حضرت علامہ قاضی محمد عظیم نقشبندی

(سابق ضلع قاضی کوٹلی آزاد کشمیر)

کمپوزنگ: صغیر احمد قادری (قادری کمپوزنگ دینہ)

ڈیزائننگ: ممتاز شریف مغل (قادری کمپوزنگ دینہ)

قیمت:

اشاعت اول: محرم الحرام ۱۴۳۱ھ، جنوری 2010ء

اشاعت دوم: شعبان المعظم ۱۴۳۱ھ، جولائی 2010ء

ملنے کا پتہ

قاضی محمد عظیم نقشبندی 0355-7502193

جامعہ محمدیہ حنفیہ کھوئی رٹہ 0300-5315223

جامعہ قادریہ ڈونگی 0300-5315223

جامعہ مسجد عباس گھوڑا 0346-5286259

خوشبوئے مدینہ مسجد کھجورلہ 0300-9536420,03445751600:

ناشر : مجلس علماء اہلسنت وادی بناہ کھوئی رٹہ آزاد کشمیر

فہرست مضامین

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

افتتاحیہ

امابعد! ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ضعف بصارت، اور نحافت نے معمولات زندگی کو محدود و مختصر کر دیا تھا۔علمی سرگرمیاں بھی بقدر ضرورت تھیں، رمضان المبارک سے چند ایام قبل قاری مسعود احمد نقشبندی موبائل پر ایک میسج لائے، جو پانچ سوالات پر مشتمل تھا، راقم نے اختصار پر مبنی جوابات تحریر کر دیے، مگر چند ایام کے بعد ایک کتابچہ عنوانی پانچ اہم مسائل دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ اس کا جواب مطلوب ہے، راقم نے وہ کتابچہ مدعیان علم وعظمت کے پاس بھیجا مگر انہوں نے بھی جواب کے لیے کمر ہمت نہ باندھی۔ کتابچہ واپس آیا معذرت کے باوجود قاری صاحب نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ موضوع، موضوعات پر ضخیم کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے، مگر منکر کے انکار، معترض کے اعتراض کا جواب تحریر کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ راقم نے اس مشکل کام کے لیے صاحبزادہ مولانا عبدالحمید قادری ناظم اعلیٰ جامعہ محمدیہ حنفیہ کھوئی رٹہ، جامعہ قادریہ ڈونگی سے رابطہ کیا،

موصوف نے ہر قسم کے تعاون کا بھرپور یقین دلایا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر کرم سے انہی کتب سے جوابات تحریر کیے جن کو مستند گردان کر مولف مفتی احمد مختار نے پانچ مسائل کو صورت کتابچہ میں تشکیل دیا تھا اس سعی کی تکمیل اور تدوین میں مالی اعانت بنیادی حیثیت رکھتی ہے میں مالی تعاون کرنے والوں کا بے حد مشکور ہوں۔ لیکن بالخصوص فراہمی کتب میں عزیز محترم پروفیسر جمروز صدیقی کا احسان مند ہوں جنہوں نے تفسیر کبیر مہیا فرمائی۔ اور تمام اہلسنت کو اس نوجوان عالم دین، اور مجاہد اہلسنت کا ممنون احسان ہونا

چاہیے جنہوں نے رمضان المبارک کی دینی و مذہبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اصل مسودہ کی کمپوزنگ کی اور دیگر اشاعتی معاملات میں حد درجہ تعاون کرنے کا عہد کیا وہ مسلک کا درد رکھنے والے محمد صغیر احمد قادری آف دینہ ہیں۔ زادہ اللہ علما و عملا

بندہ گنہگار کو ہر آن اور ہر مقام پر اپنی علمی سفید پوشی کا اعتراف ہے، اہل علم، علمی کوتاہی ملاحظہ کرنے پر راقم کو ضرور مطلع فرمائیں۔ احباب اہلسنت سے التماس ہے کہ وہ اس کاوش کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل خیر کو اپنی بارگاہ احدیت میں قبول فرمائے اور بندہ ناچیز کے لیے ذریعہ نجات بنائے

آمین یا رب العالمین

بندہ گنہگار

قاضی محمد عظیم نقشبندی فاروقی، کھوئی رٹہ

سابق ضلع قاضی آزاد کشمیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

وعلی آلک واصحابک یا حبیب اللہ

فرشتوں، جنوں اور آدم علیہ السلام کا مادۂ تخلیق

کتابچہ عنوانی پانچ مسائل مفتی احمد ممتاز کا مؤلفہ ہے جسکی تمہیدی گفتگو میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور پوری کائنات مخلوق۔

مخلوق کی دو قسمیں ہیں۔ ذوی العقول (عقل والی مخلوق) اور غیر ذوی العقول (بے عقل) پھر ذوی العقول کی تین قسمیں ہیں:

(۱) نوری مخلوق (۲) ناری مخلوق (۳) خاکی مخلوق

☆ نوری مخلوق ملائکہ ہیں جو خالص نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔

☆ ناری مخلوق جنات ہیں جو خالص آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔

☆ خاکی مخلوق انسان اور بشر ہے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

مفتی احمد ممتاز نے ان اقسام کی صحت اور حصر پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بھی نقل کی ہے جو یہ ہے:

"قالت قال رسول اللہ ﷺ خلقت الملئکۃ من نور، و خلق الجآن من مارج من نار، و خلق آدم مما وصف لکم"

(رواہ مسلم بحوالہ مشکوۃ باب بدء الخلق ص: ۵۰۶)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

فرشتے نور سے پیدا کئے گئے اور جن آگ سے اور آدم علیہ السلام اس چیز سے جس کے اوصاف تمہارے لئے بیان ہو چکے ہیں۔

جواباً کہا جائے گا کہ احمد ممتاز نے اس حدیث کو نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام انسانوں کی طرح انبیاء کرام خصوصاً رسول اللہ ﷺ خا کی، محض انسان اور محض بشر ہیں، یہ اس کی اپنی سوچ اور اپنا نقطہء نظر ہے جو حقائق اور دلائل کی روشنی میں غلط اور باطل ہے۔

اوّلاً: مفتی احمد ممتاز کی کج فہمی یہ تقسیم ذوی العقول ہونے کے اعتبار سے نہیں، بلکہ مبداء ماہیّت اور حقیقت کے لحاظ سے ہے اور اس کی دلیل، اور قرینہ خلقت من نور، اور خلق من نار کے خصوصی الفاظ ہیں، جو فرشتوں، جنات اور جناب آدم علیہ السلام کی ماہیت اور مادہ پر دلالت کرتے ہیں،۔

ثانیاً: رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ **خلق آدم من تراب، بلکہ فرمایا مما وصف لکم** ابہام رکھ کر فرمایا کہ آدم کی حقیقت، ماہیت وہی ہے جو تراب، طین، صلصال اور حما مسنون کی صفات سے متّصف ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے **خلقه من تراب** ''ہ'' ضمیر کا مرجع آدم علیہ السلام ہیں، یعنی آدم علیہ السلام کو تراب سے پیدا کیا گیا۔

خلق الانسان من صلصال۔الانسان میں الف لام عہد خارجی اور انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، جنکی پیدائش صلصال سے ہوئی۔

''ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون''

یقیناً اس انسان (آدم) کو ہم نے صلصال اور حما مسنون سے پیدا فرمایا، قرآن حکیم نے ماہیت آدم اور وجود کی ترکیب اور تخلیق میں چار چیزوں کو نامزد کیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے تو اس سے خلقه من تراب پر تو عمل ہو جائے گا مگر

بقیہ آیات پر عمل اور عقیدہ کیسے ہوگا؟

ایک سوال اور اس کا جواب

ثالثاً: اگر یہ کہا جائے کہ یہ چاروں نام اور چاروں صفات مٹی کی ہیں لہذا یہ کہنا کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے درست ہے کیونکہ **طین، صلصال، حمامسنون** بھی مٹی کے نام ہیں۔

(۱) جواباً کہا جائے گا کہ : بے شک یہ تمام نام مٹی کے ہیں لیکن باہم مختلف ہیں قانون ہے کہ اختلاف اسماء اختلاف مسمیات کو مستلزم ہے۔ آدمی، گھوڑا، بیل، بکری اور دیگر حیوانات، ہر ایک کا اپنا نام، اپنی اپنی خاصیات اور اپنا مصداق ہے، باوجود یکہ جاندار ہونے میں سب برابر، سب شریک اور اس کا سب پر اطلاق ہوتا ہے، اور سب اس کے افراد ہیں،

(۲) یہ اسماء ایسے ہیں جن کا ایک دوسرے پر اطلاق نہیں ہوسکتا باوجود یکہ تراب کے افراد ہوکر ایک ہی ماہیت اور ایک ہی حقیقت رکھتے ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ انسان نوع ہے کلی ہے، زید، عمرو، بکر، اس کے افراد ہیں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زید، عمرو، بکر انسان ہیں مگر یہ کہنا درست نہیں کہ زید عمرو ہے، بکر زید ہے، عمرو بکر زید ہیں، اسی طرح **طین، صلصال، حمامسنون** تراب تو ہیں مگر طین کو **صلصال، صلصال** کو **حمامسنون** کہنا درست نہیں کیونکہ یہ تراب کے افراد ہیں اور ایک فرد کا اطلاق دوسرے فرد پر درست نہیں۔ درست نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ افراد نوعی اور شخصی ہیں۔

افراد نوعی اور شخصی کے درمیان لازمی اور فطری طور پر امتیاز اور تغائر ذاتی ہوتا ہے۔

رابعاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تقسیم حقیقت اور نفس الامر کے اعتبار سے فرمائی ہے۔

مکالمہ شیطان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ تقسیم ذوی العقول کے اعتبار سے نہیں بلکہ مادہ

ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب شیطان سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے یہی جواب دیا کہ آدم کو تو نے طین سے پیدا کیا ہے اور مجھے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے جس طرح آگ مٹی سے بہتر ہے اسی طرح میں آدم سے بہتر ہوں آگ مٹی سے کیوں بہتر ہے تفصیل آگے آرہی ہے۔

(خامساً) تراب، صلصال اور حما مسنون کی ہیئت اور تشخص میں فرق ہے۔

حافظ ابن کثیر نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ابن عساکر اور حافظ ابو یعلیٰ کی حدیث نقل کرتے ہوئے تحریر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان اللہ خلق آدم من تراب ثم جعلہ طینا ثم ترکہ حتی اذا کان حما مسنون خلقہ و صورہ ثم ترکہ حتی اذا کان صلصالا کالفخار ثم نفخ اللہ فیہ من روحہ" (البدایہ والنھایہ، ص، ۸۰، ج، ۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پہلے تراب سے پیدا فرمایا، پھر تراب کو طین بنایا پھر اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ حماءٍ مسنون ہو گئی اس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی صورت بخشی گئی یہاں تک وہ فخار کی مثل صلصال ہو گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں اپنی روح پھونکی،،

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"الاخبار متظاھرۃ علی انہ تعالٰی خلق آدم من تراب قبض من وجہ الارض و خمرہ حتی صار طینا ثم ترکہ حتی صار صلصال و کان ملقی بین مکۃ و الطائف ببطن نعمان" (مرقاۃ ج، ۱۱، ص، ۶)

ترجمہ: ظاہراً احادیث دلالت کرتی ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا جو روئے زمین سے لی گئی تھی اور اس کا خمیر بنایا گیا تھا، یہاں تک کہ اس نے طین کی

شکل اختیار کرلی، یعنی گوندھنے کے بعدوہ طین بن گئی، پھراس کواسی حالت پر چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ وہ صلصال ہوگئی، پھراس کو مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نعمان میں رکھا گیا۔

حکیم ترمذی اور ابن عدی نے الکامل میں ابو ہریرہ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے جس میں **عجنه بماء الجنة** کے الفاظ بھی ہیں (مرقاۃ) اور یہ بھی احادیث میں ہے کہ آدمس کو صورت بشری دے کر عرصہ تک جنت میں رکھا گیا۔

ہر دو عبارات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تراب یعنی مٹی سے پیدا فرمایا یہ مٹی روئے زمین پر پائی جانے والی ہر قسم کی مٹی کا مجموعہ تھی، اس عام قسم کی مٹی کو جنت کے پانی سے گوندھا گیا یہ مٹی طین کہلائی پھر اس طین کو ایک عرصہ تک اسی حالت اور اسی کیفیت پر چھوڑ دیا گیا ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ طین چالیس سال تک اپنی کیفیت اور اپنی حالت پر رہی، چالیس سال کے بعد اس کو **حماء مسنون** میں ڈھالا گیا۔ **حماء مسنون** کو آدم کی شکل، جسم اور صورت پہنائی گئی پھر اس پتلائے آدم کو ایک مدت تک چھوڑ دیا گیا۔

اور جب روح کی برداشت اور تحمّل کے قابل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں روح ڈالی۔

ابن کثیر نے فرمایا **فخلقه الله بيده** کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔ (البدایہ والنھایہ، ا، ص، ۷۹)

معلوم ہوا آدم علیہ السلام کو صرف تراب سے پیدا نہیں کیا گیا تا کہ فوری کہہ دیا جائے کہ آدم علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاکی ہیں۔ عرف عام میں بھی خاک کا لفظ اور مفہوم کمتری اور حقارت کے لیے بولا جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حقارت اور کمتری کے لیے بولے جانے والے لفظ کا استعمال یقیناً بے ادبی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فرمایا: **مما وصف لکم** اللہ تعالیٰ نے **خلقه من تراب** فرمایا۔ اور دوسرا اگر کوئی ان پر خاکی کا لفظ اطلاق کرے تو بے ادبی، اور شان رسالت، مقام خلافت اور مرتبۂ نبوت کی توھین اور تنقیص نہیں تو اور کیا ہے؟

قرآن کریم اور احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے عام مٹی اجزائے ارض سے لی گئی پھر جنت کے پانی سے گوندھ کر طین، پھر صلصال اور پھر حماء مسنون بنائی گئی، اسی طرح عام مٹی کو ایک طویل مدّت تک رکھ کران مدارج سے گزارا گیا۔ اگر وہ خاک ہی ہوتی تو اسی نوعیت اور کیفیت کی حامل ہوتی تو ایک مدت مدید تک رکھنے اور پھر مختلف ناموں سے موسوم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خلاصہء کلام یہ ہے کہ حدیث پاک میں مخلوق کی تقسیم ذوی العقول ہونے کے اعتبار سے نہیں بلکہ حقیقت اور ماہیت کے لحاظ سے ہے،

جیسا کہ خلق من نار، خلق من نور، خلق مما وصف لکم سے عیاں ہے اور یہی الفاظ قرینہ کے طور پر شہادت دے رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ردیگر انبیاء کرام کیلئے خاکی کا لفظ بولنا کمال بے ادبی ہے،

مؤلف نے تمہیدی گفتگو کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ تیسری خاکی مخلوق جو انسان اور بشر ہے یعنی حضور ﷺ خاکی، انسان اور بشر ہیں۔ حضور ﷺ بشر اور انسان ضرور ہیں مگر احمد ممتاز جس معنی میں کہہ رہا ہے اس میں نہیں، انشاء اللہ ہم اس پر گفتگو کریں گے لیکن لفظ خاکی کا اطلاق رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء کرام کی ذوات پر بولنا، لکھنا حد درجہ بے ادبی اور گستاخی ہے۔ راعنا کا لفظ جب غلط طریقے اور غلط معنی جو کہ شان نبوت کے منافی تھا میں استعمال ہونے لگا تو اس کے بولنے پر پابندی عائد کر دی گئی اور حکم ہوا:۔

"لا تقولو اراعنا و قولو اانظرنا"

احمد ممتاز نے خاکی مخلوق جو انسان اور بشر ہے" کا حکم تمام اولاد آدم کے لیے ثابت کیا ہے اور وجہء استدلال یہ بتائی ہے کہ چونکہ آدم علیہ السلام مٹی / خاک سے پیدا ہوئے لہذا ان کی ساری اولاد اور نسل خاکی ہے، جس کو انسان اور بشر کہا گیا ہے بلکہ یہ حکم تمام اولاد آدم پر حاوی اور نوع انسان اور بشر پر محیط نہیں، کیونکہ اس کی نفی میں متعدد آیات قرآنیہ وارد ہوئی ہیں مثلاً

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"ایحسب الانسان ان یترک سدی"

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بیکار چھوڑ دیا جائے گا

الم یک من منی یمنی کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکا یا گیا (القیامۃ)

"ھو الذی خلق من المآء بشرا فجعلہ نسبا و صھرا" (الفرقان)

اللہ وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب والا اور سسرالی رشتوں والا بنا یا۔

"و لقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ثم جعلہ نطفۃ فی قرار مکین"

(المومنون)

یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر اس کو نطفہ بنا کر محفوظ جگہ، رحم مادر میں قرار دے دیا۔

"فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفۃ" (الحج)

بے شک ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور پھر نطفہ سے

"اولم یر الانسان انا خلقنہ من نطفۃ" (یسن)

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

"انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج" (الدھر)

بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

"و لقد خلقنا الانسان من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین" (یسن)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر وہ صریح جھگڑالو بن گیا۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوا کہ انسان اور بشر یعنی تمام اولاد آدم کو پانی کی بوند سے پیدا کیا گیا

ہے من نطفة کے الفاظ اس پر گواہ ہیں۔ جب لفظ کا معنی صریح اور حقیقی موجود ہو بلا وجہ تاویل بعید میں لے جا کر مَن پسند معنی نکالنا اور اس پر حکم جاری کرنا ہرگز روا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں جب وہ خاکی ہیں تو ان کی اولاد بھی خاکی ہوگی تو جواباً کہا جائے گا اس اصول کی بنیاد پر آدم علیہ السلام کی اولاد اور نسل کو بھی خلیفة ہونا چاہیے

کیونکہ آدم علیہ السلام خلیفة تھے۔ مٹی سے تخلیق کا صریح حکم فقط آدم علیہ السلام کے لیے ہے اولاد آدم کے لیے من نطفة کی تخصیص موجود ہے۔ مزید اگر آدم علیہ السلام کے خاکی ہونے کی بنیاد پر تمام اولاد آدم کو خاکی ہی کہا جائے تو یہ بھی کہنا پڑیگا کہ ہر فرد خاکی کو اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے کیونکہ آدم کو تو اللہ نے اپنے ہاتھوں بنایا تھا۔ واضح رہے کہ ساری مخلوق میں انسان افضل ہے تمام انسانوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم افضل اور باعث افضلیت ہیں۔

مؤلف نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر ثابت کرنے کے لیے یہ عنوان قائم کیا کہ:

ان اقسام ثلٰثہ میں افضل کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ (ص ۷) پھر یہ حدیث نقل کی:

”عن العباس رضی اللہ عنہ انہ جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فکانہ سمع شیئا فقام النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی المنبر فقال من انا فقالوا انت رسول اللہ قال انا محمد ابن عبد اللہ بن عبد المطلب ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرھم، ثم جعلھم فرقتین فجعلنی فی خیرھم فرقۃ، ثم جعلھم قبائل فجعلنی فی خیرھم قبیلۃ ثم جعلھم بیوتا فجعلنی فی خیرھم بیتا و انا خیرھم نفسا و خیرھم بیتا“

(رواہ الترمذی، مشکوۃ ص ۵۱۳)

ترجمہ : حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے پس گویا کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب کے بارے میں کچھ طعن و تشنیع کے کلمات

سنے تھے آپ ﷺ نے منبر پر تشریف فرما ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ میں کون ہوں ؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے جواب دیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ،آپ ﷺ نے فرمایا میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ یقیناً اللہ نے ساری مخلوق کو پیدا کیا اوران میں سے سب سے بہتر مخلوق (انسان) میں سے مجھے بنا دیا۔ پھر اس بہتر مخلوق (انسان کی) دو جماعتیں (یعنی عرب وعجم) بنا دیں اور مجھے ان میں سے بہتر جماعت (یعنی عرب) میں سے بنا دیا پھراس بہتر جماعت (یعنی عرب) کے متعدد قبیلے بنا دیئے اور مجھے سب سے بہتر قبیلہ (یعنی قریش) میں سے بنا دیا، پھراس بہتر قبیلہ (یعنی قریش) کومختلف خاندانوں میں تقسیم کیا اور مجھے سب سے بہتر خاندان بنی ھاشم میں سے بنا دیا۔ پس میں ذاتی اوصاف کے اعتبار سے بھی ان سب سے بہتر ہوں۔

پھر فائدہ:۔ کے تحت لکھا کہ قارئین کرام ذراغور اور ٹھنڈے دل سے اس حدیث کو پڑھیے اس میں کس وضاحت سے آپ ﷺ نے انسان اور بشر کو تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ گویا اس حدیث سے بشر کا تمام مخلوق سے افضل ہونا صراحت سے ثابت ہوا۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ انسان اور بشر ہیں۔

بلکہ بشر کے اعلیٰ اور ارفع طبقہ سے ہیں اور بشر کے اس طبقہ میں ہونے پر آپ ﷺ کو فخر ہے۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ ہم نے اس حدیث پاک کو غور سے پڑھا اور سمجھا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ غور وفکر کی دعوت دینے والے احمد ممتاز نے پڑھا اور اس سے جو استدلال کیا وہ غلط اور مضمون حدیث کے برعکس اور الفاظ حدیث کے منافی ہے، حدیث کا یہ مفہوم نہیں جو کتابچہ میں تحریر ہوا ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتوں کا جسطرح شان نزول ہے اسی طرح احادیث مبارکہ کا بھی محل اور شان ورود ہے رسول ﷺ نے یہ حدیث کیوں ارشاد فرمائی ؟

اس کا بھی ایک پسِ منظر ہے۔

کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے خاندان اور عالی نسب کی توھین اور تحقیر کی جس کو اللہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"لو لا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم" (الزحرف)

کہ قرآن کریم واقعی اللہ کا کلام اور اسکی طرف سے نازل شدہ ہے یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے عظمت اور رفعت والی کتاب ہے۔تو پھر اس کو مکہ اور مدینہ کے اعلیٰ نسب اور دنیاوی وجاہت اور شوکت رکھنے والے انسان عظیم پر نازل ہونا چاہیے تھا یہ محمد بن عبد اللہ پر کیوں اور کیسے نازل ہوئی ؟ان کی مراد اور مقصد یہ تھا کہ یہ قرآن ولید بن مغیرہ، عروہ بن مسعود ثقفی وغیرہ پر نازل ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ دنیاوی اعتبار سے ذی وجاہت اور بلند مقام کے حامل تھے،۔ان کا خاندان بھی اعلیٰ، بلند پایہ اور رفیع المرتبہ ہے۔اس طرح کفار مکہ نے حضور ﷺ کے خاندان اور نسب میں طعن و تشنیع کی اور شان رسالت اور ذات نبوی کی توہین اور تنقیص کے مرتکب ہوئے جب حقارت پر مبنی یہ بات حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سنی تو غضبناک ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کو اس کی نسبت عرض کی،آپ ﷺ سن کر منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور صحابہ سے پوچھا:

"من انا فقالو اانت رسول اللہ پھر آپ نے خود فرمایا میں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں آپ نے خود ہی یہ الفاظ سنا کر بتایا کہ میرا سوال میری رسالت کے متعلق نہیں بلکہ حسب ونسب کے بارے میں ہے پھر آپ نے اپنا حسب ونسب خود بتایا کہ میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں جو عبد المطلب کے فرزند ارجمند ہیں علم الانساب کے ماہرین جانتے ہیں یہ تمام نام عظمتوں اور رفعتوں کے کس قدر جامع ہیں مادری اور پدری خاندانوں کے اعتبار سے کس قدر علوّ اور وجاہت کے علمبردار اور آمین ہیں۔ پھر خود آپ نے اس کی پوری تفصیل اور وضاحت فرمائی۔اللہ نے جن ،انسان اور فرشتے پیدا کیئے ان میں سے انسان کو افضل بنایا۔کیونکہ اس کے سر پر تاج خلافت

رکھا اور ''**علم الاسماء کلھا**'' کی قوت بخشی اور فرشتوں کو اسکی عظمت شان کے آگے جھکا یا اور اس افضل الخلق سے اللہ نے مجھے بنایا۔۔۔۔خلاصہ یہ ہے کہ جن اور ملائکہ سے (آدم)انسان افضل اور انسانوں میں عربی النسل افضل اور عربی النسل قبائل میں سے قریش افضل اور قریش میں مادری پدری لحاظ سے بنی ہاشم افضل ہیں اور بنی ہاشم میں ذات صفات اور خاندان کے لحاظ سے میں سب سے افضل ہوں، یعنی میں ذات بحیثیت محمد رسول اللہ، اور خاندان بحیثیت بنی ہاشم ان تمام خوبیوں، عظمتوں، اور شرافتوں کا جامع اور حامل ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق میں اجتماعی یا انفرادی طور پر ودیعت کر رکھی ہیں پس میں اعلیٰ حسب ونسب کا حامل اور بے مثال اوصاف کا جامع ہوں۔نوع انسانی کا کوئی بھی فرد مجھ سے افضل واعلیٰ نہیں۔خاندان کے لحاظ سے ہر نبی اور رسول کا اعلیٰ نسب ہونا شرائط نبوت میں سے ہے، جیسا کہ امام بخاری نے ابوسفیان کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ شہنشاہ روم نے جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے سرور عالم نور مجسم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے حسب ونسب کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

''**ھو فینا ذو نسب**'' ہرقل شاہ روم نے سن کر کہا

''**کذالک الرسل تبعث فی قومھا**'' کہ انبیاء کرام، رسل عظام اپنی قوم میں اعلیٰ نسب کے علمبردار اور آئینہ دار ہوئے ہیں۔قرآن حکیم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اعلیٰ حسب ونسب کو بیان فرمایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**لقد جاء کم رسول من انفسکم**''(فاء کی زبر کے ساتھ)

''**لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث رسولا من انفَسِھِمْ**''(فاء کی زبر کے ساتھ)

(مرقاۃ ص ۵۸)

ترجمہ: اعلیٰ حسب ونسب رکھنے والا رسول اللہ نے تم میں بھیجا ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے قارئین کے لیے یہ جاننا اور سمجھنا مشکل نہیں کہ کفار مکہ نے

رسول اللہ ﷺ کے حسب ونسب میں طعن کیا حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے حسب ونسب کی تحقیر کی تو آپ ﷺ نے جواب دیا اور خود حسب ونسب کے حوالے سے ساری مخلوق، ساری کائنات سے اعلیٰ اور بالا ہونا بیان فرمایا۔

احمد ممتاز نے فائدہ کے عنوان میں جو تین باتیں نتیجہ کے طور پر ذکر کی ہیں تینوں غلط اور حدیث مذکورہ سے ثابت نہیں، کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ بشر تمام مخلوق سے افضل ہے۔ اگر اس سے مراد حضرت آدم ہوں تو مسلّم ہے کہ وہ اپنی ذات، صفات کے حوالے سے جن وفرشتہ سے افضل ہیں وہ خلیفۃ اللہ، ساری کائنات کے علوم واسماء اور مسمیات کے عالم، جن کو ذات وحدہ لاشریک نے اپنے ہاتھوں سے بنایا جن کے مرحلہ وار خمیر کو جنت کے پانی سے سینچا گیا۔ اور اگر اس سے مراد ہر نوع بشر ہو تو لازم آئیگا کہ کافر بشر بھی تمام مخلوق سے افضل ہو اور یہ باطل ہے، قرآن نے کافروں کو انعام/ چارپائے بلکہ اس سے بھی کمتر فرمایا ہے:

"اولئک کاالانعام بل ھم اضل"

مزید اگر بشر سے مراد عامۃ البشر ہو پھر بھی غلط ہے کیونکہ ایسی صورت میں عجمی النسل بشر بھی ساری مخلوق سے افضل ہوگا جبکہ اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے عرب کو عجم سے افضل قرار دیا ہے۔

احمد ممتاز کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ بشر ہیں اور بشر کے اعلیٰ اور ارفع طبقہ میں سے ہیں اور بشر کے اس طبقہ میں سے ہونے پر آپ ﷺ کو فخر ہے۔ غلط اور الفاظ حدیث کے مغائر ہے۔
حدیث پاک میں ایسا کوئی جملہ نہیں جس سے یہ ظاہر ہو یا مترشح ہوتا ہو بلکہ حدیث تو یہ ظاہر کررہی ہے کہ دنیا میں پائے جانے والے تمام انساب سے آپ ﷺ کا حسب ونسب اعلی اور بے مثل ہے تو آپ بھی اس حسب ونسب کے حوالے سے بے مثل انسان ہیں نہ کہ عام بشر اور عام انسان جیسا کہ احمد ممتاز نے اپنے خیال کے مطابق تحریر کیا ہے۔

حدیث میں کفار کی ہرزہ سرائی کا رد ہے خود رسول اللہ ﷺ نے ذہن کفار کو جھنجھوڑ، اور فکر کفر کو لرزا کر رکھ دیا کہ کہاں ولید بن مغیرہ، اور عروہ بن مسعود ثقفی اور کہاں شان مصطفیٰ ﷺ کہ کائنات کی عظمتیں اور رفعتیں جس کے سامنے ہیچ اور جس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ہیں، اعلیٰ طبقہء انسانی میں سے ہونے پر آپ ﷺ نے فخر نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنی ذات، صفات اور حسب ونسب کے بے مثل اور بے مثال ہونے پر مُہر ثبت فرمائی ہے۔ کاش اگر احمد ممتاز حدیث کے آخری الفاظ پڑھ لیتے اور ان پر غور کر لیتے تو تحریف معنوی کے مرتکب نہ ہوتے۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"انا خیر ھم نفسا و خیر ھم بیتاً"

میں اپنی ذات اور خاندان کے حوالے سے تمام اولاد آدم میں افضل ہوں،،

ملا علی قاری نے ان الفاظ کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا!

"فانا بفضل اللہ و لطفہ علی"

"مافی سابقۃ الازل خیر الخلق نفسا حیث خلقنی انسانا رسولا خاتما للرسل تمم دائرۃ الرسل بی و جعلنی نقطۃ تلک الدائرہ یطوف جمعھم حولی و یحتاجون الی"

میں روز ازل سے اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے تمام مخلوق سے افضل ہوں،،

ترجمہ : کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وصف رسالت سے متصف انسان پیدا کیا اور مجھے خاتم الرسل بنایا، دائرہ رسالت میری وجہ سے اور مجھ پر تمام ہوا۔ اور دائرہ رسالت کا مرکزی نقطہ مجھے ہی بنایا گیا تمام کائنات / تمام رسول میرے گرد گھومتی/گھومتے ہیں۔ اور میرے ہی محتاج ہے /ہیں۔

حضور ﷺ کے اپنی ذات کے اعتبار سے افضل الخلق ہونے کا معنیٰ اور مفہوم یہ ہے وہ نہیں جو احمد ممتاز نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے، کتابچہ میں اتنا تو لکھ دیا کہ پس میں ذات صفات

کے اعتبار سے بھی سب سے افضل اور بہتر ہوں لیکن ان ذاتی صفات کو بیان کرنے کی ہمت اور ضبط تحریر میں لانے کی جرأت اور توفیق نہ ہوئی۔ ملا علی قاری "وخیرھم بطناً بیتاً" کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حیث نقلنی من طیب الی طیب الی ان نقلنی من صلب عبد اللہ بالنکاح من اشرف القبائل و البطون فانا افضل خلق اللہ تعالٰی علیہ و اکرمھم لدیہ"

(مرقات، ج، ۱۱، ص، ۵۸)

میں بطن کے لحاظ سے اس لیے افضل الخلق ہوں کیونکہ اللہ تعالٰی نے مجھے طیب بطن سے طیب بطن کی طرف منتقل فرمایا ہے۔ یہاں تک اللہ تعالٰی نے مجھے عبد اللہ کی پشت میں رکھا جنہوں نے باقاعدہ نکاح کیا وہ بھی اشرف القبائل اور اشرف البطوں میں سے تھے، یعنی مادری اور پدری خاندانوں کے لحاظ سے کوئی ان کا ثانی نہ تھا، اللہ کے نزدیک میں اس کی مخلوق میں سب سے افضل اور سب سے اکرم ہوں۔

امام رازی نے فرمایا:

"و ذلک لان المسلمین اجمعوا علی ان محمدا افضل من آدم علیھما السلام" (کبیر جز دوم ص ۲۲۳)

تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آدم علیہ السلام سے افضل ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ رسول اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضیلت بشر ہونے یا اولاد آدم میں سے ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ آدم اور اولاد آدم کو دوسری مخلوقات پر جو فضیلت حاصل ہے وہ آپ کی بدولت ہے۔

قارئین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افضل الخلق ہونے کی توضیح جو ملا علی قاری اور احمد ممتاز نے بیان کی ہے ملاحظہ کر لی ہے۔ احمد ممتاز کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر اور انسان ہیں اور بشر کے اس طبقہ یعنی بنو ہاشم میں ہونے پر آپ کو فخر ہے،

اس سے ظاہر ہے کہ احمد ممتاز من حیث الذات رسول اللہ ﷺ کی فضیلت اور عظمت کے قائل نہیں بلکہ بنو ہاشم کی وجہ سے ملنے والی شرافت اور کرامت کے قائل ہیں۔ اور ان کے بقول رسول اللہ ﷺ کے لیے باعث فخر بھی یہی ہے کہ وہ اس قبیلہ میں سے ہیں۔ جبکہ ملا علی قاری کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ روز ازل سے اوصاف و کمالات کا جامع تھے۔ اور روز ازل سے ہی آپ ﷺ افضل الخلق ہیں،

مؤلف کتابچہ کا مؤقف اس لیے غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو افضلیت بنو ہاشم یا اس خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے نہیں ملی بلکہ آپ کی بدولت بنو ہاشم کو خاندانی شرافت اور عزت ملی۔

حدیث پاک میں تصریح ہے کہ پہلے ان کو افضل اور اعلیٰ بنایا۔

"ثم جعلنی فی خیر ھم، یا فجعلنی فی خیر ھم"

پھر میری حقیقت اور ماہیت اس اعلیٰ و بالا صنف "میں رکھی" ان اصناف کو پہلے افضل و اعلیٰ کیوں بنایا گیا؟ وہ اس لیے کہ آپ اپنی ذات وصفات میں ساری کائنات سے افضل و اعلیٰ ہیں اس لیے ضروری تھا کہ پہلے یہ شان اس صنف کو بخشی جائے جس میں آپ کی ذات کو رکھا جانا مقصود ہے۔ حلال، طیب اور طاہر چیز کے لیے پاک صاف برتن کا ہونا ضروری ہے

حکمران یا بادشاہ کو ٹھہرانے کے لیے اچھے صاف ستھرے مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے بے مثل اور بے مثال ہونے کی شہادت خود خداوند تعالیٰ دے اور یہ اعلان کرے کہ **"لقد جاء کم رسول من انفسِکم"** اس کے لیے ارفع و اعلیٰ خاندان کا ہونا ضروری نہیں

ہے؟ اس لیے پہلے ان اصناف کو ذاتی، شخصی فوقیت اور برتری سے نوزا گیا اور بعد ازاں اس ذات مقدسہ کو ان کے ماتھے کا جھومر بنایا گیا۔ **"فجعلنی 'ثم جعلنی فی خیر ھم"** کے الفاظ اسی مضمون کی گواہی دے رہے ہیں

''فاء'' اور ''ثم''تعقیب اور تراخی کے لیے ہیں فی خیر ھم محل ظرفیت میں ہے پہلے ان کو افضل بنایا پھر مجھے ان میں رکھا یعنی میری وجہ سے ان کو افضل بنایا گیا،،

گلاس میں شہد یا دودھ ڈالا جائے تو گلاس کی وجہ سے اُن کو فضیلت حاصل نہیں ہوئی بلکہ دودھ اور شہد کی وجہ سے گلاس کو عزت ملی ہے غلاف محترم اور مقدس کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس میں نورِ مُبین ، فرقان حمید لپیٹا جائے گا یا لپٹا ہوا ہے غلاف ایک کپڑا تھا لیکن ظرف قُرآن اور لباس قُرآن بننے کی وجہ سے یہ کپڑا بھی عزت اور احترام کی بُلندیوں کو چُھونے لگا اس پر ایک عام محاورہ بھی موجود ہے ''زینته المکان بالمکین'' مکان کی قدر و منزلت مکین کیوجہ سے ہوتی ہے

اگر مُلک کا بادشاہ جھگی میں رہتا ہو تو وہ قصر شاہی ہی ہے اور اگر قصر شاہی میں کوئی بھنگی، چمار یا گدا گر رہتا ہو تو اس کا مقام جُھگی سے بھی کمتر ہے، یہ اللہ تعالی کا ہی فضل اور لُطف و کرم ہے کہ جہاں، جہاں اور جس جس مقام پر آپ کی ذات مقدسہ کو رکھا جانا مقصود تھا اُن کو پہلے ہی طہارت، پاکیزگی اور عزت و وقار کے اُوج کمال تک پہنچایا گیا۔اسی لئے آپ نے جلوہ فرمائے منبر ہو کر ابتدائے آفرینش سے لے کر قیام قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کو للکارا اور بیانگ دہل یہ اعلان فرمایا:۔''فانا خیر ھم نفسًا و خیر ھم بتیا''

نہ مجھ سا پہلے ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہو گا میرے حسب و نسب جیسا بھی قیامت تک کوئی قوم یا خاندان نہ ہو گا، اللہ نے میری ذات اور میرے حسب و نسب کو ساری کائنات میں انفرادیت بخشی ہوئی ہے۔احمد ممتاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو بنی ھاشم سے مانگ کر عزت و کرامت دلوانے، بشر

عام اور عام انسان کہنے میں اسقدر مسحور اور مسرور ہوئے کہ مضمون حدیث کا فہم و ادراک تو درکنار رہا صریح الفاظ بھی نظر نہ آسکے!

مومن بشر عام فرشتوں سے افضل ہے مولف کی غلط فہمی

احمد ممتاز نے اپنے مؤقف، کہ رسول اللہ ﷺ انسان اور محض بشر ہیں۔

کی تائید میں ص ۹ پر تحریر کیا کہ علامہ ابن الملک اور صاحب المصابیح کا فیصلہ،،

اس عنوان کے بعد یہ عبارت بھی نقل کی ہے:

"قال ابن الملک ای لا یستوی البشر و الملک فی الکرامۃ و القربۃ بل کرامۃ البشر اکثر و منزلتہ اعلٰی و ھذا من جملۃ ما یستدل بہ اھل السنۃ فی تفضیل البشر علی الملک،،

پھر نقل کیا: **"قال صاحب المصابیح فی تفسیر قولہٖ تعالٰی و لقد کرمنا بنی آدم الاولی ان یقال عوام المومنین افضل من عوام الملٰئکۃ" (مرقات، ج ۱۱، ص ۳۹)**

ترجمہ: علامہ ابن الملک رحمہ اللہ تعالٰی نے فرمایا بشر اور فرشتے عظمت اور قرب میں برابر نہیں بلکہ بشر کی عزت فرشتوں سے بہت زیادہ ہے، اور بشر کا مقام ان سب سے بہت زیادہ ہے

اور یہ روایت جس کے تحت مرقات میں یہ تحریر موجود ہے) ان دلائل میں سے ہے جن سے اہل سنت فرشتوں پر بشر کی فضیلت ثابت کرتے ہیں۔

اور صاحب المصابیح نے فرمایا کہ عوام مؤمنین (بشر) عوام ملائکہ سے افضل ہیں اور خواص مؤمنین (بشر) خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔

احمد ممتاز کو علامہ ابن الملک کا مؤقف سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ علامہ مرحوم کا مقصد بشر سے مومن بشر ہے، جس طرح صاحب المصابیح نے وضاحت کی کہ عام مومن عام فرشتے سے افضل ہے، اگر علامہ کی تحریر میں مذکور بشر کو صفت مومن سے متصف نہ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ مطلق بشر فرشتوں سے عظمت اور قرب میں برتر ہو، جبکہ ایسا کہنا، تصور کرنا، عقیدہ رکھنا قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ (۱) البشر المطلق میں کافر بشر اور مومن بشر سب داخل اور شامل ہوں گے۔ اور البشر المطلق ان کے لیے نوع اور وہ اس کے افراد ہوں گے۔ افراد کا نوع پر حمل اور اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا درست ہے کہ "المومن بشر، الکافر بشر" (۲) کافر اور مومن ایک دوسرے کے مماثل بھی ہوں گے اس لیے کہ اصحاب معقول کے نزدیک مماثلت کون الشیئن فردین لنوع واحد کا نام ہے۔ اگر بشر کو مومن کی قید سے مقید نہ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ کافر بھی اللہ کے ہاں کرامت اور عظمت والا ہو اور پھر فرشتوں سے افضل ہو یہ قرآنی نص کے مطابق باطل محض ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی عظمت، اور تکریم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعلمون

دوسری جگہ فرمایا :لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون مایؤمرون"

اس خرابی سے بچنے کے لئے لازمی اور لابدی امر ہے کہ علامہ ابن الملک کی تحریر میں آنے والے لفظ بشر کو مومن کی قید اور صفت سے مقید اور موصوف بنایا جائے۔

ملا علی قاری نے ابن الملک کا قول نقل کرنے کے بعد بطور تردید صاحب المصابیح کا نظریہ اور قول ذکر کیا جس میں موصوف نے کہا کہ عوام مومنین کو فرشتوں سے افضل ثابت کرنے والے دلائل میں سے ایک دلیل "ولقد کرمنا بنی آدم" بھی ہے۔ لیکن بنی آدم کے لفظ کا اطلاق مومن اور کافر دونوں پر ہوتا ہے اور دونوں ہی اس کا مدلول اور مصداق بھی ہیں جبکہ کافر کسی

بھی جہت اور کسی بھی حیثیت سے فرشتوں سے افضل نہیں کافر کو اس عنوان سے خارج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بنی آدم کو مخصوص اور مقید کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس سے مراد عوام المؤمنین ہیں اسی لیے صاحب المصابیح نے محاکمہ کرتے ہوئے فرمایا

''الاولٰی ان یقال عوام المؤمنین افضل من عوام الملئکۃ و خواص المؤمنین افضل من خواص الملئکۃ'' (مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱۱ ص ۴۹)

اگر ابن الملک کا قول درست ہوتا تو ملا علی قاری صاحب المصابیح کا قول بطور تفسیر یا تردید کیوں نقل فرماتے؟

مزید کہ کسی بھی بشر کو بحیثیت بشر فرشتوں پر فضیلت حاصل نہیں بلکہ بحیثیت مومن اس فضیلت کا حامل ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ:۔

''قال رسول اللہ ﷺ المؤمن اکرم علی اللہ من بعض الملئکۃ''

(رواہ ابن ماجہ مشکوۃ)

بندہ مومن اللہ کے نزدیک بعض فرشتوں سے افضل ہے،،

مزید فرمایا! المومن اعظم حرمۃ من الکعبۃ،، مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے،،

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ شریف کو دیکھ کر فرمایا ''حرمۃ المومن اعظم عند اللہ حرمۃ منک'' (ابن ماجہ بحوالہ مرقات، ج،۱۱،ص،۹۳،)

اے کعبہ حرمت میں بندہ مومن تجھ سے زیادہ حرمت کا حامل ہے،،

ملا علی قاری نے فرمایا:۔

''وھم خواصھم او عوامھم من اھل الاصطفاء' (مرقات، ج،۱۱،ص،۳۹)

فرشتوں سے افضل منتخب اور برگزیدہ مومنین ہیں ''الکامل من الانبیاء والاولیاء''

عوام ہوں یا خواص بعض فرشتوں سے افضل ہیں معلوم ہوا افضلیت کے لیے صرف بشریت کافی اور بنیادی عنصر نہیں بلکہ بشریت کے ہمراہ ایمان لازمی ہے، اور یہ دولت ایمان ہی ہے جو ایک انسان کو نوری مخلوق پر فوقیت اور برتری عطا کرتی ہے۔ اس حدیث کی توضیح میں امام طیبی نے فرمایا:

"یراد بالمؤمن عوامھم و ببعض الملئکۃ ایضاً عوامھم" (مرقات، ج ۱۱، ص، ۳۹)

حدیث مذکورہ بالا میں المؤمن سے مراد جنس یعنی عوام المؤمنین اور بعض الملئکۃ سے مراد بھی عوام ملائکہ ہیں۔

حدیث کا معنی یہ ہے کہ عوام مومنین، عوام ملائکہ سے افضل ہیں۔

"قال محی السنۃ رحمہ اللہ فی تفسیر قولہ تعالی ولقد کرمنا بنی آدم الایۃ"۔

الاولٰی: ان یقال عوام المؤمنین افضل من عوام الملئکۃ و خواص المؤمنین افضل من خواص الملئکۃ قال اللہ تعالٰی ان الذین آمنوا و عملوا الصلحت اولئک ھم خیر البریہ و یستدل بہ اھل السنۃ فی تفضیل الانبیاء علی الملئکۃ "(مرقات، ج ۱۱، ص، ۳۹)

ترجمہ: محی السنۃ امام نووی نے اللہ تعالٰی کے اس فرمان "ولقد کرمنا بنی آدم" کی تفسیر میں فرمایا کہ اولٰی یہ ہے کہ یوں کہا جائے، عقیدہ رکھا جائے کہ عوام مومنین عوام ملائکہ، اور خواص مومنین خواص ملائکہ سے افضل ہیں، اللہ تعالٰی کا ارشاد گرامی ہے:۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے یہی وہ لوگ ہیں جو مخلوق سے افضل ہیں۔

اسی آیہ کریمہ سے اہل سنت نے یہ استدلال کیا ہے کہ فرشتوں سے انبیاء کرام افضل ہیں۔

ملا علی قاری نے آخر میں فرمایا "ولا یخفی ان المراد بخواص المؤمنین الرسل و الانبیاء و بخواص الملئکۃ نحو جبریل و میکائیل و اسرافیل، و یعوام المؤمنین الکمل من

الاولیاء کالخلفاء وسائر العلماء وبعوام الملئکۃ سائرھم"

ترجمہ: یہ تفصیل جو اوپر بیان ہو چکی ہے اس اجمال سے بہتر ہے جو بعض لوگوں نے بیان کیا ہے ابن الملک نے جو یہ کہا ہے کہ "**ان البشر افضل من الملک**" اس سے مراد فرد بشر نہیں بلکہ جنس بشر ہے جنس بشر میں اؤلیائے کاملین، انبیائے کرام، رسل عظام، داخل اور شامل ہیں ،جنس بشر، جنس فرشتہ سے اس لیے افضل ہے کہ اس میں اؤلیائے کاملین، انبیائے کرام، رسل عظام ہوئے ہیں۔

ابن الملک کے مؤقف کو امام طیبی، امام نووی اور ملا علی قاری نے درست قرار نہیں دیا، اسی لیے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "**الاولٰی ان یقال**" لیکن ابن الملک کے اس قول کو مؤلف نے نہ صرف دیگر محدثین کے اقوال پر ترجیح دی بلکہ بطور دلیل اور ثبوت پیش کیا کیونکہ اس میں لفظ بشر کا ذکر ہے، اور مؤلف اس لفظ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں کہ آپ بشر محض ہیں، اگر یہ اطلاق اور ابن الملک کے قول کا اندراج جائز سمت میں ہوتا تو یہ محدثین مسئلہ "**تفصیل البشر علی الملئکۃ**" کی اتنی تفصیل کیوں کرتے؟ اور گہرائی میں کیوں اترتے، یہ ان محدثین کی وسعت نظری اور فراخیء دل کا ثبوت ہے کہ ابن الملک کے قول کی تاویل کر کے ان کی لاج رکھ لی ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان:۔ **المؤمن اکرم علی اللہ من بعض الملئکۃ** (ابن ماجہ)

پہلے گزر چکا ہے جس سے آپ نے واضح فرمایا کہ فضیلت کا تعلق کسی فرد کے مادہ اور حقیقت سے نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔ مومن فرشتے سے اسی لیے افضل قرار دیا گیا کہ وہ دولت ایمان سے مالا مال اور اعمال صالحہ کا امین اور علمبردار ہے یہ مؤلف کتابچہ کی بھول اور کم علمی ہے کہ اس نے بشریت کی بنیاد پر انسان یا مسلمان کو فرشتوں سے افضل قرار دیا ہے ۔بشریت تو گویا مادہ ہے اور وجہء فضیلت ایمان اور اعمال کا نور ہے۔ چنانچہ امام رازی نے

فرمایا کہ:

”لانہ لما کانت الفضیلة عطیة من اللہ ابتداء لم یلزم من فضیلة المادة فضیلة الصورة، الاتری انہ یخرج الکافر من المؤمن و المؤمن من الکافر و النور من الظلمة و الظلمة من النور“ (کبیر جز ۱۳، ج ۲، ص ۳۳)

فضیلت اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے جو ابتداءً ہی دیا جاتا ہے۔ مادہ کی فضیلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ صورت بھی افضل ہو، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر سے مومن اور مومن سے کافر پیدا کرتا ہے۔ نور اندھیرے سے اور اندھیرے نور سے پیدا کرتا ہے۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ احمد ممتاز کا یہ کہنا اور یہ استدلال کرنا کہ بشر فرشتوں سے افضل ہے، اور ابن الملک کے قول کا سہارا لینا ان تصریحات کی موجودگی میں غلط اور بے بنیاد ہے اور باطل ہے،

بشریت ایک مادہ ہے فضیلت میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں۔ فضیلت انعام خداوندی ہے جس کا تعلق نور ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ ہے۔

انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام اور برگزیدہ بشر، عام فرشتوں سے افضل ہیں مولف کی غلط فہمی

احمد ممتاز کا ص ۱۰ پر فائدہ کے عنوان میں یہ کہنا کہ ان عبارتوں سے بھی واضح ہو گیا کہ یہ ہمارا سب کا اجماعی عقیدہ ہے کہ بشر فرشتوں سے افضل اور بلند مقام والے ہیں، باطل اور خلاف حقائق ہے۔

اس کے بطلان اور اختراع پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان، ملا علی قاری امام نووی، امام قرطبی اور امام رازی کا اختلاف اور تردید گزر چکی ہے جس کے بعد یہ کہنا کہ بشر فرشتوں سے افضل ہے

اجماعی نہیں انفرادی عقیدہ ہے جو صرف مؤلف کتابچہ اور اس کے ہم نواؤں کا ہے۔
اہل سنت صرف بشر کو نہیں بلکہ بشر مومن کو بعض فرشتوں سے افضل قرار دیتے ہیں۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

احمد ممتاز نے افضلیت بشر پر کتابچہ کے ص ۱۰ پر دلائل بر فضلیت بشر کے نام سے عنوان قائم کیا ہے اور یہ کہا کہ اختصار کے طور پر دو دلیلوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔
دلیل اول یہ آیہ کریمہ نقل کی:۔

"اذقال ربک للملٰئکۃانی خالق بشرًامن طین فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین فسجد الملٰکۃ کُلھم اجمعون"

ترجمہ: جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ بے شک میں بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ پس جب اسے برابر کرلوں اور اُس میں رُوح پھونک لُوں، پس تم اسے سجدہ کرنا پس جمیع ملائکہ نے جمع ہوکر سجدہ کیا۔ فائدہ کے تحت لکھا نوری نے سجدہ کیا اور بشر کو حقیر سمجھا تو راندہ درگاہ بن گیا اور حقدار لعنت ہوا۔ کاش آج کے یار لوگ بھی قرآن حکیم کی اس فضیلت بشر کو دیکھ کر بشر کو عظیم، مکرم، محترم سمجھتے اور اس کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے اور عقیدہ بنا لیتے کہ بشر نوری سے افضل ہے۔ توضیحاً کہا جاتا ہے کہ بشر نوری سے افضل ہے یا نہیں، پھر مطلق بشر افضل ہے یا بشر مؤمن افضل ہے؟ اس پر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ دوبارہ دُہرانا فضول اور وقت کا ضیاع ہے۔ یہاں مقصد صرف اس دلیل کا جائزہ لینا ہے کہ یہ آیت مدعائے مولف کی تائید کرتی ہے یا تردید؟ ہمارا ایمان ہے کہ یہ جزو قرآن ہے حق و صداقت کی تفسیر، اور شان آدم کی تعبیر ہے۔

ہم ان تفسیرات اور تعبیرات کو سُپرد قلم کرنے کا حق رکھتے ہیں جو جلیل القدر مفسرین نے اس کے تحت رقم فرمائی ہیں۔ یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آدم علیہ السلام اور شیطان کے واقعہ کو قرآن حکیم نے سات جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ سورہ بقرہ اس میں دو مرتبہ، سورہ الحجر، سورہ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورہ طٰہٰ اور سورہ ص میں۔

بشر کا معنی اور مولف کا غلط استدلال

اس آیہ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ محمود آلوسی بغدادی نے فرمایا:۔

ای انسانا و عبر به عنه اعتبار الظهور بُشرته و هی ظاهر الجلد، و ذکر انه جاء جمع البشرة بُشرا و البشارا۔ (روح المعانی جلد ۹ ص ۳۶)

ترجمہ: ۔آیہ کریمہ میں بشر سے مُراد انسان ہے اور انسان کو بشر اس لیے کہا گیا کہ انسان اپنی چمڑی کے لحاظ سے ظاہر اور باہر ہے۔ اور اسکی جمع بشر اور ابشار آتی ہے۔ جبکہ بشر اسم جنس ہے اسکی کوئی جمع نہیں، یہ قول امام راغب کا ہے جو عُلوم لُغات کے ماہر ہیں۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ بشر سے مُراد جسم کشف ہے:۔ جیسا کے علامہ مذکور نے تحریر فرمایا۔

"قیل ارید جسما کثیفا یلاقی و یباشر او جسما بادی البشرة و لم یرد انسانا و ان کان هو ایاه فی الواقع"

ایک قول یہ بھی ہے کہ آیہ مقدسہ میں بشر سے مراد جسم کثیف ہے جو دکھائی دیتا ہو اور لوگوں سے میل ملاقات رکھنے والا ہو۔ یا بشر سے مراد ایسا جسم ہے جس کا رنگ شکل وصورت، اور دیگر خدوخال واضح نظر آئیں۔ فرشتوں سے خطاب کے وقت ان صفات کا حامل کوئی جسم نہ تھا بلکہ فرشتوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ

"انی خالق خلقا صفتہ کیت و کیت"

میں ان صفات سے متصف ایک جسم بنانے والا ہوں جو ان صفات کا حامل ہوگا۔

علامہ آلوسی نے فرمایا:

"و لکن اقتصر عند الحکایة علی الاسم" (روح المعانی ج۸ ص ۳۶)

لیکن فرشتوں کو بتانے کے وقت صرف نام یعنی بشر پر اکتفا کیا گیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ بشر اسم ہے اور اس کا مدلول، مصداق، اور مسمّٰی جسم کثیف ہے چونکہ پہلے سے موجود اور مخاطب فرشتے اجسام لطیفہ کے حامل تھے جنکی وجودی کیفیت غیر مرء ی ہوائی اور ان دیکھی تھی اس لیے فرمایا ایک بشر جو نظر آنے والا، اور میل ملاقات رکھنے والا ہوگا اس کو پیدا کرنے والا ہوں۔ اس طرح بشر آدم علیہ السلام کا ایک صفاتی نام ہے۔ اور ذاتی نام آدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور شیطان کے قصہ میں آپ کے اصلی اور ذاتی نام آدم کا ذکر کیا اور دوسری جگہوں میں بھی اسی نام سے مخاطب فرمایا ہے۔ آپ کے اس صفاتی نام کو آپ کی حقیقت اور آپ کا مادہ قرار دینا از روئے لغت اور وجہ ء اطلاق غلط ہے ، فرشتوں کے سامنے آدم علیہ السلام کو "انی خالق بشرا من طین" کہنے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ تمہارے بعد پیدا کی جانے والی مخلوق کا جسم مادی اور کثیف ہوگا وہ اپنی رنگت، چہرے مہرے ، خدوخال، اور دیگر قوٰی کی بدولت ظاہر اور قابل دید ہوگا۔

قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر چار انعام فرمائے۔

(۱) سب سے پہلے آپ کو خلیفۃ بنایا اور فرشتوں کے سامنے ارشاد فرمایا

"انی جاعل فی الارض خلیفة"

(۲) علم کثیر عطا فرمایا، جو منصب خلافت کے لیے لازمی اور ضروری تھا۔

(۳) پھر اتنا علم عطا کیا اور دیا کہ فرشتے اس کے درجے تک پہنچنے سے عاجز اور قاصر آ گئے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتنم صادقین ★ قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا" الایۃ

(۴) اس کے بعد چوتھا انعام یہ عطا فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان چار فضیلتوں سے نوازا ان چار فضائل کی وجہ سے آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل ٹھہرے اور مسجود ملائکہ بنائے گئے۔

نار اور طین کی حقیقت اور شیطان کیوں کافر ہوا؟

مؤلف نے جو آیہ کریمہ نقل کی ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ آدم علیہ السلام کا مادہ طین ہے، اور طین اپنی حقیقت کے اعتبار سے نار سے ہرگز افضل نہیں۔ کیونکہ طین کا تعلق عالم سفلی سے اور نار کا تعلق عالم علوی سے ہے۔ امام رازی نے فرمایا:

"ان النار مشرق علوی، لطیف، خفیف، حار، یابس، مجاور الجواھر السموات ملاصق لھا، والطین مظلم سفلی، کثیف، ثقیل، بارد، یابس، بعید عن مجاورۃ السموات، وایضا فالنار قویۃ التاثیر والعمل"

(کبیر ج ۱۳ ص ۳۳، ۳۲)

ترجمہ: بے شک آگ ایک شعلہ دار، عالم بالا سے تعلق رکھنے والی، لطیف، ہلکی، گرم، سرد، آسمانوں کے جواہر سے متصل اور قرب رکھنے والی تاثیر اور عمل کے لحاظ سے انتہائی قوی ہے اور طین یعنی تر مٹی تاریک، عالم سفلی سے تعلق رکھنے والی، کثیف، بوجھ والی، ٹھنڈی، خشک، آسمانوں کی مجاورت سے دور ہے، امام رازی نے نار اور طین کی تعریف کر کے شیطان کے اس قیاس کو بیان کیا ہے جس کی بنیاد پر شیطان نے اپنے آپ کو وجود آدم اور ان کی شخصیت سے بہتر اور افضل قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اسجدو الادم" آیت نص قطعی ہے اور أاسجد لبشر و خلقتنی من نار، و خلقته من طین" قیاس تھا جس سے اس نے انا خیر منه کو ثابت کیا اور اسی پر عمل پیرا ہوا۔ نص قطعی کے مقابل قیاس کو ترجیح دینے پر "و کان من الکافرین "کا مصداق بن گیا۔

امام رازی نے فرمایا:

"ذالک یدل علی ان الفضیلة لا تحصل الا بفضل اللّٰہ تعالیٰ

لا بسبب فضیلة الاصل و الجواهر"

ترجمہ: آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنانا اس بات کی دلیل ہے کہ فضیلت کا حصول محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ مادہ اور ماہیت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ آگے فرمایا:

"و ایضا فالفضل انما یکون بالاعمال و ما یتصل بها لا بسبب المادة

الا تری ان الحبشی المؤمن مفضل علی القرشی الکافر"

(کبیر ج ۱۳ ص ۳۳)

ترجمہ: کہ فضیلت عقیدہ اور اعمال صالحہ کے سبب عطا کی جاتی ہے یہ کہنا کہ مادہ کی بنیاد پر ہی مسجود ملائکہ بنے غلط اور بے بنیاد ہے، ہم روح المعانی کے حوالے سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ بشر آدم کا ذاتی علم اور اصلی نام نہیں بلکہ اسم توصیفی ہے۔ اصلی نام آدم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے چار خصوصی فضائل سے نواز کر نوری اور ناریوں سے افضل قرار دیا ہے جن کو امام رازی نے

"و اذ قلنا للملئکة اسجدو الادم آلایه" کے تحت ذکر کیا ہے۔

"اعلم هذا هو النعمة الرابعة من النعم العامة علی جمیع البشر هو انه سبحانه و تعالیٰ جعل اباءنا مسجود الملائکة و ذالک لانه تعالیٰ ذکر تحصیص آدم بالخلافة اوّلا، ثم تخصیصه بالعلم الکثیر ثانیا، ثم بلوغه فی العلم الی ان صارت الملئکة عاجزین عن بلوغ درجته فی العلم، و ذکر الان کونه

مسجود اللملائکۃ" (کبیر جز ثانی ص ۲۱۲)

ترجمہ : جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں پر جو عام فضل و کرم فرمائے ان میں سے آدم علیہ السلام پر چار خصوصی انعا فرمائے۔ان میں یہ چوتھی نعمت ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے باپ یعنی آدم علیہ السلام کو نوری مخلوق کا مسجود بنایا، یعنی آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا یہ اللہ تعالیٰ کا چوتھا انعام ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے بحیثیت خلیفۃ آدم علیہ السلام کا ذکر فرمایا یعنی آپ کو خلیفۃ بنا کر افضل الخلق قرار دیا' پھر خصوصیت علم سے نوازا اور کثیر علم عطا فرمایا۔اور پھر علم میں وہ مقام عطا فرمایا جہاں پہنچنے سے فرشتے عاجز آ گئے اور چوتھی فضیلت یہ عطا فرمائی کہ فرشتوں کو اعتراف عظمت، اور اقرار رفعت کے طور پر سر بسجود کیا۔

مؤلف کا یہ کہنا اور عقیدہ رکھنا کہ آدم علیہ السلام بشر ہونے کے ناطے مسجود ملائکہ ٹھہرے بالکل غلط اور فرضی بات ہے۔

احمد ممتاز کا سورۂ الرحمن سے غلط استدلال

احمد ممتاز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بشر ہونے پر سورۂ الرحمٰن کی ابتدائی آیت نقل کی:۔

"**الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان**" اس کا ترجمہ بھی لکھا:۔

رحمٰن نے قرآن سکھایا ہے، انسان کو پیدا کیا اسے بیان سکھایا" واضح رہے کہ یہاں انسان سے مراد جنس انسان ہے۔امام غزالی نے فرمایا:۔

"**ماالمراد من الانسان نقول ھو الجنس و قیل المراد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و قیل المراد آدم والاول اصح نظر االی اللفظ فی خلق و یدخل فیه محمد و آدم و غیر ھمامن الانبیاء** (کبیر جز ۲۹ ص ۸۵)

ترجمہ:۔ خلق الانسان میں انسان سے مراد جنس انسان ہے ایک قول کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور

دوسرے قول کے مطابق آدمس ہیں لیکن معنی جنس زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس میں محمد ﷺ آدم اور دیگر انبیاء بھی شامل ہیں رسول اللہ ﷺ کو بشر اور انسان مانتے ہیں اہل سنت وجماعت کا وہی عقیدہ ہے جو قرآن وسنت میں بیان / اجماع امت سے ثابت ہے، جس کے مطابق جس طرح رسول اللہ ﷺ کو انسان ماننا جزو ایمان ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اس حیثیت، اس صفت، اور اس کیفیت میں بشر نہ ماننا بھی حصہ ءایمان ہے جس میں کفار آپ کو انسان اور بشر کہا کرتے تھے، وہ صفت اور کیفیت کیا تھی کہ آپ ﷺ ہماری ہی طرح کے اور ہمارے ہی جیسے انسان اور بشر ہیں۔ اس نوعیت کا حامل شخص رسول نہیں ہوسکتا ان کے عقیدہ اور نظریہ کے مطابق نبی کے لیے مندرجہ ذیل امور کا ہونا ضروری اور لازمی تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں خود اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت ان امور کو بیان کیا ہے۔ ہم مؤلف کتابچہ کے کیے ہوئے ترجمہ پر ہی اکتفاء کریں گے۔

احمد ممتاز نے کتابچہ کے ص ۱۳ پر ان آیات کا ترجمہ یوں بیان کیا ہے:

ترجمہ: اور انہوں نے کہا ہم اس وقت تک تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ نہ جاری کردو، یا تمہارا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس میں تم نہریں جاری کردو، یا جیسا کہ تمہارا خیال ہے ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرادو، یا خدا اور فرشتوں کو ہمراہ لے آؤ، یا تمہارا سونے کا ایک مکان ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ، اور تمہارا آسمان پر چڑھنے کا بھی ہم اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ وہاں سے ایک کتاب نہ لے آؤ، جسے ہم خود پڑھ لیں یہ تمام اللہ ہی کی قدرت، قبضہ اور اختیار میں ہیں۔ اس لیے ان امور کا پیدا کرنا اور پورا کرنا اللہ کے لیے مشکل اور ناممکن نہ تھا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا! آپ ان کو یہ جواب دیں کہ:

آپ ﷺ سے ھل کنت الا بشرا رسولاً کیوں کہلوایا گیا؟

”سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا“ (بنی اسرائیل)

احمد ممتاز ہی بتائیں کفار کے ان سوالات / شرائط اور امور کا کیا جواب ہونا چاہیے تھا؟

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب سکھایا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان امور کا پورا کرنا قدرت خداوندی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں، لیکن جہاں تک میری ذات اور میرے ہاتھوں سے ان امور کے صدور کا تعلق ہے، ناممکن ہے کیونکہ بشر ہوں اور منصب رسالت پر فائز ہوں، اس آیہء کریمہ سے مؤلف کا مدعا ” کہ رسول اللہ ﷺ محض بشر ہیں“ پورا نہیں ہوتا، اس لیے کہ آپ نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ ”ھل کنت الا بشرا“ بلکہ بشرا کے بعد بطور امتیاز اور خصوصیت رسولا کو بھی ذکر فرمایا ہے جس سے بادی النظر میں دو امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے -

(۱) میں بشر ہوں اور بشر کی قدرت میں ان امور کا معرض وجود میں لانا ممکن نہیں،

(۲) چونکہ رسول ہوں، رسول اللہ کی مشیت کا پابند اور اس کا تابع فرمان ہوتا ہے -

اس کا مقام عبدیت اور عبودیت ہے، رسول اللہ تعالیٰ کو اپنی رائے دے سکتا ہے اور نہ حکم کر سکتا ہے، اسی آیہ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے، علامہ محمود آلوسی نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار سے فرمایا:

”ھل کنت الا بشرا و البشر لا قدرۃ لہ علی الاتیان بذالک“ اور پھر

”و ذکر رسولا لنفی ان یاتی بہ بقدرۃ اللہ تعالیٰ، کانہ قیل ھل کنت الا رسولا و الرسول لا یتحکم علی ربہ سبحانہ“ (روح المعانی جلد ۸ جز دوم ص ۱۴۹)

ترجمہ : میں بشر ہوں ان امور کے معرض وجود میں لانے کی بشر میں طاقت نہیں اور رسولا کہہ

کرفرمایا کہ نہ ہی میں اللہ سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی قدرت سے ان امور کو وجود میں لائے ، گویا آپ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ میں صرف رسول ہوں اور رسول، اللہ سبحان وتعالیٰ پر اپنا حکم نافذ نہیں کرسکتا۔لہذا اس آیہ کریمہ سے رسول اللہ ﷺ کی بشریت محضہ پر استدلال کرنا غلط ہے آیہ کریمہ میں بشرا موصوف اور رسولا اس کی صفت ہے، جس کی وجہ سے آیہ مقدسہ کا معنی یہ ہے کہ میں بشر ہوں ایسا بشر جو رسالت کے عظیم وصف سے متصف اور جلیل القدر منصب پر فائز ہوں۔

مؤلف لفظ ''بشرا'' کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انہیں ''رسولا'' کا لفظ نظر ہی نہیں آیا۔۔۔

ہمارے مؤقف کی تائید قرآن حکیم سے بھی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''ماکان محمد الا رسول'' محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں، یہ الہ نہیں تا کہ یہ امور ان کے مقدورات ہوں یہ رسول ہیں ان کا کام صرف اتنا ہے کہ احکامات الہیہ کو بندوں تک پہنچائیں

''ھل کنت الا بشرا رسولا''

میں الفاظ حصر اور قصر کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کے لیے مخلوق اور رسول ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس میں کفار کے اس غلط اور خلاف حقیقت عقیدے کا رد کیا گیا کہ محمد ﷺ ہمارے ہی جیسے بشر ہیں رسول نہیں۔حصر اور قصر پر تفصیلی بحث انشاء اللہ **''قل انما انا بشر مثلکم''** کی میں کی جائے گی۔

کفار رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے انکار کے سلسلہ میں مختلف پینترے بدلتے اور مختلف بہانے تراشتے جن میں سے ان کا ایک بہانہ یہ بھی تھا کہ چلو خدا کا رسول کوئی دیوتا نہ سہی کم از کم کوئی ایک فرشتہ اور نوری ہی ہوتا، ایک بشر کیونکر رسول ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے اس زعم باطل اور تخیل فاسد کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''ومامنع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدیٰ الا ان قالوا أبعث اللہ

بشرا رسولا ، قل لو کان فی الارض ملئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا“

ترجمہ : جب کفار کے پاس ہدایت آئی تو ایمان اس خیال سے نہ لائے کہ اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر زمین پر چلنے پھرنے والی مخلوق فرشتے ہوتے تو فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجا جاتا، لیکن زمین پر بسنے، چلنے، پھرنے والی مخلوق انسان اور بشر ہیں اس لیے بشری رسول بھیجا ہے۔

احمد ممتاز کی الزام ترشی یا غلط فہمی

مؤلف نے تحریر کیا چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ پاک نے حکم فرمایا کہ آپ اپنی بشریت کا نہایت واضح الفاظ میں اعلان کر دیں اور ساتھ ہی اپنی رسالت کا بھی اعلان کر دیں تا کہ یہ بات واضح ہو

جائے کہ بشریت اور رسالت کا اجتماع نہ صرف عین ممکن بلکہ ایک حقیقت واقعہ ہے مؤلف کی یہ تحریر جو نتیجہ کے طور پر ہے پتہ دیتی ہے کہ موصوف غلط فہمی کا شکار ہیں یا محض الزام تراشی سے کام لے رہے ہیں، اہل سنت و جماعت اور جمہور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول بشر ہے اولاد آدم ہے، قرآن نے یہی فرمایا ہے اور یہی حق اور سچ ہے اور یہی قابل عمل ہے بشریت اور نبوت و رسالت میں کوئی تناقض اور کوئی تضاد نہیں، دونوں کا اجتماع امر واقعی ہے۔
لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کفار نے جو انبیاء کو بشر کہا وہ کس حیثیت اور کس معنیٰ میں کہا؟ اور سب سے پہلے نبی کو بشر کس نے کہا؟

واضح رہے کہ:

بشر کا لفظ حقارت کے طور پر سب سے پہلے شیطان نے آدم علیہ السلام پر اطلاق کیا

انسانوں میں سب سے پہلے قوم نوح ،قوم عاد،قوم ثمود، نے اپنے انبیائے کرام پر بولا،مکہ کے کافروں نے رسول اللہ کو اپنے جیسا بشر کہا قوم نوح سے لے کر کفار مکہ تک تمام کافروں نے انبیاء کو "بشر مثلنا" کہا۔شیطان اور کفار کے علاوہ کسی دور کے کسی مومن نے اپنے اپنے زمانے کے نبی کو اپنے جیسا بشر نہیں کہا۔ کیا کفار کے علاوہ کسی بھی مومن کو معلوم نہ تھا کہ یہ انسان ہیں؟ اور بشر ہیں،صرف کفار کا کہنا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ صرف بشر ہی ہیں اس کے پیچھے انکار رسالت ،توہین ، اور حقارت کا عنصر موجود ہے اگر یہ لفظ عام اطلاق اور عام استعمال میں بے ادبی ، اور تنقیص سے خالی ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم یا دیگر انبیاء کو ضرور "یاایھا البشر" کہہ کر پکارتا۔قرآن حکیم میں ایسی کوئی مثال نہیں جبکہ اس کے برعکس "یا ایھا النبی، یاایھا الرسول، یاایھا المزمل، یاایھا المدثر" کے نظائر موجود ہیں۔

کیا ایمان کی تکمیل اور تشہیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ ذات نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر وہی انداز وہی لفظ اور وہی طریق استعمال اپنایا جائے جو کفار نے اپنایا اور دہرایا تھا؟

فقط "ان انتم الا بشر ملثلنا" کو دیکھنا اور پڑھنا کافی نہیں بلکہ اس کی توضیح اور تفصیل کا ملاحظہ کرنا ضروری ہے جو جواب کے طور پر انبیاء کرام نے منکرین رسالت کے سامنے پیش کی ،قرآن ارشاد فرماتا ہے:۔

"قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم و لکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ" (ابراھیم)

ترجمہ : رسولوں نے ان کفار کو یہ جواب دیا کہ بے شک ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو پسند فرمائے اس پر اپنا احسان اور فضل فرماتا ہے۔

"ان نحن الا بشر مثلکم" اور "لکن" کے بعد والے جملہ اور کلام کا معنی اور حکم ایک نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کے مخالف اور مناقض ہوتے ہیں اور اس کی وجہ "لکن" حرف استدراک کا درمیان میں آنا ہے، امام جلال الدین السیوطی نے فرمایا "لکن" کا معنی استدراک ہے جس کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔ کہ "لکن" کے بعد میں ایک ایسا حکم ہوتا ہے جو اس کے ماقبل کے حکم کے مخالف اور مناقض ہوتا ہے۔ "لکن" سے پہلے حکم یہ تھا کہ ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں اب بعد والے جملہ کا حکم اس کے مخالف اور مناقض ہوگا لیکن ہم پر نبوت اور رسالت کے اکرامات اور انعامات ہیں، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

"وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا" (اتقان) "لکن" کے مابعد کا حکم ماقبل کے حکم سے متناقض اور مخالف ہے۔ اس طرح آیہ مقدسہ میں "ان نحن الا بشر مثلکم، کا حکم "یمن علی من یشاء" کے حکم کے خلاف اور معارض ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ہمیں اپنے جیسا بشر سمجھتے ہو لیکن ہم تمہارے جیسے بشر نہیں ہم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں، الوہیت کے بعد سب سے بڑا مرتبہ، اور منصب جو اوصاف جزیلہ کا حامل ہے وہ نبوت اور رسالت ہے ہم اس پر فائز اور متمکن ہیں۔ لہذا بے دھڑک

"انما انا بشر مثلکم ھل کنت الا بشر رسولا" سے یہ استدلال کرنا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے ہی جیسے بشر ہیں بالکل غلط اور نصوص قطعیہ کے مخالف اور مناقض ہے انشاء اللہ اس پر بھی گفتگو کی جائیگی {وباللہ التوفیق}

انما انا بشر مثلکم آیت کی تفہیم میں احمد ممتاز کی جہالت

مؤلف نے حضور ﷺ کی بشریت پر قرآن حکیم کی آیت

"قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد" نقل کی ہے (کہف)

ترجمہ: میں بھی تمہاری ہی طرح کا بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے''(ص ۱۵) قانون کے مطابق لفظ ''قل'' چار امور کا تقاضا کرتا ہے۔(۱) قائل (۲) مقولہ (۳) مقول لہ (۴) اور وجہ قول، آیت مذکورہ کے قائل رسول اللہ ﷺ ہیں اور مقول لہ کفار مکہ ہیں، خود آیہ کریمہ مقولہ ہے اور وجہ قول کے بارے میں مفسرین کی تحقیقات درجہ ذیل ہیں۔ کفار مکہ کا کہنا یہ تھا کہ آپ ﷺ ہماری ہی طرح کے بشر ہیں۔ آپ نے بحکم خداوندی یہ جواب ارشاد فرمایا کہ ہاں میں تمہاری ہی طرح کا انسان ہوں۔ مگر ایسا کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود، معبود واحد ہے معمولی عقل و دانش کا مالک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیسی مماثلت ہے؟ تم جیسا بھی ہوں اور رسول بھی ہوں، کیونکہ وحی اسی بشر کی طرف آتی ہے جو رسول ہو،

ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء انہ علی حکیم (شوریٰ، ۵۲، ۵۱)

ترجمہ: کسی بشر میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کلام کرے مگر وحی یعنی القاء سے یا پردے کے پیچھے سے یا جبریل بھیج کر جو اللہ کے اذن سے وحی کرے جو اللہ چاہتا ہے۔ بے شک وہ بہت بلندی اور حکمت والا ہے۔

نص قطعی سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ بشر سے تین طرح کا کلام فرماتا ہے۔ یا اس کے ذہن وقلب میں کسی امر کا القاء کریگا۔ یا حجاب میں اس سے ہم کلام ہوگا۔ یا جبریل علیہ السلام کو بھیج کر اس پر وحی کریگا۔

جب بشر سے بذریعہ جبریل کلام کرے تو بشر رسول یا پیغمبر ہوگا، آیہ کریمہ میں ''انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی، الخ'' میں ''بشر مثلکم'' کے بعد ''یوحیٰ الی'' کا جملہ دلالت کررہا ہے کہ آپ پر وحی کی گئی کہ معبود حقیقی ایک ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوا کہ آپ رسول ہیں اور اور

دوسری آیت ”مامحمدالارسول“ اس کی تفسیر ہے ”ھل کنت الابشرارسولا، انماانا بشر مثلکم یوحی الی“ کی لفظی اور معنوی تعبیر وتشریح ہے جب آپ بشر اور رسول ہیں تو پھر بشر محض کیسے؟ اور کفار و مشرکین کو ”انماانابشر مثلکم“ کیسے فرمایا؟ بشر محض ماننے سے ”انابشر مثلکم اور یوحی الی“ میں تناقص لازم نہیں آتا؟ اگر آتا ہے تو بشر محض کیسے؟ اگر لازم نہیں آتا یہ آیت کے الفاظ کے خلاف ہے“ واضح رہے کہ ”بشر مثلکم“ مقیّد اور ”یوحی الی اس کیلئی قید ہے“ بشر مثلکم“ پر ہی اکتفاء کرنا اور ”یوحی الی“ کو نظر انداز کر دینا آیت کے مفہوم اور مدلول کو پورا نہیں کرتا۔ قید ہونے کی وجہ سے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں

(۱) ”بشر مثلکم“ موصوف اور ”یوحی الی“ جملہ بتاویل مفرد اسکی صفت ہو، ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بے شک میں ایسا بشر ہوں جس کی طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود، معبود واحد ہے۔ (۲) ”انا“ ضمیر متکلم سے حال واقع ہو اب آیت کا معنی اس طرح سے ہوگا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں میرا حال یہ ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود، معبود واحد ہے۔ ہر دو صورتوں میں مثلیت اور بشریت محضہ کی نفی ہو جاتی ہے۔ پوری آیت پڑھ کر ” بشر مثلکم“ پر رکنا اور یہاں تک ہی اکتفاء کرنا ہرگز روا نہیں۔ ایسا کرنا علمی خیانت اور مخاطب کو دھوکہ دہی میں ڈالنا ہے۔ قرآن وسنت میں موجود واضح اور ناقابل تردید دلائل کی موجودگی میں یہ کہنا کہ آپ ﷺ محض بشر ہیں، اور سیاق آیت اور الفاظ آیت کی روشنی میں العیاذ باللہ مخاطبین کی مثل ہیں، کیسے درست ہے؟ اس پر عقیدہ رکھنا اور اس کا پرچار کرنا روح ایمان کے منافی ہے، آیت کا صحیح اور حقیقی معنیٰ عرض کرنے سے قبل اس کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے، جو یہ ہے کہ کفار رسول اللہ ﷺ کو نبی اور رسول اس لئے نہیں مانتے تھے کہ آپ ہماری ہی طرح کے بشر ہیں، کھاتے، پیتے، تجارت کرتے اور بیاہ شادیاں کرتے ہیں۔

اُن کے اس باطل عقیدہ کی تردید اور فاسد سوچ اور فکر کی نفی میں اللہ نے فرمایا آپ کہ دیں:۔
"انما انا بشر مثلکم" کے بعد "یوحی الی" "انما الھکم الہ واحد"
آیہء کریمہ کے کلمات نے رسول اللہ ﷺ اور مخاطبین میں امتیاز پیدا کردی ہے۔صاحب روح المعانی نے فرمایا: "تمیزت عنکم بذالک" مجھ پر جو وحی کرتی ہے کہ تمہارا معبود، معبود واحد ہے کی وجہ سے میں تم سے ممتاز ہوں۔تمہارے جیسا نہیں، آگے فرمایا کہ آیہء کریمہ میں دو جگہ "انما" اور "انما" آنے سے حصر اور قصر کا معنی پیدا ہو گیا ہے۔قصر کیا ہے؟ الفاظ حصر کے ساتھ ایک حکم یا وصف کو کسی دوسری چیز کے لیے مختص کرنے اور اس وصف کی مخالف وصف کی نفی کو ملحوظ رکھنے کا نام قصر ہے مثلاً "مازید الا قائم" میں ما نافیہ اور اس کے بعد الا کا آنا پھر دونوں کا ایک جملہ میں اجتماع قصر ہے۔"ما" نافیہ اور "الا" الفاظ حصر ہیں۔اس جملہ میں زید کے لیے قیام کو مختص کیا گیا ہے اور قیام کے مفہوم مخالف یعنی قعود کی نفی کی گئی ہے۔معنی یہ ہے کہ زید کھڑا ہی ہے بیٹھا ہوا نہیں مخاطب کے ذہن میں تھا کہ شاید زید کھڑا نہ ہو بیٹھا ہوا ہو لیکن جب متکلم نے "مازید الا قائم" کہا تو مخاطب کو یہ باور کرایا کہ زید کھڑا ہے بیٹھا ہوا نہیں۔
اس طرح جب کفار نے آپ ﷺ سے کہا کہ ہم پر آسمان گرادو، تمہارا سونے کا محل ہونا چاہیے تھا، تم زمین سے پانی کی نہریں جاری کرتے تم ہمارے دیکھتے دیکھتے آسمان پر چڑھ جاتے وہاں سے کتاب لاتے ہم بھی اس کو پڑھتے، تمہارے پاس فرشتے آتے اور خود خدا آتا۔یہ امور ان کے اذھان میں لوازمات نبوت اور علامات رسالت کے طور پر براجمان تھے ان کا رد اور ان کی نفی کرتے ہوئے فرمایا: میں تو تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔انسان یہ کام نہیں کرسکتا یہ تو قدرت باری تعالیٰ کے تابع ہیں میں نبوت اور رسالت کا مدعی ہوں، اُلوہیت کا نہیں۔گویا آپ ﷺ نے "انما انا بشر مثلکم" کہہ کر صفات اُلوہیت کا حامل اور متصف ہونے کی نفی کی۔دوسرا مقصور "الھکم" ہے اور مقصور علیہ "الہ واحد" ہے جس کا معنی ہے کہ آپ نے مشرکین سے

فرمایا : کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کیونکہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے ۔ کہ تمہارا معبود حقیقی اللہ وحدہ لا شریک ہے، وہ بت نہیں جنہیں تم پوجتے ہو۔ مخاطبین کے ذہن میں معبودان باطلہ یعنی بتوں کا تصور بطور الہہ موجود تھا اس کی نفی کی گئی اور معبود حقیقی کے لیے "الہ واحد" یعنی وحدہ لاشریک کا وصف مختص کیا گیا۔ قصر اول کی صورت یہ بھی ہے کہ "انا مقصور علیہ اور یوحی الی مقصور ہو" اور آیت کا یہ مفہوم ہو کہ میں وہ ہوں جس پر وحی کی جاتی ہِ ،، ایسا نہیں کہ مجھ پر وحی نہ آئے اور میں رسول نہ ہوں جیسا کہ تمہارا خیال ہے۔

حاصل حکم یہ ہے کہ آیہ کریمہ کو: **انما انا بشر مثلکم** تک محدود کرنا، اور اس سے یہ استدلال کرنا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے ہی جیسے انسان اور بشر ہیں بالکل غلط، علوم وفنون کی دنیا میں مر دود، اور خود آئیہ مقدسہ کے الفاظ کی روشنی میں باطل ہے۔ کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو **ھل ھذا الا بشر مثلکم** کہا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: "**و اسرو اا لنجوی الذین ظلموا اھل حذا الا بشر مثلکم افاتون السحر و انتم تبصرون۔** (انبیاء، ۳)

ترجمہ : ان ظالموں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں کہ وہ تم ہی جیسا انسان ہے پھر کیا وجہ ہے کہ تم آنکھوں دیکھتے جادو میں آجاتے ہو۔

امام رازی نے فرمایا:

انھم طعنوا فی بنبوتہ بامرین، احدھما انہ بشر مثلھم و الثانی ان الذی اتی بہ سحر، و کلا الطعنین فاسد (کبیر جز ۲۲، ص ۱۴۱)

ترجمہ: کفار نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت میں دو طعن کیے ۔ آپ ہمارے جیسے بشر ہیں، جو کتاب لائے، یعنی کلام پڑھ کر سناتے ہیں وہ جادو ہے۔ تو ثابت ہوا کہ آپ ﷺ اپنے جیسا بشر کہنا شیوہ کفار ہے،

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جن کفار نے آپ ﷺ کو اپنے جیسا بشر کہا اللہ تعالیٰ نے ان کو ظالم کہا

۔اگر نبی کریم ﷺ کو بشر محض یا اپنے جیسا بشر کہنا جائز ہوتا اور اس سے نبی کریم ﷺ کی تحقیر اور تنقیصِ شان نہ ہوتی تو بطور مذمت ان کو ظالم نہ کہا جاتا۔

قرآن حکیم کا یہ فتوی پڑھنے اور سننے اور جاننے کے بعد بھی اگر کوئی اپنے جیسا بشر، یا صرف بشر کہتا یا لکھتا پھرے تو اس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے؟ امام رازی نے آپ ﷺ کی بشریت مثلیہ کا عقیدہ رکھنے والوں کو فسادی قرار دیا کیونکہ یہ خیال فاسد ہے، حضرت مریم نے جبریل سے کہا'' ''**لم یمسسنی بشر**'' اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بشرا سویا فرمایا جب وہ مریم علیہا السلام کے سامنے گئے،

صاحب روح المعانی نے بشر کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔

''سمی بشر الظھور بشرته او لان اللہ تعالیٰ باشر اباه و خلقه بیدیه''

(روح المعانی جز ۳ ص ۱۶۴)

ترجمہ: انسان کا نام بشر اس لئے رکھا کہ اس کی شکل وصورت، قدوقامت ظاہر اور وہ نظر آتا ہے یا اس لئے بشر کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے بشر کے باپ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا یہ ہے بشر کی وجہ تسمیہ لیکن اس کو غلط معنیٰ میں استعمال کیا گیا جس طرح شیطان اور ہر دور کے کفار نے انبیاء کی توہین اور بے ادبی میں اس کے غلط معنی کا پرچار کیا اللہ تعالیٰ نے ہر اس لفظ کا استعمال جس کا تلفظ اور اطلاق کسی بھی طرح کا ہو لیکن اس سے ذات نبوی ﷺ کی توہین اور بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو ناپسند فرمایا ہے اور اس کے بولنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

''**لاتقولو اراعنا و قولو اانظرنا**'' اسکی واضح مثال موجود ہے، ''**قل انما انا بشر مثلکم**'' الآیۃ میں بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی بشریت کے اظہار اور اقرار کا حکم ضرور دیا ہے۔

مگر خود اللہ تعالیٰ نے کسی بھی مقام پر یا ایھا البشر نہیں کہا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشر نہ بنایا؟ جب بشر بنایا ہے تو س پھر خود کیوں نہیں کہا؟ کیا آپ کا نام نامی اسم گرامی محمد ﷺ اور کُنیت

ابوالقاسم نہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو یہ کیوں فرمایا:

"لا تجعلوا دُعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضًا"

ترجمہ : رسول اللہ ﷺ کو ان کا نام لیکر اُونچی آواز سے مت پکارو، جسطرح تم ایک دوسرے کو نام لیکر اُونچی آواز سے پکارتے ہو، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، اور ابونعیم نے "الدلائل" میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

"کانوا یقولُون یا محمد، یا ابا القاسم فنھاھم اللّٰہ تعالٰی عن ذالک بقولہ سبحانہ لا تجعلوا الایہ اعظامًا لنبیہ ﷺ فقالوا یا نبی اللّٰہ یا رسول اللّٰہ و روی ھذا عن قتادہ والحسن، وسعید بن جبیر، ومجاھد"

وفی احکام القرآن للسوطی ان فی ھذا النھی تحریم ندائہ ﷺ"

(روح المعانی جز ۱۸ ص ۲۲۵)

ترجمہ : صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کو یا محمد، یا ابا القاسم کہہ کر پکارا کرتے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تعظیم کی خاطر **لا تجعلوا الآیہ** سے منع فرمادیا اس کے بعد صحابہ کرام آپ ﷺ کو یا نبی اللہ، یارسول اللہ کہہ کر پکارتے تھے، یہ معنی اور شان نزول قتادہ، حسن، سعید بن جبیر، مجاہد سے مروی ہے، امام جلال الدین سیوطی نے تفسیر احکام القرآن میں بیان کیا **"لا تجعلوا"** کی نہی تحریم کے لیے ہے آپ کو آپ کے نام سے پکارنا حرام ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ صحابہ کرام سے بڑھ کر ذات نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کی تعظیم کرنے، اور ادب بجالانے والا کون ہوسکتا ہے؟ جنہوں نے ایک اشارے پر جان و مال، عزت و آبرو کو محبت رسول اور عظمت رسول پر نچھاور کیا۔ ان کی نیتوں میں رسول اللہ کی توہین اور بے ادبی کا قصور اور فتور کیسے ہوسکتا تھا لیکن چونکہ یہ عام لوگوں کا طریقہ اور عام نداء تھی صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کو بھی عام لوگوں میں شمار کرتے ہوئے نداء کا وہی انداز اور وہی طریقہ اپنایا جس کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا: اور

رسول اللہ کو نداء عام سے پکارنے پر پابندی لگادی۔ حضور ﷺ کو اپنے جیسا بشر کہنے اور محض بشر سمجھنے والے کون لوگ ہیں؟ ان کا پس منظر کیا ہے اور ان کا قائد کون ہے؟

جب اللہ تعالیٰ کو صحابہ کرام جن کے دلوں میں حب رسول ﷺ کا سرور اور آنکھوں میں عظمت مصطفےٰ ﷺ کا نور ہے کی نداء عام نامنظور اور ناپسند ہے۔ تو شیطان اور کفار کا توہین اور تحقیر سے لبریز لفظ بشر کا اطلاق کیسے پسند اور کیسے گوارہ ہے؟ آیہء کریمہ میں "مثلکم" کا لفظ بھی موجود ہے۔ مسلمہ بات ہے کہ "کم" ضمیر کے مخاطبین کفار مکہ ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں کیسے روا ہے؟ اور کس معنی میں ہے؟ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "مثل" کی تعریف کی جائے، تاکہ "مثلکم" کا مفہوم سمجھنے میں ابہام نہ رہے" علامہ بیضاوی نے فرمایا کہ "المثل فی الاصل بمعنی النظیر یقال مثل و مثل "یعنی" مثل "لغت میں نظیر کو کہا جاتا ہے۔ جیسے "مثل" اور 'مثل' نظیر پر بولے جاتے ہیں ملا علی قاری نے فرمایا:

"المثل المطلق ھو المساوی من جمیع الوجوہ" (شرح فقہ اکبر ص ۱۷)

ترجمہ: مطلقاً مثل اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر لحاظ یعنی اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے دوسری چیز کے مساوی ہو۔ صاحب روح المعانی نے فرمایا:

"المثل قال الراغب اعم الالفاظ الموضوعۃ للمشابھۃ"

ترجمہ: مشابہت کے لیے جو الفاظ وضع کیے گئے ہیں ان میں مثل کا لفظ عام مشہور ہے۔ تفصیل کرتے ہوئے فرمایا:

"وذاک ان الند یقال لمایشارک فی الجوھر فقط و الشبہ لمایشارک فی کیفیۃ فقط، و المساوی لمایشارک فی الکمیۃ فقط الشکل لمایشارک فی القدر و المساحۃ فقط، و المثل عام فی جمیع ذالک"

ترجمہ: ایک شیء کا دوسری شیء کے ساتھ مادہ میں شریک ہونا ''الند'' اور اگر کیفیت یعنی وصف حالت میں شریک ہو تو شبہ ہے اگر تعداد یا حجم میں شریک ہو تو کمیت ہے، اور اگر قد و قامت میں شریک ہو تو شکل ہے اور ان تمام امور میں شریک ہونے کا نام مثل ہے۔

امام رازی نے فرمایا: ''ان المثلین عند المتکلمین هما اللذان یقوم کل منهما مقام الاخر فی حقیقته و ماهیته'' (روح المعانی جز ۲۴، ص ۱۸)

ترجمہ: متکلمین کے نزدیک وہ دو چیزیں جو ایک دوسرے کی مثل ہوں گی جو حقیقت و ماہیت میں ایک دوسرے کے قائم مقام ہوں۔

علمائے اصول نے فرمایا: ''ان المماثلة من النسب المکررة، فاذا کان الشیء مثلا لشیء فذالک الشیء ایضا مثل له بلا تکلف'' (حاشیہ حسامی ص ۱۶)

ترجمہ: بے شک مماثلت نسبت مکررہ سے ہے، (یعنی دو چیزوں کا ایک دوسری کی طرف منسوب ہونا اور حمل ہونا ہے) جب ایک شیء دوسری شیء کی مثل ہو تو لامحالہ دوسری شیء پہلی شیء کی مثل ہوگی۔ اس تفصیل کا ماحصل یہ کہ مثل کے لیے ضروری ہے کہ 'ممثل' اور 'ممثل لہ ذات، صفات میں ایک دوسرے کے مساوی ہوں۔ ایک دوسرے پر ان کا حمل اور اطلاق جائز اور ممکن ہو۔ یعنی ''ا'' اپنی ذات و صافت میں ''ب'' کے مساوی ہو اور ''ب'' بھی اپنی ذات و صفات میں ''ا'' کے مساوی ہو۔ ''الالف باء اور 'الباء، الف' کہنا جائز ہو۔ دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی بشریت، کفار کی بشریت کے مماثل ہے؟

ہر گز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اندھا، بہرا، چار پائے اور بدترین مخلوق قرار دیا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ حکم صادر فرمایا ہے تو اس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں تو بشر ہیں مگر اوصاف انسانیت اور دیگر تقاضا ہائے بشریت پورا نہ کرنے کی وجہ سے بدترین مخلوق ہیں، سوچنے کی بات ہے کہ یہ بدترین مخلوق اس ذات کی مثل کیسے ہو سکتی ہے؟

جن کی صورت وسیرت کی اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھائی ہیں۔

آیہ مقدسہ کے واضح الفاظ، اور صریح معنی کے پیشِ نظر حضور ﷺ کی بشریت نعوذ باللہ اگر کفار کی بشریت جیسی ہی ہے تو کفار ایک بشر کو کیوں نہ دیکھ سکے، جس کا جنم، تربیت، بچپن، جوانی ہر ہر چیز کا گوشہ ان کے سامنے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون" آپ کی بشریت کا عالم تو یہ ہے کہ آپ طیّب پشت سے طیّب پشت اور طیّب شکم سے طیّب شکم کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا سے نکاح کرنا اور اس کے نتیجہ میں آپ کا تولّد ہونا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ جب کہ کفار کی بشریت کو اللہ تعالیٰ نے پلید اور نجس فرمایا ہے:

"انما المشرکون نجسٌ"

چہ نسبت خاک را بعالم پاک

مذکورہ تفصیل کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی بشریت کفار کی بشریت کے مماثل اور مساوی ہے تو یہ باطل اور غلط فاحش ہوگا کیونکہ اس سے ایک استحالہ لازم آتا ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ جن دو چیزوں میں مماثلت ہو ان کے لیے لازم ہے وہ من کل وجوہ ایک دوسری کی مثل ہوں۔ اور ان کا ایک دوسری پر اطلاق اور حمل جائز ہو، مثل کے لفظی اور اصطلاحی معنی کی روشنی میں آپ ﷺ ایک ہی وقت اور ایک ہی جہت (بشریت) میں مثلکم کے مخاطبین کی مثل بھی ہوں گے اور "یوحی الی" کی وجہ سے رسول بھی ہوں گے، یہ مماثلت مستحیلہ ہے لہذا ماننا پڑیگا کہ مماثلت کا معنی یہ ہے کہ میں الٰہ نہیں جو تم مجھ سے ان امور کا مطالبہ کرتے ہو،

الٰہ نہ ہونے میں تم مجھ جیسے ہو اور میں تم جیسا ہوں، امام رازی نے فرمایا:

"ای لا امتیاز بینی و بینکم فی شیءٍ من الصفات الا ان اللہ تعالٰی اوحی الی

انہ لاالہ الااللہ الواحد الاحد الصمد"(کبیر جز ۱ ص ۱۷۶)

ترجمہ :انسانی صفات،مثلاً چلنا، پھرنا، کھانا، پینا، دیکھنا سننا، شادی بیاہ کرنا، تجارت کرنا، ان میں، تم جیسا اور تم مجھ جیسے ہو لیکن اس بات میں مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود، معبود واحد ہے، اللہ واحد، احد، اور صمد کے بغیر کوئی معبود حقیقی نہیں،،

امام رازی کے قول سے یہ ثابت ہوا کہ میں ذات وصفات میں تمہاری مثل نہیں بلکہ صرف اوصاف انسانیت (جن کا ابھی تذکرہ ہوا) ان میں مماثلت ہے۔

مؤلف کتابچہ نے ہر جگہ بدوں قیدو بدوں تمیز بشر کا معنی ذات وصفات میں مماثل ہونا لیا ہے جو امام رازی کے بیان کردہ معنی کی روشنی میں غلط ہے۔اصول وقواعد کی روشنی میں باطل محض ہے،

قل انما انا بشر مثلکم کا مفہوم

اسی عنوان کے تحت امام رازی نے فرمایا:"**قل انما انا بشر مثلکم،یوحی الی آلایۃ**" کفار کے تین شبہات کا جواب ہے۔جو رسول اللہ ﷺ کو دعوت توحید کے جواب میں انہوں نے پیش کیے۔

(۱) "**قلوبنا فی اکنۃ مماتدعونا الیہ**"جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو وہ ہمارے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ ہمارے دل انتہائی مضبوط گہرے پردوں میں ہیں۔

(۲) "**فی اذاننا وقر**" ہمارے کانوں میں رینٹھ ہے۔یعنی ہم بہرے ہیں۔

(۳) "ومن بیننا وبینک حجاب" آپ کے اور ہمارے درمیان پردہ حائل ہے، کفار کے ان شبہات کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام میں ذکر فرمایا ہے، امام آگے ارشاد فرماتے ہیں:

”ولما حکی اللہ عنھم ھذہ الشبھة امر محمدا ﷺ ان یجیب عن ھذہ الشبھة بقولہ قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی الایة“

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کو بیان کیا اور محمد ﷺ حکم فرمایا کہ آپ جواب دیں کہ میں ایسا بشر ہوں جس پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے،،

امام رازی نے فرمایا: ”**انی لا اقدر ان احملکم علی الایمان جبرا و قھرا فانی بشر مثلکم و لا امتیاز بینی و بینکم الا یمجرد ان اللہ عز و جل او حی الی و ما او حی الیکم**“ (کبیر جز ۲۷، ص ۹۸)

ترجمہ : میں اس بات پر قادر نہیں کہ جبراً اور قہر کے ساتھ تمھیں ایمان کا متحمل بناؤں، کیونکہ میں ایک تمہارے جیسا انسان ہوں، میرے اور تمہارے درمیان فرق یہ ہے کہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمہاری طرف نہیں۔

امام رازی کی تفسیر سے ثابت ہوا کہ آیہء کریمہ کفار کے شبہات، اعتراضات اور توہمات کا جواب اور رد ہے یعنی کفار سے ”**بشر مثلکم**“ فرمانا اوصاف انسانی کے اعتبار سے ہے۔

کیونکہ اس کے معاً ”**یوحی الی**“ سے امتیاز پیدا فرمایا کہ میری طرف وحی آتی ہے، اور جس بشر کی طرف وحی آئے وہ رسول اور نبی ہوتا ہے نبوت اور رسالت وصف ہے ایک جلیل القدر منصب کا نام ہے، وصف کے لیے موصوف اور منصب کے لیے ذات مخصوص کا ہونا ضروری ہے۔ ”**یوحی الی**“ میں رسالت مع الذات کی طرف اشارہ ہے جس سے مراد اور جس کا مصداق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے اوصاف انسانیت چلنا پھرنا، کھانا پینا، طاقت کمزوری جیسے اوصاف میں تمہارے جیسا ہوں میں ایسی کسی طاقت کا مالک نہیں جو فوق الفطرت ہو، جس کے بل بوتے تمھیں جبر اور تسلط کے زور پر دائرہ ایمان میں لے آؤں، لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس کے لحاظ سے منصب رسالت پر

فائز ہوں، آیہ کریمہ کا معنی یہ کرنا اور لینا کہ میں محض بشر ہو کر تمہارے جیسا ہوں نص قرآنی کے خلاف ہے، تحریف لفظی اور تحریف معنوی ہے جو کلمہ گو مسلمان کیلئے جائز نہیں،،

اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں صاحب روح المعانی نے فرمایا: ''**لست ملکا جنیا لا یمکنکم التلقی منہ وھو ر دلقو لھم بیننا و بینکم حجاب** (روح المعانی ج ۱۳، ص ۹۷ جز ۱)

ترجمہ : میں فرشتہ یا جن نہیں کہ تم مجھ سے دعوت توحید کو سن کر نہ سمجھ سکو، میرا لہجہ، میری زبان، وہی ہے جو تمہاری ہے۔ ہم وطن، ہم زبان اور ہم لہجہ اور ہم جنس ہونے میں تم جیسا ہوں۔ ورنہ حقیقت اور ذات میں تم سے منفرد اور ممتاز ہوں کیونکہ میں ''یوحی الی'' کا مدلول اور مصداق ہوں۔ مزید معقولات میں مماثلت کون الشیئین فردین لنوع واحد کا نام (مصباح الدجیٰ) ہے دو چیزوں کا ایک نوع کا فرد بننا یا ہونا مماثلت ہے،

ارباب معقولات نے امور عامہ کی بحث میں مثل کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''**ان اجتماع المثلین عبارۃ عن وجود فردین من نوع واحد فی محل واحد فی زمان واحد من جھۃ واحدۃ**'' ایک شی دوسری شی کی مثل اس وقت ہوگی جب دونوں ایک ہی نوع کے فرد ہوں، دونوں کا محل وجود ایک ہی زمانے اور ایک ہی وجہ سے ہو، ''**قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد**''

رسول اللہ ﷺ کے بے مثل اور بے مثال ہونے پر دلیل قطعی ہے ''**انما انا بشر مثلکم**'' معروض ملزوم ہے اور یوحی الی لازم ماہیت لازم فرد ہے اور عرض لازم مفارق ہے، جس نے ''**انما انا بشر مثلکم**'' کو دیگر انسانوں سے منفرد، ممتاز، اور جزی حقیقی بنا دیا ہے جس میں افراد، فرد کا اجتماع اور تمثل محال شرعی اور عقلی ہے معنی یہ ہوگا کہ میں بشر متصف بہ نزول وحی اور ملزوم بلزوم وحی ہوں، تم جیسا نہیں اور نہ کوئی فرد انسان میری مثل ہے نہ ہوسکتا ہے،،

جس طرح انسان تمام افراد انسانی کے لیے نوع ہے، زید عمرو بکر اس کے افراد نوعیہ ہیں، جن کو

شخصیات بھی کہا جاتا ہے، زید عمرو کے من کل الوجوہ مماثل نہیں۔قدوقامت،شکل وصورت اور دیگرعوارضات میں یہ ایک دوسرے کے مغائر ہیں مماثل نہیں ہیں۔صرف ایک جہت، ایک حیثیت میں مماثلت ہے کہ یہ انسان ہیں اوراس کے فرد ہیں۔اسی طرح بشر بھی ایک نوع ہے، جس کے افراد مومن، کافر، اوررسول ہیں، ذات وصفات کے لحاظ سے ان میں کوئی مماثلت نہیں، کیونکہ کافروصف کفر سے متصف ہےاورمومن، ایمان کی بلند پایہ صفت سے موصوف ہے، اوررسول اپنی ذات، اورانسانی صفات کے لحاظ سے دیگرافراد سے منفرداورممتاز ہے ، بالخصوص رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی بے شک انسان جونوع ہے کا فرد ہیں، لیکن آپ اپنی ذات اورصفات کے لحاظ سے فرد شخصی ہیں جس کوجزی حقیقی کادرجہ حاصل ہے جس طرح جزی حقیقی فرداخص ہے اس کااطلاق اورمماثلت غیر کیلئے محال ہے بالکل اسی طرح جس طرح مطلق علم، علم حصولی، اورعلم حضوری کے لیے بمنزلہ نوع کے ہے اس کے دو فرد ہیں۔(۱)علم حصولی(۲)علم حضوری

علم حصولی کے دوفرد ہیں تصوراور تصدیق۔تصوراور تصدیق اپنی حقیقت اور ماہیت میں ایک دوسرے کے منافی ہیں۔تصور مین حکم نہیں جبکہ تصدیق میں حکم ہےان کاایک دوسرے پر اطلاق نہیں ہوسکتا ہے نہ حمل، باوجودیکہ بواسطہ علم حصولی یہ مطلق علم کے فرد ہیں۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور" کم"، ضمیر کے مخاطبین بشر ہیں۔اور بحکم قرآن ان کے درمیان مماثلت بھی ہے۔مگر"مثلکم"میں کم ضمیر جمع کے مخاطبین جانے پہچانے کفار ہیں۔وہ بشر کے افراد ہیں حضور ﷺ بھی بشریت کافرد ہیں مگر فرد شخصی اور جزوی حقیقی ہیں۔کیونکہ آپ کے لیے"یوحی الی' اور"مامحمدالا رسول"کافصل امتیاز اورقصر موصوف علی الصفہ موجود ہے جوآپ کے بشر محض اور بشر مثل ہونے کے منافی اور مناقض ہے۔اس اصول کے تحت آپ اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے کفار مکہ کی مثل نہیں ہوسکتے۔مثل ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ"الہ تم

بھی نہیں اور ''الہ'' میں بھی نہیں، ''الہ'' نہ ہونے میں تم میری طرح ہو اور میں تمہاری طرح ہوں
۔

مزید آیہء مقدسہ میں لفظ بشر آیا ہے۔ یہ دو حیثیات کا حامل ہے (۱) بشر من حیث البشر، یعنی بدوں لحاظ امر آخر کہ وہ مومن ہے، رسول ہے یا کافر، اس لحاظ سے یہ ماہیت اور لابشرط شی کے درجہ میں ہے، اور جب امر آخر کا لحاظ کیا جائے تو یہ بشرط شی کے درجہ میں ہوگا۔ جیسے ''البشر من حیث محمد رسول اللہ، فرد شخصی اور جزی حقیقی ہوگا، جس کا اطلاق کسی بھی دوسرے فرد بشر پر محال شرعی اور محال عقلی ہوگا، الکافرون بشر، اور محمد رسول اللہ بشر کہنا صحیح ہے۔ یہ دو قضیے ہیں۔ موضوعات مختلف، متضاد، مگر محمول دونوں میں ایک (بشر) ہی ہے، تغائر موضوع تغائر عوارض محمول کو مستلزم ہے بشر من حیث الکافر اس کی بشریت کے عوارض اور ہیں۔ اور بشر من حیث محمد رسول اللہ کے عوارض اور ہیں، مثلاً کھانا پینا بشریت کے لیے ایک امر عارض ہے باقی ساری بشریت کے قیام اور بقاء کے لیے کھانا پینا لازمی امر ہے۔ مگر آپ نے اپنی ذات کے لیے اس امر عارض کے لزوم کی بھی نفی فرمادی، اور ارشاد فرمایا :

''ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی'' (متفق علیہ)

بخاری میں ہے: ''انی لست کھیئتکم انی یطعمنی ربی ویسقینی''

یعنی میری شکل وصورت اور حالت تم سے مختلف ہے ''الھیئتہ صورۃ الشی وشکلہ وحالتہ، والمعنی انی لست مثل حالتکم وصفتکم''

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد۶ ص ۷۳، فتح الباری ص ۲۰۳)

''ای علی صفتی اور منزلتی من ربی'' یعنی تم میں سے کوئی بھی میری صفات کا حامل نہیں ۔ ''یا'' اللہ کے ہاں جو میری قدر و منزلت ہے وہ کسی کی نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ کوئی فرد بشر بشمول صحابہ کرام ذات وصفات میں آپ کی مثل نہیں تو ماننا پڑیگا کہ بشریت میں مماثلت کا معنی

یہ ہے کہ مخلوق ہونے میں تم میری مثل ہو اور میں تمہاری مثل، وھوالمراد، اس کی دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

"مامن دآبۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم" (انعام، ۳۸)

ترجمہ: نہیں ہے کوئی جانور زمین میں، نہ کوئی پرندہ جو اپنے بازوؤں پر اڑتا ہو مگر تمہاری مثل امتیں ہیں۔ یہاں بھی لفظ مثل آیا ہے کیا "**امم امثالکم**" کا معنیٰ اور مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ کی مخلوق ہونے میں ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ جیسا کہ اسی آیت کے تحت محدث ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے "**امثالکم**" کے تحت فرمایا: **"فی ان احوالھا محفوظۃ و امورھا معینۃ و مصالحھا مرعیۃ جاریۃ علی سنن السداد منتظمۃ فی سلک التقدیرات الالھیۃ والتدبیرات الربانیۃ"**

ترجمہ: جانوروں اور پرندں کے احوال محفوظ، ان کے معاملات معین، ان کی بہتری کا لحاظ رکھا گیا ہے یہ جملہ امور ایک ترتیب کے ساتھ جاری اور ساری ہیں، تدابیر اور تقادیر الٰہی کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یعنی جسطرح تمہارے احوال محفوظ، معاملات زندگی مختص اور تمہاری ترقی اور مصالح کا خیال رکھا گیا ہے جسطرح تمہارا نظام حیات تقدیر اور تدبیر الٰہی کے تابع ہے اسی طرح ان کا بھی ہے، یہاں حالات دآبہ اور حالات طائر کو حالات انسان کی مثل قرار دیا گیا ہے اس سے کب لازم آتا ہے کہ انسان، جانور اور پرندے ایک جیسے ہوں، اسی طرح آیہء کریمہ "**انما انا بشر مثلکم**" میں فرمایا کہ بشری حالات اور صفات میں تمہاری مثل ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کی نسبت قرآن نے فرمایا:

"یانسآء النبی لستن کاحد من النسآء" (احزاب)۔

ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیبیو تم لوگوں کی عورتوں کی مثل نہیں ہو، سوال یہ کہ ازواج مطہرات دُنیا کی عورتوں کی طرح کیوں نہیں۔ کیا ان کی شکل وصورت عورتوں جیسی نہیں، عورتوں کی صفات

اُن میں نہیں پائی جاتیں، کیا اولاد پیدا کرنیکی ان میں صلاحیت نہیں، ان تمام امور کے پائے جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی عورتوں کی مثل ہونے سے نفی فرمادی اور دوسرے لفظوں میں ان کے بے مثل ہونے کا اعلان فرمایا، دیکھنا یہ ہے کہ بے مثل ہونے کا اعزاز انہیں کہاں سے ملا؟ اور کیوں ملا یہ اعزاز اور یہ افضلیت انہیں ازواج نبی بننے کیوجہ سے حاصل ہوئی، جیسا کہ "یانسآء النبی" کے جملہ سے ظاہر ہے، یہ اعزاز اور افضلیت لذاتہا نہیں بلکہ لغیرہ ہے، ازواج مطہرات کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے ہوئی تو ان جیسی کوئی عورت نہ ہوئی تو اس ذات پاک جیسا کون ہوسکتا ہے جس کی طرف منسوب ہونے نے ازواج مطہرات کو بے مثل بنادیا۔ مزید انسان اور بشر مترادف لفظ ہیں دونوں کا مصداق ایک ہی ہے اور وہ آدمی ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی میں شیطان، اور نوح علیہ السلام کے زمانے سے لیکر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک کے تمام کافروں نے نسلاً اپنے، اپنے زمانے کے نبی کو "بشر مثلنا" کہا اور اس لفظ کے کہنے سے ان کی نیت مقام نبوت کی تحقیر اور شان رسالت کی تنقیص اور انکار تھا ورنہ یوں کہنا بھی ممکن تھا کہ یہ ہمارے جیسے ہی انسان ہیں۔ جیسے قرآن حکیم مین دو لفظ "راعنا 'اور 'انظرنا" باہم مترادف ہیں، دونوں کا معنی ایک ہی ہے ہم پر نظر کرم فرمائیں ہمیں رعایت دیں۔ یعنی جب تک آپ کا ارشاد ہمارے فہم میں نہ آئے آگے ارشاد نہ فرمائیں، توقف فرمائیں۔ لیکن یہود نے "راعنا" کے لفظ کو تبدیلی لہجہ کے ساتھ "راعینا" کہنا شروع کیا جس سے گستاخیءرسول ﷺ کا پہلو اجاگر ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے توہین پر مبنی لفظ "راعنا" کے بولنے پر پابندی لگادی اور حکم دیا "لاتقولوا راعنا و قولوا انظرنا" امام رازی نے "راعنا" سے نکلنے والے بے ادبی سے لبریز کئی معانی بیان کیے ہیں جن کو خوف طوالت کے پیش نظر ترک کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بدنیتی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "یقولون "سمعنا و عصینا و اسمع غیر مسمع و راعنا لیا بالسنتھم و طعنا فی الدین" (نساء یعنی راعنا

کے لفظ کی قرآت اور لہجہ بدلنے میں دین متین میں طعن اور شان رسالت مآب کی توہین اور گستاخی نمایاں تھی اس لیے عشاقان رسول ﷺ جن کی نیت مخلصانہ اور محبانہ تھی، کو بھی اس لفظ کے بولنے سے منع فرمادیا گیا، امام رازی نے فرمایا :

"انہ لا یبعد فی الکلمتین المترادفین ان یمنع اللہ من احدھما و یأذن فی الاخری فلذالک عند الشافعی رضی اللہ عنہ لا تصح الصلوۃ بترجمۃ الفاتحۃ سواء کانت بالعبریۃ او بالفارسیۃ، فلا یبعد ان یمنع اللہ من قولہ راعنا و یأذن فی قولہ انظرنا و ان کانتا مترادفین و لکن جمھور المفسرین علی انہ تعالٰی انما منع من قولہ راعنا لاشتما لھا علی نوع مفسدۃ ذکروا فیہ وجوھا"

(کبیر جز ۳ ص ۲۲۳)

ترجمہ : مترادف کلمات میں یہ کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالٰی نے ایک کے استعمال سے منع اور دوسرے کی اجازت دی ہو، اس بناء پر امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک نماز میں اگر سورۃ فاتحہ کے ترجمہ میں عبرانی، یا فارسی کے مترادف الفاظ پڑھے جائیں تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ یعنی اگرچہ فارسی اور عبرانی کے الفاظ عربی الفاظ کے ہم معنی ہوں۔ اسی طرح یہ کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالٰی نے "راعنا" کہنے سے منع کیا ہو اور "انظرنا" کہنے کی اجازت دی ہو۔ گو دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔ لیکن جمہور مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بے شک اللہ تعالٰی نے "راعنا" کہنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کا معنی ایک فسادکاری کا آئینہ دار ہے۔

آگے فرمایا: "بین ان لا بد من تعظیم الرسول علیہ السلام فی المخاطبۃ، علی ما قال لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا" اللہ تعالٰی نے واضح فرمایا کہ بوقت خطاب رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء کرام نے اپنی ذوات کے لیے بشر کا اطلاق کیا ہے۔ مگر یہ عاجزی اور انکساری کے طور پر

ہے۔شیطان اور کفار نے حقارت، تنقیص، اور انکار کے معنی میں کیا ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ کے دیگر اوصاف کو چھوڑ کر بشر، بشر کی رٹ لگانا یقیناً بے ادبی اور گستاخی ہے،

الفاظ آیت اور احمد ممتاز کی کوتاہ فہمی

مؤلف نے دلیل کے ضمن میں آیہ کریمہ ”ربنا وابعث فیھم رسولا یتلو علیھم آیاتک“ اس کا ترجمہ تو ٹھیک کیا۔مگر فائدہ کے مندرجات میں یہ تحریر کیا کہ یااللہ میری اولاد (یعنی بشر) میں ایک ایسا رسول بھیج جو ان (یعنی بشر میں سے ہو) آگے لکھا یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ”رسولا من الملائکۃ والمخلوق النوری،“ کہ فرشتہ اور نوری کو بھیج دے بلکہ فرمایا ان میں سے کسی بشر کو رسول بنا کر بھیج۔(ص ۱۵)

مؤلف کا یہ کہنا کہ میری اولاد بشر میں ایک ایسا رسول بھیج (جو ان میں سے ہو) وضاحت طلب ہے۔مؤلف کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذریت جو مکہ اور اس کے اردگرد آباد تھی ان میں انہی میں سے زمانہء حال میں رسول بھیجنے کی استدعا کر رہے ہیں جبکہ

آیہء کریمہ کا یہ مفہوم نہیں بلکہ مفہوم یہ ہے میری اس اولاد سے ایک عظیم المرتبت پیغمبر بھیج، جو ان کے سامنے تیری آیات پڑھ کر سنائے۔امام رازی نے فرمایا:

”ان ابراھیم علیہ السلام انما دعا بھذا الدعا بمکۃ لذریتہ الذین یکونون بھا وبما حولھا ولم یبعث اللہ تعالیٰ الی من مکۃ وما ھو الا محمدا ﷺ“

ترجمہ: بے شک ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مکہ میں سکونت پذیر اپنی اولاد کے لیے مانگی جو مکہ میں اس کے اطراف واکناف میں رہائش پذیر رہیں گے۔زمانہ حال میں مقیم اولاد کے لیے نہیں بلکہ آنے والی اولاد کے لیے مانگی ہے۔یعنی میری موجودہ اولاد سے جو آگے نسل چلے گی

۔ان میں سے ایک عظیم المرتبت رسول بھیج۔امام رازی نے فرمایا:

"ان الرسول هو محمد ﷺ رسولا" سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ "کیونکہ اس پر مفسرین کا اجماع ہے۔فرمایا اجماع المفسرین "**وهو حجة**"مفسرین کا اجماع حجت ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "**انا دعوة ابراهيم وبشارة عيسىٰ**"(کبیر جز ۴ ص ۷۳)

جمہور مفسرین کے مطابق رسول سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کو بشر محض کہا گیا ہے۔اور بزبان ابراہیم علیہ السلام کہا ہے جو غلط اور نص قطعی کے خلاف ہے۔کیونکہ آیۂ کریمہ میں جو دعا ہے اس میں "**رسولا منهم**" کا لفظ آیا ہے مؤلف کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میری اولاد یعنی بشر میں سے ہو ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ابراہیم علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ میری اولاد بشر ہے ۔اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ایک اولاد ایسی تھی جو بشر نہ تھی اس لیے آپ کو اولاد بشر کی تخصیص کرنا پڑی۔یہ بھی غلط ہے کیونک باپ بشر ہو تو اولاد بھی بشر ہو گی کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پتہ نہ تھا کہ میری اولاد بشر ہے؟ کیا ابراہیم علیہ السلام کے لیے ممکن تھا کہ وہ " **رسولا من الملائكة او المخلوق النوری**" کہتے، یہ تو تب ممکن ہوتا جب اللہ تعالیٰ نے کسی دور مین انسانوں کی ہدایت کیلئے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا ہوتا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک تمام پیغمبر اور رسول انسان تھے اس لئے بشر کہنے کی ضرورت تھی نہ فرشتہ اور نوری مخلوق کہنے کی، الملائکۃ کے بعد والمخلوق النوری تحریر کر نیکی کیا مجبوری تھی؟ نوری مخلوق میں فرشتوں کے علاوہ حور وغلمان بھی ہیں کیا وہ بھی پیغمبر اور رسول ہو سکتے ہیں؟ مولف کسی بھی دور کی کوئی مثال پیش نہ کر پائیں گے،رسولاً کا ترجمہ بشرًا کرنا غلط ہے۔اور یہ "**توجيه القول بما لا يرضى به القائل**" ہے، جو مردود اور باطل ہے، یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور اس کے ارد گرد عرب تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، اُن میں سے کوئی بھی مسلمان نہ تھا اس کا

جواب دیتے ہوئے امام رازی نے فرمایا۔ "قال القفال انه لم یزل فی ذریتهما من یعبد الله وحده و لا یشرک به شیئًا و لم یزل الرسل من ذریة ابراهیم و قد کان فی الجاهلیة زید بن عمرو بن ثقیل، و قس بن ساعدة و یقال عبد المطلب بن هاشم جد رسول الله ﷺ و عامر بن الظرب کانو اعلی دین الاسلام یُقرون بالایداء و الا عادة و الثواب و العقاب و یوحدُون الله و تعالٰی و لا یأکلون المیتة و لا یعبدُون الاوثان" (کبیر جز ۴۔ص ۶۸)

ترجمہ:۔ قفال نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو ایک اللہ کی عبادت کرتے، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں رسولوں کا سلسلہ جاری رہا زمانہء جاہلیت میں زید بن عمرو بن نفیل قیس بن ساعدو اور عامر بن الظرب دین اسلام پر تھے۔ جو پیدائش، موت اور موت کے بعد زندہ کیے جانے، نیک اعمال پر ثواب، اور بُرے اعمال پر عذاب، پر ایمان اور یقین رکھتے تھے، وہ اللہ تعالٰی کی توحید کا اقرار اور پرچار کرنے والے تھے مردار کھانے والے، اور بتوں کی پوجا کرنے والے نہ تھے، ہشام بن محمد الکلبی اپنے باپ سے روئیت کرتے ہیں کہ

"کتبت للنبی ﷺ خمسمائة ام فما و جدت فیهن سفاحا و لا شیئا مما کان من امر الجاهلیة" (البدایہ والنھایہ جز ۲ ص ۲۳۹)

ترجمہ: حضور ﷺ کی ماؤں کی تعداد پانچ سو بتائی گئی ہے۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی بدکار تھی نہ امور جاہلیت کی پیروکار۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بنو ہاشم تک جس فرد کو بھی آپ کی ماں یا باپ بننے کا شرف حاصل ہوا وہ بدکردار تھا نہ مشرک" رسولا پر تنوین تمکن یا تنکیر ہے یہ رفعت شان اور عظمت مقام پر دلالت کرتی ہے جس کا مقصد یہ کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عظیم المرتبت رسول کے مبعوث کیے جانے کی استدعا کی۔
مگر مؤلف نے رسولا کا معنی بشر کیا ایک تو تفسیر بالرائے کی اور دوسرا ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسالت کے عظیم منصب سے اتار کر بشریت عامہ کی صف میں لے آئے۔ جس کو شرف پذیرائی بخشنا جہالت اور حماقت ہے۔

"لقد من اللہ علی المؤمنین الایہ" کے معنی میں احمد ممتاز کی کج بیانی

مؤلف نے مذکورہ بالا دلیل دوم کی تائید میں آیہء کریمہ **"لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم"** نقل کی آیہ کریمہ کا ترجمہ کرنے کے بعد فائدہ کے تحت لکھا یہاں مؤمنین سے بشر اور انسان مراد ہیں۔
توضیحاً کہا جائے گا اس میں شک نہیں کہ بشر انسان ہیں۔ اور انسان بشر ہیں۔ انسان اور بشر لفظ عام ہے جو تمام اولاد آدم کو شامل ہے۔ اس میں مومن اور کافر سب داخل اور شامل ہیں گویا لفظ بشر اور انسان لفظ عام ہے مومن اور کافر دونوں کو محیط ہے۔ لیکن مومنین کا لفظ اپنے اطلاق اور مصداق کے لحاظ سے خاص ہے۔ علماء نے لفظ خاص کی تعریف یوں کی ہے۔ **"الخاص لفظ وضع لمعنی معلوم علی الانفراد"**
ترجمہ : انفرادی طور پر جس کی وضع معنیء معلوم یا مسمی معلوم کے لیے ہو، جیسے زید کا لفظ مسمی معلوم ذات زید کے لیے ہے، دیگر کسی فرد کے لیے نہیں، معنی معلوم جیسے لفظ "رجل" اور لفظ انسان، تمام مردوں کو شامل ہے۔ زید فرد خاص، جنس خاص، اور انسان نوع خاص ہے۔
اور عام: لفظ **"ینتظم جمعا من الفراد"** افراد کے مجموعہ کو شامل ہونے والے لفظ کو عام کہتے ہیں اسکی مثال مسلموں اور مشرکون ہے، یہ عام کے حکم میں تب ہوں گے جب ان کے اوپر جنس عالی نہ ہو۔ انسان اور بشر کا لفظ کافر اور مومنین کے لیے جنس عالی ہے جس کے مطابق کافر اور

مومنین اس کی جنس تحتانی اور افراد ہیں، جنس تحتانی یعنی فقط جنس کو جنس عالی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ فقط جنس، جنس عالی کے مقابل اخص، اور جنس عالی فقط جنس کے تقابل میں اعم ہوتی ہے، اعم اور اخص عنوان تعریف اور مصداق میں ایک دوسرے کے مناقض ہیں۔ اس تفصیل کے بعد آیہ کریمہ کی طرف آئیے آیت میں لفظ مومنین کا ذکر ہے مولف نے اس کا معنی اور مراد بشر اور انسان لیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ لفظ خاص کا معنیٰ عام لیا اور خاص کو عام پر محمول کیا ہے جو غلط ہے۔ امام رازی نے معنیٰ خاص ''یعنی مومنین'' کو اپنے خصوص پر باقی رکھتے ہوئے فر مایا: ''**اعلم ان بعثة الرسول احسان علی کل العالمین و ذالک لان وجه الاحسان فی بعثة کونه داعیا لهم الی ما یخلصهم من عقاب اللہ و یوصلهم الی ثواب اللہ و هذا عام فی حق العالمین لانه مبعوث الی کل العالمین کما قال تعالیٰ و ما ارسلناک الا کافة للناس، الا انه لما لم ینتفع بهذا الانعام الا اهل الاسلام فلهذا التاویل خص اللہ تعالیٰ هذه المنة بالمومنین** (کبیر۔جز۔۹۔۷۸)

ترجمہ: ۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام عالمین پر احسان ہے۔ اور آپ کی بعثت وجہء احسان اس لئے ہے کہ آپ عالمین کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں جو انہیں اللہ کے عذاب سے بچا کر ثواب کی دولت عطا کرتے ہیں۔ یہ سب عالمین کیلئے ہے کیونکہ آپ کی بعثت تمام عالمین کیلئے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**و ما ارسلناک الا کافة للناس**''

چونکہ اہل اسلام کے علاوہ کسی اور نے اس انعام خداوندی سے فائدہ نہیں اٹھایا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے مومنین پر احسان فرمایا ہے۔ امام رازی نے آیہ کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ آپ کی بعثت عالمین اور الناس کے لیے ہے عالمین اور الناس کا مال، مصداق، انسان اور بشر ہیں، جن میں مومن اور کافر سب شامل ہیں یونہی ہر انسان اور ہر فرد بشر الناس میں داخل ہے لیکن ان میں سے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس انعام سے مستفیض ہونے کی وجہ سے مختص

فرمایا، لفظ الناس اس پر قرینہ موجود ہے مومنین کا لفظ اپنے اطلاق اور اپنی معنویت کی وجہ سے مخصوص ہے اس سے مراد انسانوں کا ایک مخصوص گروہ ہے جو وصف ایمان سے متصف ہے اور یہ بشرط شی ء کے درجہ میں ہے جبکہ انسان اور بشر ''لا بشرط شی ء'' کے عنوان میں ہیں لہذا مومنین کو صرف لفظ بشر سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں اس کی تفریق نوعی اور امتیاز جنسی موجود ہے۔ ہر فرد بشر اور ہر انسان کو ''یا ایھا الناس'' اور مومنین کو ''یا ایھا الذین امنوا'' اور کافروں کو ''یا ایھا الکافرون'' سے مخاطب کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی انسان اور بشر ہیں مگر محض بشر نہیں بلکہ وہ بشر ہیں جو وصف ایمان سے متصف ہیں جیسے انسان کاتب اس انسان سے مختلف ہے جو کاتب نہیں۔ رہا ''من انفسھم'' جس کا ترجمہ مؤلف نے ان میں ان کی جنس سے رسول بھیج کیا ہے (ص ۱۴) اس کی تفسیر میں امام رازی نے فرمایا:

''و ذالک انہ صار شرفا للعرب و فخرا لھم کما قال و انہ لذکر لک و لقومک و ذالک لان الافتخار با ابراھیم علیہ السلام کان مشترکا فیہ بین الیھود و النصارٰی و العرب، ثم ان الیھود و النصاری کانوا یفتخرون بموسیٰ و عیسیٰ و التورۃ و الانجیل فما کان للعرب مایقابل ذالک فلما بعث اللہ محمدا علیہ السلام و انزل القرآن صار شرف لعرب بذالک زائدا علی شرف جمیع الامم'' (کبیر جز ۹ ص ۸۰)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کا عربوں (من انفسھم) سے مبعوث کیا جانا ان کے لیے باعث شرف اور باعث افتخار تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تیرے اور تیری قوم کے لیے یہ ذکر عزت، شرف اور شہرت کا باعث ہے۔

کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر فخر کرنا یہود و نصاریٰ کے درمیان مشترک تھا۔ یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، تورات اور انجیل پر فخر کرتے تھے، جبکہ

اس کے مقابل عربوں کے پاس کوئی چیز قابل فخر نہ تھی۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ کو ان عربوں (من انفسھم) سے مبعوث فرمایا گیا اور ان پر قرآن حکیم اتارا گیا تو عرب قوم کو ایسا شرف ملا جو تمام امتوں کے شرف پر حاوی اور غالب آ گیا۔ اس تفسیر سے واضح ہو گیا کہ (من انفسھم) سے مراد عرب قوم ہے جو مخصوص ہے، یہود و نصاریٰ اس میں شامل نہیں۔

نمبر: ۱۲ اگر اس کا معنی ان کی جنس سے لیا جائے تو غلط ہوگا کیونکہ ان کی جنس انسان اور بشر ہے ان میں توحید پرستوں اور مشرکوں کا کوئی امتیاز نہ ہوگا، تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کی بعثت عربوں میں سے ہوئی ہے اور پھر عربوں کی اس نسل سے جو ہر دور میں توحید پرست رہی ہے۔ جیسا کہ امام رازی کی تفسیر اس عنوان میں پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔

مفہوم آیت میں احمد ممتاز کی ایک اور کج فہمی

مؤلف نے فائدہ کے تحت اس آیت کو بطور دلیل نقل کیا "**ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم**" اور پھر کہا کہ "امیین" سے مراد انسان اور بشر ہیں۔ (ص ۱۶)

بالکل غلط ہے "امیین" کی توضیح کرتے ہوئے امام رازی نے فرمایا: "**الامی منسوب الی امۃ العرب، لما انھم امۃ امیون لا کتاب لھم ولا یقرءون کتابا ولا یکتبون وقال ابن عباس یرید الذین لیس لھم کتاب ولا نبی بعث فیھم، وقیل الامیون الذین ھم علی ماخلقوا علیہ**" (کبیر جز ۳۰، ص ۳)

امیین کا لفظ امت العرب کی طرف منسوب ہے اس لیے کہ امی لوگوں کی اصل وہی ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں، وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی کتاب نہیں اور نہ ہی ان میں کوئی نبی مبعوث ہوا ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ امیین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جبلت پر ہیں یعنی جنہیں

دینیات، اخلاقیات، اور معاملات کا شعور اور علم نہیں۔

معلوم ہوا امیین سے مراد وہ خاص عرب ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل کوئی رسول آیا نہ کتاب اتاری گئی۔

قارئین فیصلہ فرمائیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان کردہ معنی اور مراد درست ہے یا مؤلف کتابچہ کا؟

اگر بقول مؤلف کے امیین سے مراد بشر اور انسان ہیں تو پھر یہود و نصاری انسان ہونے کے ناطے اس میں شامل اور داخل ہیں، حالانکہ وہ امیین نہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں عالم فرمایا۔

"فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (انبیاء: ٦)

کفار مکہ سے کہا گیا کہ اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے تھا تو ان سے کہو کہ یہود و نصاری جو اہل علم اور اہل کتاب ہیں ان سے پوچھو کہ رسول صورت بشری میں آتے رہے یا صورت ملکی میں۔ امام رازی نے فرمایا:

"ثم انھم کانوا مقرین بان الیھود و النصاری اصحاب العلوم و الکتب فامرھم اللہ بان یرجعوا فی ھذہ المسئلۃ الی الیھود و النصاری" (کبیر جز ٢٠، ص ٣٦)

ترجمہ: کفار مکہ یہ اقرار کرتے تھے کہ یہود و نصاری اہل علم اور اہل کتاب ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو حکم دیا کہ وہ یہود و نصاری کے علماء سے پوچھ لیں بلکہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے خود ان کو علماء کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے جیسا کہ فرمایا:

"ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل" جب یہود و نصاری اہل علم ہوئے تو ان پر امیین کا اطلاق درست نہیں۔ اگر امیین کا معنی اور مراد بشر اور انسان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ امیین کا اطلاق علمائے بنی اسرائیل پر بھی ہو۔ اور یہ معنی علماء کے لفظ کے مناقض اور کوسوں دور ہے۔

نیز آیات کریمہ مثلاً:

”فاسئلوا الذکر ان کنتم لا تعلمون ,ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل او رھو الذی بعث فی الامیین رسولا“

کے درمیان تعارض اور پھر اجتماع ضدین بھی لازم آئے گا۔اس لیے کہ انسان اور بشر کا اطلاق بدوں لحاظ امر آخر بنی اسرائیل کے علماء پر بھی ہے۔لہذا امیین کا اطلاق ان پر بھی ہوگا یہ اجتماع ضدین ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ امی بھی ہوں اور عالم بھی۔

مزید بشر اور انسان بدوں لحاظ علم یا جہالت لا بشرط شیء ہے امیین بشرط شیء ہے یعنی اس کا مصداق انسان من حیث الامی ، یا انسان من حیث العالم ہے یہ دونوں مرکب ہیں ، آیہ مقدسہ میں انسان جو وصف جہالت سے متصف ہیں ، لکھنا ، پڑھنا نہیں جانتے ، ان کے پاس کتاب نہیں ان کا کوئی نبی نہیں یہ مرکب ہے۔صرف بشر اور انسان قطع نظر امر آخر ہونے کے بسیط ہیں ۔اور الانسان الامی ، یا الانسان العالم مرکب ہے مرکب کا بسیط (بشر ، انسان) پر اطلاق نہیں ہوسکتا ، غرضیکہ کسی بھی لحاظ سے امیین کو صرف بشر اور انسان کہنا غلط ہے ،، (وھو المراد)

مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے محض بشر ہونے کی دلیل میں یہ حدیث نقل کی ہے :

احمد ممتاز نے فہم حدیث میں غلطی کھائی

”فقال انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ و اذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر“ (رواہ مسلم ج ۲ ،ص ۲۶۴) ،ص ۱۶)

ترجمہ : آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تابیر نخل سے اہل مدینہ کو روکا تھا تو اس سال کھجوروں کی فصل دوسرے سالوں کی بہ نسبت بہت کم ہوئی تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سامنے اس کا ذکر کیا ۔پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا اس میں شک نہیں کہ میں بشر ہوں جب میں تم کو تمہارے دین کی بات کا حکم کروں تو تم محفوظ کر لیا کرو اور جب اپنی رائے سے حکم کروں پس جز ایں نیست کہ میں

بشر ہوں

فائدہ کے عنوان میں لکھا کہ خط کشیدہ جملوں کو بار، بارغور سے پڑھیے آپ ﷺ
کس وضاحت سے اعلان فرمارہے ہیں کہ میں بشر ہوں، کیا قیامت تک کوئی آپ ﷺ کا
اس طرح ایک ارشاد بھی پیش کرسکتا ہے جس میں بشریت کا انکار ہو؟ (ص ۱۷)

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ احمد ممتاز نے حدیث مذکورہ پڑھی اور لکھ دی، مگر سمجھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، صرف انما انا بشر کا جملہ دیکھ کر پھولے نہ سمائے کہ وہ جوئے شیر لے آئے ہیں، حدیث کا معنی ومفہوم وہ نہیں جو مؤلف نے سمجھا ہے، حدیث پاک میں دو جملے قابل غور ہیں۔

(۱) **اذا امر تکم بشیء من دینکم فخذوا بہ،،**

(۲) **فاذا امر تکم بشیء من رأی فانما انا بشر،،**

(۱) ان میں کوئی لفظ یا جملہ ایسا نہیں جو یہ دلالت کرے کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں صرف انما انا بشر ہے جو قابل تسلیم اور جزو ایمان ہے۔ اس حدیث سے نصاً معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں اور لبادۂ بشریت میں دو جہات یعنی دو حیثیات کے حامل اور جامع ہیں

(۱) بشریت من حیث الرسالۃ (۲) **بشریت من حیث المجتھد، بشریت من حیث الرسالۃ** کے لحاظ سے فرمایا **اذا امر تکم بشیء من دینکم فخذوا بہ،** کیونکہ یہ قول اور فرمان من جانب الہ ہوگا اور "**ماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی**" کی تعبیر اور تفسیر ہوگا اور جب دنیاوی امور میں تمہیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دوں تو وہ میرا اجتہاد ہوگا جیسا کہ بِرائی کا لفظ بتا رہا ہے اجتہادی حکم کی تعمیل کے نتیجہ کا صحیح ہونا ضروری نہیں، لیکن مجتہد کو پھر بھی ثواب ملے گا۔ حضور ﷺ کا تابئیر نخل سے روکنے کا مقصد توکل علی اللہ کی تعلیم اور شعبہء ہائے زندگی میں اس پر کاربند رہنے کی تلقین کرنا تھی، جو آپ نے کی، لیکن کھیتیاں اگانے، پھل پھول اور ثمرات لگانے کی قدرت صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، کیا حدیث میں کوئی ایسا لفظ ہے جو یہ

دلالت کررہا ہو کہ آپ ﷺ نے وعدہ فرمایا تھا کہ پھل زیادہ ہوگا؟ یا یہ فرمایا ہو کہ تابیر نخل نہ کرنے سے پھل زیادہ ہوتا ہے۔ مؤلف نے بھی ترجمہ میں صرف روکا کا لفظ تحریر کیا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا نیز برائی کا لفظ حدیث میں اجتہاد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ حدیث معاذ بن جبل میں اجتہد برائی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پوری حدیث، مشکوۃ، ترمذی اور ابوداؤد میں ہے۔ بشریت حیث الرسالۃ کے اعتبار سے فرمایا کہ دینی احکامات بجالانے کا حکم دوں تو اس کا ماننا واجب ہے وہ من جانب اللہ ہے جو بذریعہ وحی مجھ پر القاء کیا جاتا ہے، مؤلف نے انما انا بشر کا جملہ دیکھ کر خوشی کے ترانے تو گائے مگر اسی بشر کا حامل وحی ہونا، تجلیات الٰہیہ کا مہبط ہونا نظر نہ آیا، انما انا بشر کو تو خوب اچھالا اور بار بار اس کے پڑھنے اور ملاحظہ کرنے کی دعوت دی پوچھنا چاہوں گا کہ کیا یہ وہی بشر نہیں؟ جس کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ فرمایا اور اعلان فرمایا:

یداللہ فوق ایدیھم۔۔۔ کیا یہ وہی بشر نہیں؟ جس کے عمل دست کو اللہ تعالیٰ نے اپنا عمل فرمایا

"ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی"

کیا آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک کوئی ایسا بشر ہوا یا گزرا ہے جس کے ہاتھ کو اللہ نے اپنا ہاتھ کہا ہو کیا قیامت تک ایسا کوئی انسان، یا فرد بشر ہوسکتا ہے جس کے ہاتھ کو اللہ اپنا ہاتھ فرمائے گا، تاریخ انسانیت میں ایسا کوئی ثبوت ہے یا قیامت تک ہوسکتا ہے جو اس کی گواہی دے کہ فلاں بشر کے عمل دست کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا ہے؟

ماننا پڑیگا کہ وہ ایک ہی بشر ہے جو عام لوگوں کی طرح تو نظر آتا ہے، صورت تو بشر کی سی ہے مگر باطن اور حقیقت کے لحاظ سے **"دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی"** کی بلندیوں پر براجمان اور تجلیات الٰہیہ سے سرشار اور محظوظ ہورہا ہے۔ وہ **"انما انا بشر"** کے لبادہ میں ملبوس اپنے پتلے کو رویئت باری تعالیٰ سے سینچ رہا ہے، جن کا نام نامی اسم گرامی محمد ﷺ ہے۔

مزید تابیر نخل سے روکنے کے عنوان میں ملا علی قاری نے فرمایا: "وانما ذالک شیء قلته بحسب الظن لشھودی اذذاک لی مسبب الاسباب وفی الحدیث دلالة علی انه علیه السلام ما کان یلتفت الا الی الامور الاخرویة" (مرقات)

ترجمہ: تابیر نخل سے میں نے گمان کے طور پر منع کیا ہے اس لیے کہ اس وقت میری توجہ مسبب الاسباب پر تھی، یعنی اس وقت میں قدرت باری تعالیٰ کے جلال و جمال میں مستغرق تھا۔ ملا علی قاری نے فرمایا کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی توجہ دنیاوی امور کی بجائے ہمیشہ امور آخرت پر مرکوز رہتی تھی۔

مؤلف نے کہا کہ کس وضاحت سے اعلان فرما رہے ہیں کہ میں بشر ہوں مؤلف کا مدعا کہ میں بشر ہوں اور صرف بشر ہوں پورا نہ ہوا کیونکہ انا بشر میں انا سے مراد محمد ﷺ ہیں، جملہ یوں ہوگا" محمدؐ بشرؐ میں محمد بشر ہوں (ﷺ) محمد بشر میں محمد مسند الیہ / محکوم علیہ ہے، اور بشر محکوم، اور مسند ہے، گویا بشر کو ثابت کیا جا رہا ہے محکوم علیہ، مسند الیہ کیلئے، اور ان کے درمیان اسناد، اور نسبت موجود ہے اس بشریت کی نسبت جب ذات محمد ﷺ کی طرف ہوگی تو اس کا لحاظ بحیثیت رسالت ہوگا کیونکہ محمد ﷺ رسول ہیں۔

اب یہ بشریت بشرط شیء کے درجہ میں ہے۔ جیسے حیوان کا تصور جب بحیثیت ناطق ہوگا تو اس کا اطلاق فقط انسان پر ہوگا فقط حیوان پر نہیں جب ناطق پر ہوگا تو اس کا اطلاق فقط انسان کو شامل ہے۔ اسی طرح جب انما انا بشر میں بشریت من حیث الرسالة با ذات محمد ﷺ ملحوظ ہوئی تو اس کا اطلاق صرف بشر یعنی بشر من حیث البشر پر نہ ہوگا کیونکہ یہ ماہیت اور لا بشرط شیء ہے اس کا اطلاق تمام افراد بشر پر ہوتا ہے پھر یہ مفہوم کُلّی ہے اور بشریت من حیث ذات محمد ﷺ جزی حقیقی اور فرد شخصی ہے یہ کلی پر اطلاق نہیں ہوسکتا اور نہ کلی اس پر اطلاق ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے آپ کی عام بشریت پر استدلال کرنا غلط ہے۔

مفہوم حدیث میں کوتاہ فہمی

احمد ممتاز نے رسول اللہ ﷺ کی بشریت پر یہ حدیث بھی نقل کی ہے

جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں :

"کان رسول اللہ ﷺ یخصف نعله و یحیط ثوبه و یعمل فی بیته کما یعمل احدکم فی بیته و قالت کان بشرا من البشر، یغلی ثوبه و یحلب و یحدم نفسه

(رواہ ترمذی مشکوۃ شریف ۵۱)

ترجمہ : حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنا جوتا سیّا کرتے تھے، اپنا کپڑا سیّا کرتے تھے، اور اپنے گھر میں اسی طرح کام کیا کرتے تھے جس طرح تم کام کرتے ہو۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ ﷺ بشر میں سے ایک بشر تھے، بکری خود دوہتے تھے اور اپنے وجود کی خدمت کیا کرتے تھے۔

فائدہ کے تحت لکھا ہے کوئی بہادر شیعوں کا بھائی جو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بشریت رسول اکرم ﷺ کی وجہ سے گستاخ رسول کہہ کر خارج کر کے وہابیوں کی فہرست میں داخل کرتے ہوئے وہابیہ کہے، ص ۱۷)

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ حدیث کفار کے عقیدے کی تردید میں ارشاد فرمائی کہ نبی بادشاہوں کی طرح اپنی زندگی بسر نہیں کرتے ہیں کہ جس طرح بادشاہ نجی اور گھریلو زندگی میں عوام الناس کے کاموں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

افعال عادیہ کے ارتکاب سے بچتے اور دور رہتے ہیں، لیکن یہ عجیب رسول ہیں جو کھاتے پیتے ، بازاروں میں چلتے پھرتے اور گھریلو کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دیتے ہیں ان کے اس نظریہ اور عقیدہ کی تردید فرماتے ہوئے بتایا کہ نبی اکرم ﷺ اللہ کی مخلوق ہیں اللہ نے نبوت اور رسالت

کا منصب عطا فرما کر ساری مخلوق پر فوقیت اور فضیلت سے نوازا ہے اس کے باوجود آپ عوامی اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ نچلے اور کمزور طبقے کے لوگوں سے میل ملاپ رکھتے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ''**انما انا بشر مثلکم**'' نجی معاملات اور گھریلو زندگی میں، میں تمہاری طرح انسان ہوں، (**ھکذا فی المرقاۃ**)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ محض ایک انسان ہیں ورنہ اتنے کاموں کی تفصیل بتانے کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ایک عام بشر کیسے کہہ سکتی ہیں؟ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جسم رسول ﷺ سے نور کے پھوارے پھوٹے دیکھے اور ان فواروں کی چمک سے گم شدہ سوئی کو پالیا تھا۔

امام جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

''**اخرج ابن عساکر عن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قالت کنت اخیط فی السحر فسقطت منی الابرۃ فطلبتھا فلم اقدر علیھا فدخل رسول اللہ ﷺ فتبینت الابرۃ بشعاع نور وجھہ۔**(الخصائص الکبری، جلد ا ص ۶۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا

''کنت ادخل الخیط فی الابرۃ حال الظلمۃ لبیاض رسول اللہ ﷺ رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر کی چمک میں اندھیرے میں سوئی میں دھاگہ ڈالا کرتی تھی، (شرح شفاء شریف، ج ا، ص، ۱۵۹)

ترجمہ: کہ ابن عساکر نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کی تخریج کی ہے کہ میں سحر کے وقت کپڑا سی رہی تھی کہ سوئی میرے ہاتھ سے گر گئی، میں نے اسے تلاش کیا مگر نہ مل سکی اس کے بعد رسول اللہ ﷺ داخل حجرہ ہوئے آپ کے چہرہ کے نور کی شعاع سے وہ سوئی چمک آٹھی اور میں نے اٹھالی، شائد شیخ سعدی نے اسی موقعہ کے لیے فرمایا ہوگا:

''**کشف الدجی بجمالہ: حسنت جمیع خصالہ : صلو اعلیہ و آلہ**''

یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"لما مات النجاشی کنا نتحدث انہ لا یزال یری علی قبرہ نور"

(ابو دائود، مشکوۃ ص ۵۴۵)

یہ بات اتفاقیہ نہیں بلکہ تواتر سے ثابت ہے کہ حبشہ میں شاہِ حبشہ نجاشی کی قبر پر نور کی برسات ہوتی رہی ہے نجاشی فرشتہ، پیغمبر یا رسول نہیں رسول اللہ ﷺ کا عاشق اور غلام تھا اس نے فقط سورۂ مریم کی آیات حضرت جعفر کی زبانی سنیں اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اگر قرآن اور ایمان موجب نور ہیں تو وہ ذات جو صاحب قرآن، مفسر قرآن، معلم قرآن اور جان ایمان ہو وہ زید، عمرو، بکر کی طرح عام طرح کا بشر اور انسان ہے؟

جواب: ۲ مزید حدیث عائشہ از قسم آحاد ہے جبکہ اس کے مقابل نصوص قرآنیہ اور احادیث مبارکہ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو ذات رسول کی نورانیت کو ثابت کرتی ہیں (مسئلہ نور میں انشاء اللہ ذکر کی جائیں گی) ان کے مقابل قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مرجوح ہے۔

مؤلف نے لکھا کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مسئلہ ہی حل کر دیا کہ آپ ﷺ کو بشر کہنا آپ ﷺ کی تعظیم ہے اور بشریت کو حقارت کی نظر سے دیکھنا توہین ہے۔ راہ حق کے طالب کے لیے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہی ایک ارشاد کافی ہے:

جواب: ۳ توضیحاً کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کان بشرا من البشر کیوں فرمایا اس کا پس منظر عرض کیا جا چکا ہے مزید تسلی اور فکر کے لیے فرمان عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا شان ورود ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو ملا علی قاری نے فرمایا:

"تمہید لما بعدہ لانہ لما رأت من اعتقاد الکفار ان النبی ﷺ لا یلیق بمنصبہ ان یفعل مایفعل غیرہ من الناس و جعلوہ کالملوک فانہم یترفعون عن الافعال العاریۃ الدنیۃ

تکبیرا، کماحکی اللہ تعالی عنهم فی قوله مالهذاالرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق فقالت انه ﷺ کان خلقامن خلق اللہ تعالی وواحدمن اولاد آدم شرفه اللہ بالنبوة وکرمه بالرسالة وکان یعیش مع الخلق بالخلق ومع الحق بالصدق فیفعل مثل مافعلواویعینهم فی افعالهم تواضعاوارشادالهم الی التواضع ورفع الترفع وتبلیغ الرسالةمن الحق الی الخلق کماامر قال تعالی قل انماانابشرمثلکم یوحی الی ”(مرقات ج ۱۱ ص۹۴)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان کہ کان بشرا من البشر تمہید ہے ان امور کی جو آپ ﷺ کیا کرتے تھے اس لیے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دیکھا کہ کفار نے آپ ﷺ کو بادشاہوں کی طرح سمجھ رکھا ہے جسطرح بادشاہ دنیاوی امور کے بجالانے میں بربنائے تکبر اپنے آپ کو ارفع اور بلند سمجھتے ہیں اسی طرح منصب نبوت بھی ایک بلند پایہ ہے اس منصب کے حامل شخص کے لیے وہ کام کرنے جو عوام کرتے ہیں شایان شان نہیں تو اس کے رد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا دیگر مخلوق کی طرح وہ بھی ایک مخلوق ہیں باقی اولاد آدم کی طرح وہ بھی ولد آدم ہیں جنہیں منصب رسالت اور شان نبوت سے شرف اور تکریم عطا فرمائی ہے۔ وہ مخلوق کے ساتھ حسن خلق سے پیش آتے، اور حق کا ساتھ دیتے ہوئے سچ بولتے ہیں وہ عام لوگوں جیسے افعال سرانجام دیتے، وہ تواضع اور انکساری کے ساتھ لوگوں کی عملی مدد اور راہنمائی فرماتے ہیں وہ غرور اور تکبر سے مبراء ہیں۔ وہ پیغام حق اسی طرح مخلوق تک پہنچاتے ہیں جس طرح اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ کہہ دیں کہ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں۔ ملا علی قاری کی اس توضیح سے ثابت ہوا کہ:

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا کان بشرا من البشر کہنا۔ عنوان اور تمہید کے طور پر ہے۔

۲۔ اس عنوان کے تحت وہ امور گنوائے جو آپ ایک عام آدمی کیطرح کیا کرتے تھے۔

۳۔کان بشرا من البشر کا مقصد بادشاہوں جیسے تکبر وغرور اور مافوق الفطرت ہونیکی نفی ہے۔

۴۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ ﷺ متواضع اور منکسر المزاج تھے۔

۵۔نجی معاملات اور گھریلو زندگی میں کام کاج کے حوالے سے ایک عام آدمی کی طرح تھے۔

٦۔نبی اور رسول ہونے کے باوجود معاشرتی اور معاشی زندگی سادہ لوح انسان کی طرح بسر کرتے تھے،لوگوں سے حُسن خلق اور انکساری سے پیش آتے تھے،انہی خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ عوام الناس سے کہہ دیں کہ بشری کاروبار حیات میں، میں بھی تمہارے ہی جیسا ہوں۔

۷۔اگر حضرت عائشہ رسول اللہ ﷺ کی نورانیت یا بشریت کے حوالے سے کہتیں تو اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ کان بشرًا۔کان بشراً من البشر کا قول عقیدہء کفار کی تردید کیلئے ہے اس لئے اس قول سے رسول اللہ ﷺ کی بشریت محضہ کو ثابت کرنا غلط ہے''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قول سے غلط فہمی

مولف نے اجماع صحابہ کے عنوان کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی انہی کا قول نقل کیا جو اسطرح سے ہے کہ ''کنتُ اکتب کل شیء اسمعہ من رسول اللہ ﷺ ارید حفظہ فنھانی قریش فقالوا اتکتب کل شیء ورسول اللہ ﷺ بشر یتکلم فی الغضب و الرضی فامسکت عن الکتاب فذکرت ذالک لرسول اللہ ﷺ فاوماء یا صبعہ الٰی فیہ فقال اکتب فوالذی نفسی بیدہ مایخرجُ منہ الا حق۔ابو داؤد (کتابچہ ص ١٨)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں جو بھی چیز حضور اکرم ﷺ سے سنتا تھا اسکو حفاظت کے ارادے سے لکھ لیتا تھا تو قریش نے مجھے منع کیا

اور کہا کہ حضور صلی اللہ ﷺ ایک انسان ہیں کبھی غصہ کی حالت میں کلام فرماتے ہیں اور کبھی رضاء کی حالت میں، میں لکھنے سے رُک گیا پھر میں نے یہ بات حضور اکرم ﷺ کے سامنے ذکر کی تو حضور ﷺ نے اپنی انگلی سے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لکھیں قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس مُنہ سے حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی، اس حدیث سے مولف نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ کے بشر ہونے پر صحابہء کا اجماع ہے، غلط ہے'' حدیث کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے، الفاظ حدیث نمایاں ہیں۔ قریش نے کہا اور رسول اللہ ﷺ بشر پھر بشر کی صفات کا ذکر کیا: ''یتکلم فی الغضب و الرضاء '' غصہ، رضاء، انسانی صفات میں سے ہیں۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو بشر کہا اور پھر ان کی بشری صفات کا بھی ذکر کیا۔ عبداللہ بن عمرو ابن العاص نے قریش کا آپ ﷺ کو بشر کہنا آپ کے غصہ، رجاء وغیرہ کا پورا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کر دیا اس کے باوجود قسم کھا کر فرمایا اور اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اس منہ سے حق ہی نکلتا ہے، غضب کی حالت میں بھی جس کے منہ سے ہمیشہ سچ نکلے وہ منہ عام لوگوں جیسا نہیں ہوسکتا، جب منہ عام لوگوں جیسا نہ ہو تو دل و دماغ بھی عام لوگوں جیسے نہ ہوں گے، کیونکہ بات اور سوچ وفکر کا مرکز دل ودماغ ہیں جس کا دل و دماغ عام لوگوں جیسا نہ ہو اس کا باقی جسم عام لوگوں جیسا کب ہو گا یہ منہ مبارک وہ ہے جس کی تعریف، اور جس کی انفرادیت ''ماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یو حی'' سے بیان کی گئی، اور قلب اطہر کو ''ما کذب الفو ادماری'' سے امتیاز بخشا گیا ہے۔ رہا باقی جسم تو طہارت، نفاست، نظافت اور پاکدامنی کی اس تصویر کے تمام لمحات زندگی کی اللہ نے قسم کھائی ہے، جیسا کہ فرمایا:

''لعمرک انھم لفی سکرتھم یعمھون'' یہ وہی بشر ہے جس نے خود فرمایا کہ میری آنکھیں تو سو جاتی ہیں مگر میرا دل جاگ رہا ہوتا ہے' جب دل جاگ رہا ہے تو جسم سوئے ہوئے بھی

جاگ رہا ہے تو گویا آپ ﷺ نے "مایخرج منہ الا حق" فرما کر اپنی بشریت کو دوسروں کی بشریت سے ممتاز فرمایا۔۔۔۔۔۔ بلکہ واضح فرمایا کہ میری حقیقت اور میرا باطن عام لوگوں جیسا نہیں عام لوگ غیظ وغضب میں مدہوش ہو کر بد کلامی اور بے ہودگی کرتے ہیں، مگر میرے غصہ میں آنے کے باوجود بھی میرے منہ سے حق اور سچ کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔۔۔۔

میرے سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔۔۔ جبکہ دیگر مومنین کیلئے نیند ناقض وضوء ہے،

:۲ قریش کا یہ کہنا کہ وہ بشر ہین۔ اجماع نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کا دائرہ فقط ،قریش کے گرد ہی نہیں گھومتا بلکہ صحرائے عرب میں بسنے والے، دوسرے خاندانوں کے لوگ بھی شرف صحابیت سے مالا مال ہیں، کیا انصار مدینہ صرف قریش ہی تھے، قریش تو مہاجر ہو کر آئے تھے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد اسمعیل و اصطفی قریشا من کنانۃ و اصطفی من قریش بنی ھاشم و اصطفانی من بنی ھاشم" (رواہ مسلم، مشکوۃ)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے بنی کنانہ کو فضیلت دی، اور بنی کنانہ سے قریش کو، اور قریش سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم سے اللہ تعالیٰ نے مجھے افضل بنایا۔ معلوم ہوا رسول اللہ ﷺ کا خاندان بنی ہاشم ہے، جو لوگ اس خاندان سے آپ ﷺ پر ایمان لائے وہ ہاشمی ہوئے مثال کے طور پر جعفر بن ابی طالب، حضرت حمزہ، حضرت عباس، حضرت عبد اللہ بن عباس، اسی طرح دیگر جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً ابی بن کعب، ثابت بن قیس بن شماس، تمیم الداری، اقرع بن حابس، انس بن مالک، ثابت بن ضحاک، جابر بن سمرہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قریشی نہیں دوسرے قبائل سے ہیں جب دیگر قبائل کے جلیل القدر صحابہء کرام قریشی نہیں تو مؤلف کا اجماع صحابہ کہنا کیسے درست ہے؟

اور اگر قالوا کے صیغہء جمع کو مد نظر رکھ کر اجماع کہا تو بھی غلط ہے کیونکہ جمع کم از کم دو یا تین سے

شروع ہوتی ہے، مزید یہ کہ صحابہء کرام کا عقیدہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ عام انسانوں جیسے بشر نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا : **کان رسول اللہ ﷺ امرھم من الاعمال بما یطیقون قالوا انا لسنا کھیأتک یا رسول اللہ ﷺ** "(بخاری ج ۱، ۷)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ان اعمال کا ارشاد فرماتے ہیں جن کی لوگ طاقت رکھتے ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم آپ کی مثل نہیں ہیں۔ بقول مؤلف صحابہ کرام بشر اور نبی اکرم ﷺ بھی بشر ہیں صحابہ حضور ﷺ کے مماثل نہیں اور حضور ﷺ صحابہ کے نہیں کیوں؟

طحطاوی کی عبارت سے دھوکہ دہی

مؤلف نے فقہہ حنفی سے طحطاوی علی مراقی الفلاح (ص ٦٧٥) سے عبارت ذیل نقل کی:

"ویشترط لصحۃ الایمان بہ ﷺ معرفۃ اسمہ، اذلا تتم المعرفۃ الا بہ وکونہ بشرا من العرب" (ص ۱۹)

اور استدلال کیا کہ صحت ایمان کیلئے آپ کو بشر ماننا ضروری ہے،،

توضیحاً کہا جائے گا کہ امام طحطاوی کا یہ فرمان درست ہے کیونکہ تکمیل ایمان کے لیے مومن بہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے نام ولدیت جائے پیدائش، بشریت اور عربی النسل وغیرہ امور کا علم ہونا ضروری ہے یہی ایمان کی تفصیلات میں سے ہیں، اہل سنت و جماعت اور تمام حنفی اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ بشر ہیں انسان ہیں لیکن اس معنی اور اس حیثیت میں بشر نہیں مانتے جس میں شیطان نے آدم علیہ السلام کو اور قوم نوح علیہ السلام نے نوح کو اور ان کے بعد آنے والے کافروں نے اپنے، اپنے زمانے کے نبی اور دور رسالت مآب کے کافروں نے آپ ﷺ کو بشر کہا اور مانا ہے، اور نہ ہی اس طرح کا بشر مانتے ہیں۔ جس طرح احمد ممتاز نے بار بار تحریر کیا اور تعارف کرایا ہے، اور ان کے اسلاف پیش کرتے رہے ہیں، فقہ حنفی کے

ماننے والے آپ ﷺ کو اشرف الناس اکرم الخلق بشر مانتے ہیں، جیسا کہ آپ نے خود ارشاد فرمایا:

"انا اکرم الاولین و الاخرین علی اللہ و لا فخر" (ترمذی) ما من بنی آدم فمن سواہ یومئذ الا تحت لوائی (ترمذی، ابن ماجہ ص ۱۹، ۲۰)

کتب اہل سنت سے دھوکہ دہی

مؤلف نے تصریحات علماء کے عنوان کے تحت شفاء شریف، مطالع المسرات، بہار شریعت، جاء الحق سے، بشریت ورسالت پر کتب اہل سنت و جماعت سے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان سب کو یہاں نقل کرنا ضروری نہیں البتہ شفاء شریف اور مطالع المسرات کی عبارات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

فمحمد ﷺ و سائر الانبیاء و الرسل من البشر'

'(شفاء شریف قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۶۵)

ترجمہ : حضرت محمد ﷺ اور بقیہ تمام انبیاء اور رسل علیہم السلام بشروں ہی میں سے تھے، (کوئی بھی نوری اور ناری نہ تھا)

یہی قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فظواھرھم و اجسادھم و بنیتھم متصفة باوصاف البشر طاری علیھم مایطرء علی البشر من الاعراض و الاسقام، و الموت و الفناء و نعوت الانسانیة، و ارواحھم و بواطنھم متصفه یاعلی من اوصاف الملائکة" پھر فرمایا: وجعلوا من جهة الاجسام و الظواھر مع البشر و من جهة الارواح و البواطن مع الملائکة" (شفاء ج دوم)

ترجمہ: انبیاء کرام اپنی ظاہری شکل وصورت، اجسام، اعضاء کے لحاظ سے بشری اوصاف سے

متصف ہوتے ہیں، دیگر انسانوں کی طرح ان پر فناء، موت، بیماریاں، اور دیگر انسانی صفات اور عوارضات طاری ہوتے ہیں، لیکن ان کی ارواح، اور ان کے باطن یعنی حقیقت ایسی صفات سے متصف ہوتے ہیں جو فرشتوں کی صفات سے ارفع اور اعلی ہوتی ہیں۔ ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ان کا تعلق انسانوں سے ہے یعنی وہ بشر اور انسان ہیں، روحوں، اور باطن (حقیقت) کے لحاظ سے وہ فرشتوں کے ساتھ ہیں یعنی نوری ہیں۔

روح المعانی اور حاشیہ بیضاوی میں بشریت انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے،

"والمناسبة شرط فی قبول الفیض علی ماجرت العادة الالهیة فلابد من متوسط ذاجهتی التجرد والتعلق لیستفیض من جهة ویفیض باخری"

ترجمہ: فیض لینے اور دینے کے لیے ان کے درمیان مناسبت کا پایا جانا ایک بنیادی شرط ہے۔

اور قانون قدرت بھی یہی ہے لہذا اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ سے فیض بذریعہ وحی لینے، اور مخلوق خدا کو وہی فیض پہنچانے کے لیے ایک ایسے واسطے کی ضرورت تھی جو تجرد یعنی نورانیت کا حامل بھی ہو اور تعلق یعنی صفت بشری سے بھی متصف ہو تا کہ جہت تجرد یعنی صفت نورانیت رکھنے کی وجہ سے فیض حاصل کرے، اور صفت تعلق یعنی بحیثیت بشر انسانوں کو فیض دے۔

اگر مؤلف کی بات کو ہی تسلیم کیا جائے کہ انبیاء کرام وہ صرف بشر ہی ہیں وہ ارواح اور باطن کے لحاظ سے بھی بشر ہی ہیں تو فرشتہ وحی جو نور محض ہے سے فیض الہی کیسے حاصل کر پائے گا۔ اسی لیے صاحب روح المعانی اور قاضی عیاض نے تصریح کر دی کہ انبیائے کرام صرف بشر نہیں ہوتے، ظاہری طور پر بشر ہیں حقیقت اور باطنی لحاظ سے وہ نوری ہیں۔ اور نوری مخلوق جیسے فرشتے اوصاف اور کمالات میں ان سے بھی کہیں ارفع و اعلی ہیں۔ بالخصوص نبی کریم ﷺ جس طرح بشری مخلوق میں افضل اور اعلی ہیں اسی طرح نوری مخلوق میں بھی کوئی آپ کا ہم پایہ نہیں

، جبریل علیہ السلام کا سدرۃ المنتہیٰ پر رک جانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنا فتدلی کی رفعتوں کو سمیٹنا اس کی واضح مثال ہے۔

مطالع المسرات کی عبارت "**من قال انه لم یکن بشرا آدمیا فکل ذالک نص العلماء علی کفر قائله و مدعلیه**" (ص ۱۹)

یہ عبات ہمارے یعنی اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کے مخالف نہیں کیونکہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے، یا زبان سے کہتا پھرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر یا آدمی نہیں تھے وہ کافر ہے، اس نے نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کا انکار کیا اور ان کی مخالفت کی ہے، نصوص قطعیہ کا منکر کافر نہیں تو اور کیا ہے؟

بحمد اللہ اہل سنت وجماعت ایسا عقیدہ رکھتے ہیں نہ کہتے ہیں۔

مولف نے پرانا راگ الاپا

احمد ممتاز نے لمحہ فکریہ ۔۔۔۔ (ص ۲۰) پر عنوان قائم کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسان اور بشر ہیں (۲) ذوی العقول کے لحاظ سے مخلوق کی دو قسمیں ہیں، (۳) سب سے افضل خاکی اور بشر ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اشرف الکائنات، سرور کائنات، افضل الکائنات بشر ہی کی جنس میں سے ہو سکتے ہیں، اور کسی جنس سے نہیں ہو سکتے۔ (۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب نامہ صحیح روایات کے مطابق اکیس پشتوں تک انسانوں اور بشروں میں ثابت ہے آگے تحریر کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان اور بشر ہیں، پھر لکھا کہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں اور بشروں میں سے ہونے پر فخر فرمایا۔

پھر اس پر ایک حدیث بھی پیش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من وُلد اسماعیل، و اصطفیٰ قُریشاً من بنی کنانۃ و اصطفیٰ من قریش بنی ھاشم**

واصطفانی من بنی ھاشم، رواہ مسلم مشکوٰۃ شریف“(کتابچہ ص ۲۲)

توضیحاً کہا جائے گا کہ مولف نے لمحہ فکریہ کے مندرجات میں کوئی نئی یا علمی بات تحریر نہیں کی بلکہ یہی تحریر کیا ہے وہ انسان اور بشر تھے۔ بشروں اور انسانوں میں سے ہونے پر آپ ﷺ نے فخر فرمایا ہے، مذکورہ بالا حدیث کا ترجمہ کرنا ضروری محسوس کرتا ہوں تا کہ مولف کا غلط نظریہ اور فاسد عقیدہ کھل کر سامنے آئے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا۔ اولاد اسماعیل علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے بنی کنانہ کو چُنا، اور اولاد کنانہ سے قریش کو چُنا، اور اولاد قُریش سے بنی ہاشم کو چنا، اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔ یعنی اولاد اسماعیل میں بنی کنانہ افضل، اور بنی کنانہ سے قریش افضل، اور قریش سے بنی ہاشم افضل، اور بنو ہاشم میں، میری ذات سب سے افضل ہے“ یعنی پوری اولاد اسماعیل جو عرب اور عربی النسل ہیں ان سب سے افضل میں ہوں اولاد اسماعیل کا کوئی فرد مجھ جیسا نہیں، یہ حدیث آپ کی بے مثل بشریت کی دلیل ہے؟ یا اس بات کی دلیل ہے کہ میرے لئے فخر کا باعث یہ خاندان ہیں اس کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ میری فضیلت ان خاندانوں کی وجہ سے ہے۔ کیا افضل مفضول پر فخر کرتا ہے؟

احمد ممتاز نے بھی کتابچہ کے ص ۸، سطر ۱۰، میں لکھا ہے کہ میں ذاتی صفات کے اعتبار سے بھی ان سب سے بہتر ہوں۔ ان ذاتی صفات کی تفصیل ملا علی قاری کے حوالے سے پہلے نقل ہو چکی ہیں۔ یہ خاندان رسول اللہ ﷺ کے لیے ہر گز باعث فخر نہیں بلکہ ان میں ذات رسول ﷺ کی بعثت اور آپ پر قرآن حکیم کا نازل ہونا ان عربوں اور ان خاندانوں کے لیے باعث افتخار ہے جیسا کہ

’لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا منھم“

کی تفسیر میں امام رازی کا قول پہلے گزر چکا ہے،

مؤلف کتابچہ کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان اور بشر ہیں۔ غلط ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما کی حدیث جو مؤلف نے کتابچہ کے ص ۷، پر نقل کی ہے اس کے آخری الفاظ یہ ہیں:

”فانا خیر ھم نفسا و خیر ھم بیتا“

ترجمہ: میں اپنی ذات اور صفات کے لحاظ کے علاوہ خاندان اور نسب کے اعتبار سے بھی سب سے افضل اور بہتر ہوں، جب ذات وصفات کے اعتبار سے بھی سب سے افضل اور بہتر ہیں تو بشروں میں بشر یعنی ایک عام انسان کیسے ہوئے؟ آپ کی بشریت اور دیگر انسانوں کی بشریت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ذرے اور آفتاب، قطرہ اور سمندر کے درمیان پائی جاتی ہے۔

طین آدم علیہ السلام نورانیت سے افضل ہے

مؤلف نے لمحہ فکریہ کی تفصیل کے آغاز میں لکھا کہ ذوی العقول مخلوق کی تین قسمیں ہیں۔ نوری، ناری اور خاکی، اور سب سے افضل اور اشرف خاکی اور بشر ہے، مولف کے ذہن میں لفظ خاکی کا خمار ہے اس لئے وجہ افضلیت بتانے سے قاصر رہے یہ بھی نہ بتا سکے کہ یہ تین قسم مخلوق مادہ اور ماہیت کے اعتبار سے ہے یا افراد ہونے کی بناء پر، واضح رہے کہ یہ تقسیم مادہ اور ماہیت کے اعتبار سے ہے ذوی العقول ہونے کی بناء پر نہیں جیسا کہ مشکوۃ کے باب بدء الخلق سے ظاہر اور عیاں ہے،

”خلقت الملائکۃ من نور، و خلق الجان من مارج من نار،

و خلق آدم مما وصف لکم“ (رواہ مسلم)

اس پر قرینہ لفظی موجود ہے۔ نور، نار، تراب مادہ اور ماہیت من حیث ہی ہے۔ ملائکہ، شیطان

اور آدم اس کے افراد مخصوصہ ہیں، یعنی افراد شخصیہ ہیں، آدم علیہ السلام ایک عَلَم شخصی ہے، جزی حقیقی ہے اس کا اطلاق صرف ذات آدم پر ہوسکتا ہے۔ حضرت آدم کو اللہ تعالی نے نوری اور ناری مخلوق پر فضیلت بخشی کس وجہ اور کس بناء پر؟ ان کو اللہ تعالی نے علوم وفنون کا منبع بنایا، تاج خلافت سر پر رکھا، اور شان نبوّت عطا کی، ان اوصاف اور فضائل کی وجہ سے اعتراف حقیقت، اظہار عظمت اور اقرار شرف کے طور پر آدم علیہ السلام کے سامنے ملائکہ کو سرنگوں کیا، آدم علیہ السلام اپنے مادی وجود کی وجہ سے بھی ملائکہ سے افضل ہیں، علوم وفنون کی برسات کا ہونا تو بعد کی بات ہے۔ جیسا کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے فرمایا:

"وقد تقرر عند الاکابر من الصوفیہ ان ضوء الشمس کما یتحملها الارض لکثافتها دون غیرها من عناصر التراب، اما غیرها من العناصر فلنوع الکثافۃ التی فیها فیحمل التجلیات الصفاتیۃ دون الذاتیۃ واما لطائف عالم الامر فلا نصیب لها الا من التجلیات الظلیۃ، والانسان لما کان مرکبا من الطائف العنصریۃ التی هی اجزاء العالم الکبیر ولم یجمع فی شیء من افرادها الا بعضها کان هو اهل للخلافۃ" (مظهری جلد اول)

ترجمہ: اکابر صوفیاء کے نزدیک یہ امر مسلمہ ہے کہ سورج کی تپش کو صرف زمین ہی برداشت کرسکتی ہے کائنات کی اور کوئی چیز برداشت نہیں کرسکتی، کیونکہ زمین حد درجہ کثیف ہے، اسی طرح اللہ کی ذاتی تجلی کو مٹی کے عنصر کے علاوہ اور کوئی برداشت نہیں کرسکتا، زمین کے علاوہ باقی جو عناصر ہیں ان میں قدرے کثافت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ تجلی صفاتی کے متحمل ہیں تجلی ذاتی کے متحمل نہیں، جہاں تک عالم امر کے لطائف یعنی نوری مخلوق کا تعلق ہے یہ صرف ظلی تجلی کے متحمل ہیں، اور انسان جو ان عناصر اربعہ کا مرکب ہے، اور وہ عناصر عالم کبیر کے اجزائے ترکیبیہ ہیں، اور پھر یہ اجزاء پوری طرح عالم کبیر کے کسی فرد میں نہیں پائے جاتے صرف انسان

میں ہی پائے جاتے ہیں اسی لیے انسان (آدم علیہ السلام) کو منصب خلافت عطا کیا گیا۔

یہ ہے وہ وجہ جس کی بناء پر آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

"انی خالق بشرا من طین" یہی باعث تھا جس کی بدولت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر عظمت ملی کہ آدم "بشرا من طین" ہونے کے باعث تجلی ذاتی کے متحمل ٹھہرے اور فرشتے تجلی ظلی کے متحمل ہیں۔ تجلی ظلی کے حامل افراد سے تجلی ذاتی کا حامل فرد افضل اور اشرف ہے۔

اور اسی وجہ سے مسجود (ملائکہ) منبع علوم وفنون، اور منصب خلافت کے اہل اور حقدار بھی قرار پائے، رہے باقی انبیائے کرام انہیں منصب نبوت کی وجہ سے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رقمطراز ہیں:

"وبالنبوۃ تفضلت الانبیاء علی الملائکۃ وبھا لیس خلعۃ الخلافۃ" (مظہری)

ترجمہ: نبوت کی وجہ سے انبیاء کرام کو فرشتوں پر فضیلت بخشی گئی، اور خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا گیا۔ مؤلف کا یہ کہنا کہ انبیاء بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اشرف الکائنات کی جنس میں سے ہونے کی وجہ سے افضل ہیں غلط ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ آدم علیہ السلام محض انسان ہونے کی وجہ سے نوری اور ناری مخلوق سے افضل ہیں، افضلیت کی وجوہات وہی ہیں جو ابھی ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

مولف کی ایک اور لن ترانی

مؤلف نے لکھا کہ اشرف الکائنات، سرور کائنات افضل الکائنات بشر ہی کی جنس سے ہو سکتے

ہیں۔

توضیحاً کہا جاتا ہے اگر بشر ہی کی جنس سے ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ آپ کی کوئی حقیقت یا وجود نہیں تو ان احادیث کا کیا جواب ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

"قالو ایارسول اللہ متی وجبت لک النبوۃ قال و آدم بین الروح و الجسد" (رواہ الترمذی)

"کنت اول النبیین فی الخلق و اخرھم فی البعث"

(تاریخ بخاری، مسند امام احمد، حاکم، ابو نعیم بحوالہ مرقات ص ۵۸)

نبی کیلئے بشر، اور مرد ہونا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے **وما ارسلنا من قبلک الا رجالاً۔ الآیہ۔** اسوقت نبوت تھی مگر بشریت نہ تھی، ہم اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کے سر میں ذرا دماغ اور دماغ میں ذرہ برابر شعور ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانوں میں سے انسان اور بشروں میں سے بشر یعنی عام قسم کے انسان اور بشر تھے" اور وہ افضل اس لئے ہیں کہ اولاد آدم ہیں۔

بشریت اور نورانیت کے مجموعے کا نام نبوت ورسالت ہے

مولف کی الزام تراشی

مولف نے لطیفہ ص ۲۲ کے تحت تحریر کیا کہ اسلام سے قبل مشرکین کا نظریہ اور آج کے عاشق کے نظریہ میں صرف تقدم اور تاخر کا فرق ہے، مشرک بشر کو مقدم اور رسول کو موخر کر کے کہا کرتے تھے کہ بشر رسول نہیں ہو سکتا ہے اور آج کا نام نہاد عاشق رسول کو مقدم اور بشر کو موخر رکھ کر کہتا ہے کہ رسول بشر نہیں ہو سکتا، دونوں کے قول میں صرف تقدم و تاخر کا فرق

ہے، حقیقت اور حاصل دونوں کا ایک کہ بشریت اور رسالت کا تضاد ہے۔

مولف نے تقدم وتاخر کا ہیر پھیر کر کے نام نہاد عاشقوں کو مشرک کہا ہے، یہ کذب بیانی اور الزام تراشی ہے، اہل سُنت و جماعت کا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ رسول تو ہیں مگر بشر نہیں ہیں، اہل سُنت و جماعت کے علماء کی تصریحات کتابچہ کے ص ۱۹، ۲۰ پر نقل کرنے کے باوجود یہ الزام تراشی کرنا کہ نام نہاد عاشق رسول اللہ ﷺ کو بشر نہیں مانتے غلط اور بے بنیاد ہے، جاہل سے جاہل بھی ایسا عقیدہ اور نظریہ نہیں رکھتا۔ (وَ لِلّٰہِ الْحَمْد)

واضح رہے کہ بنی اور رسول کیلئے بشر ہونا اور نورانیت کے بلند مرتبہ پر فائز ہونا ضروری ہے، یہ دونوں امور نبوت اور رسالت کی ماہیت کے لوازمات ہیں، متکلمین اور محدثین نے نبی کی تعریف میں فرمایا ہے: ''ھو انسان بعثه اللہ تعالیٰ الی الخلق لتبلیغ الاحکام'' وہ انسان نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف بھیجے، تاکہ وہ احکامات خداوندی لوگوں تک پہنچائے، یہ احکامات اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے نازل فرماتا ہے، وحی سے احکامات لینے وحی کو دیکھنے اس سے ہم کلام ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ نوری ہو اور اس کی نورانیت وحی کی نورانیت سے اعلیٰ ہو تاکہ بغیر کسی خوف وتردد حکم الٰہی اخذ کر سکے، مکالمہ کر سکے، باقی مخلوق سے امتیاز کر سکے، اس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کا عزرائیل علیہ السلام کی آنکھ کا پھوڑ دینا ہے اور بشر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اس نے انسانی خول اور انسانی تقاضوں میں رہ کر اعتقاد اور عمل کے ذریعے انسانوں کو تعلیم دینا ہے، قاضی عیاض مالکی شفاء اور حاشیہ بیضاوی علامہ عبدالحکیم سے عبارات اس مضمون پر پہلے نقل ہو چکی ہیں، صرف بشر، بشر کہنے اور ماننے سے ایمان بالرسالتہ مکمل نہیں ہوتا،، فافہم،، انبیائے کرام اپنی ماہیت میں نور ہیں، روز میثاق جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے عہد لیا تو انبیاء کرام اس وقت بھی نوری وجود میں تھے،

''رای الانبیاء فیھم مثل السرج علیھم النور'' مشکوۃ، ۲۴)

آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں انبیاء کو نور کے چراغوں کی صورت میں دیکھا ان پر نور برس رہا تھا، انبیاء کرام کی حقیقت اور ماہیت کو دیگر انسانوں کی ماہیت اور افضلیت سے جوڑنا اور اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، ''فافہم''

آپ کا جسم عنصری لطیف تھا اس لئے آپ ﷺ سایہ نہ تھا

ظل الحبیب ﷺ

مؤلف کتابچہ نے **ظل الحبیب** کے نام سے عنوان قائم کیا اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بشر تھے نُور نہ تھے، اور آپ کا سایہ تھا۔

اس پر یہ آیہ کریمہ: ''وللہ یسجد من فی السمٰوت والارض طوعًا وکرھا وظلٰلُھم بالغدُو والاصال'' (الرعد: ۱۳ تا ۱۵) نقل کی۔

ترجمہ: زمین اور آسمان میں رہنے والی ہر مخلوق خوشی، ناخوشی اللہ ہی کے روبرو جھکتی ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے سائے بھی صبح وشام اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔

اس آیہ کریمہ کی تفسیر بھی امام رازی کی تفسیر کبیر سے نقل فرمائی۔ ہم بھی وہی نقل کرتے ہیں:

''قال المفسرون کل شخص سواء کان مومنا او کافرا فان ظلہ یسجد للہ قال مجاھد ظل المومن یسجد للہ طوعا وھو طائع وظل الکافر یسجد للہ کرھا وھو کارہ''

ترجمہ: مفسرین حضرات نے فرمایا ہے کہ ہر شخص مومن ہو یا کافر اس کا سایہ اللہ کے لیے سجدہ کرتا ہے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے مومن کا سایہ اختیاری سجدہ کرتا ہے اور وہ مومن اس پر خوش ہوتا ہے۔ اور کافر کا سایہ جبری سجدہ کرتا ہے اور وہ کافر اس کو ناپسند کرتا ہے،۔۔۔۔۔۔

پھر فائدہ کے تحت تحریر کیا کہ ناظرین خود فیصلہ کریں کہ اس آیت میں جو ہر مخلوق کے سایہ کا ذکر ہے تو آپ ﷺ مخلوق میں داخل ہیں یا نہیں؟ اور مفسر کبیر نے جو مومن اور کافر ہر ایک کے سایہ کا ذکر کیا ہے کیا مومن میں آپ ﷺ داخل نہیں؟

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ امام رازی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: ''ان الفظ 'من' دو حال سے خالی نہیں' ان کان عاما الا ان المراد بہ الخصوص وھم المومنون من فی السمٰوت والارض'' میں لفظ ''من'' اگر عام ہو، مومن اور کافر کو شامل ہو، لیکن اس سے مراد زمین وآسمان کے مومنین ہوں۔

''والثانی ان اللفظ عام والمراد منہ ایضا العام وعلی ھذا فی الایۃ اشکال لانہ لیس کل من فی السمٰوت والارض یسجد للہ بل الملائکۃ یسجدون للہ والمومنون من الجن والانس یسجدون للہ تعالی واما الکافرون فلا یسجدُون''

ترجمہ: دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ بھی عام ہو اور معنیٰ بھی عام ہو، لیکن اس سے آیہ کریمہ سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن اور انسان مومنین اور فرشتے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن کافر سجدہ نہیں کرتے وہ اس میں شامل نہیں ہوں گے، لیکن امام موصوف آگے خود فرماتے ہیں! کہ "قال المفسرون کل شخص سواء کان مومنا او کافرا الخ" مفسرین نے فرمایا ہر شخص سجدہ کرتا ہے مومن ہو یا کافر جس سے انہی کے کلام میں تضاد آ گیا۔ اتنے بڑے مفسر کی کلام تضاد پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ ماننا پڑے گا کہ امام کے نزدیک راجح یہی ہے کہ من کا معنی مرادی خاص ہے اور وہ مومنین ہیں۔ اور یہ معنیٰ خاص ہے۔ امام رازی نے "کل شخص سواء کان مومنا او کافرا" دیگر مفسرین کی رائے نقل کی ہے اس کے باوجود انہوں نے دو قسم کے اشخاص کو نامزد کیا (مومن اور کافر) مگر کمال کر دکھایا مؤلف کتابچہ نے جنہوں نے "کل شخص" کا ترجمہ ہر مخلوق کیا ہے۔ اور سوال کیا ہے کہ اس آیت میں ہر مخلوق کے سائے کا ذکر ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخلوق میں داخل ہیں یا نہیں؟

جواباً کہا جائیگا کہ مؤلف نے ہر مخلوق کس لفظ کا معنی کیا ہے؟ مفسر کبیر نے تو "کل شخص سواء کان مومنا او کافرا" کے الفاظ لکھے ہیں اور شخص کا معنی صرف انسان ہے ہر مخلوق نہیں ورنہ انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے لازم آئیگا کہ وہ بھی مومن اور کافر ہو، اور اگر کل شخص کا لفظ ہر مخلوق کا معنی دے اور ہر مخلوق کو شامل ہو تو "ان اللہ علی کل شیءِ قدیر" میں کل شیءِ سے مراد کیا ہو گی؟ کیونکہ شیءِ سے مراد مطلق وجود ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں بحث شیءِ میں فرمایا ہے اور بطور دلیل یہ آیت "قل ای شیءِ اکبر شھادۃ قُلِ اللّٰہ شھید بینی و بینکم" سے استدلال بھی کیا ہے کیونکہ شیءِ بمعنی واجب الوجود اللہ وحدہ لاشریک پر بھی بولا جاتا ہے تو کیا "ان اللہ علی کل شیءِ قدیر" میں "کل شیءِ" کا معنی عام یعنی مطلق الوجود لینے سے اللہ تعالیٰ اپنی ذات پر بھی قادر ہے؟

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "و کل انسان الزمنہ طائرہ فی عنقہ" (بنی اسرائیل: ۱۳)

کیا کل انسان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی داخل ہیں؟ باوجودیکہ وہ بھی انسان ہیں۔ کیا قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بھی وہی حالت اور کیفیت ہوگی جو دسرے لوگوں کی ہوگی؟ کیا نامہ اعمال آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہاتھوں میں بھی ہوگا جس طرح باقی انسان تھامے ہوئے آئیں گے؟ اگر ایسا ہی ہوا تو بخاری اور مسلم کی اس حدیث کا کیا جواب ہوگا؟ "انا الماحی الذی یمحو اللہ بی الکفر و انا الحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی"

:۱۳ارشاد باری تعالی ہے: "یوم ندعوا کل اناس بامامھم" (بنی اسرائیل: ۷۱)

کیا کل اناس بامامھم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم داخل ہیں؟

امام رازی نے فرمایا: فالنبی امام امتہ و الخلیفۃ امام رعیتہ، و القرآن امام المسلمین و امام القوم ھو الذی یقتدی بہ فی الصلوۃ" (کبیر جز ۲۱، ص ۱۷)

ترجمہ: ہر نبی اپنی امت کا امام ہے اور خلیفۃ اپنی رعایا کا امام ہے۔ اور قرآن حکیم تمام مسلمانوں کا امام ہے اور قوم کا امام وہ ہے نماز میں جس کی اقتداء کی جاتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث بھی نقل فرمائی: انہ ینادی یوم القیامۃ یا امۃ ابراھیم، یا امۃ موسی، یا امۃ عیسی، یا امۃ محمد فیقوم اھل الحق الذین اتبعوا الانبیاء فیأخذون کتبھم بایمانھم" (کبیر جز ۲۱ ص ۱۷)

ترجمہ: قیامت کے دن پکارا جائے گا اے ابراہیم علیہ السلام کی امت، اے موسیٰ کی امت، اے عیسی علیہ السلام کی امت اور اے محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی امت۔ پس وہ لوگ جو اہل حق ہوں گے جنہوں نے انبیاء کرام کی پیروی کی ہوگی وہ کھڑے ہوجائیں گے اور وہ اپنی اپنی کتب یعنی نامہ اعمال اپنے داہنے ہاتھوں میں لیں گے۔ اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔

کل انسان الزمنہ طاھرہ فی عنقہ" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم داخل نہیں، کیونکہ مفسر کبیر کی تصریح

سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے متبعین کے داہنے ہاتھوں میں نامہ ءاعمال ہوگا۔

کل انسان کا لفظ گرچہ عام ہے مگر اس کا معنیٰ خاص ہے اور وہ متبعین ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ”کل نفس بما کسبت رھینۃ الا اصحب الیمین“ (مدثر ۳۹)

کل نفس کا لفظ عام ہے کیا رسول اللہ ﷺ اس میں داخل ہیں؟

مندرجہ بالا آیات میں: کل شی ء، کل اناس، کل نفس کے الفاظ عام ہیں مگر ان کا معنی خاص ہے اور رسول اللہ ﷺ ان میں داخل اور شامل نہیں ہیں، اسی طرح امام رازی کی نقل فرمودہ عبارت جو کسی اور مفسر کی ہے میں کل شخص اگرچہ عام لفظ ہے مگر اس میں رسول اللہ ﷺ داخل نہیں، اس پر مومنا کان او کافرا کی تخصیص بطور قرینہ لفظی موجود ہے، بالکل اسی طرح جس طرح مثل مشہور مثلاً ہر وقت دن ہو یا رات فرشتے اللہ کی حمد وثناء بیان کرتے ہیں، میں ہر وقت کا لفظ سال اور مہینوں کو شامل نہیں کیونکہ ہر وقت کے بعد دن اور رات کے تعین سے وہ خارج ہو گئے ہیں ۔اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ ہر شی ءمخلوق ہے تو اس شی ء کے لفظ سے عام مراد ماسوی اللہ مخلوق ہوگی باوجود یکہ شی ء کا لفظ ذات باری تعالی پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ شی ء کا معنی مطلق الوجود ہے مگر اللہ کا وجود واجب اور مخلوق کا وجود ممکن ہے ۔(شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ص ۴۲)

خلاصہ یہ ہے کہ ”ظللھم“ سے مراد مومنین ہیں۔جیسا کہ امام رازی کے حوالے سے پہلے گزر چکا ہے، اور ”ظللھم“ میں رسول اللہ ﷺ داخل نہیں، اس پر ”سواء کان مومنا او کافرا“ کی تخصیص اور تمیز موجود ہے۔

مزید مولف کا من فی السموٰت والارض کا معنی ہر شی کرنا اس لئے بھی غلط ہے کہ ظِلٰلُھُم میں ھم ضمیر مرفوع منفصل برائے جمع مذکر ہے اس کا مرجع مومن اور کافر ہیں، من موصولہ برائے ذات ہے اور ذوالعقول ہے ہر مخلوق نہ مذکر ہے اور نہ ذوی العقول،،

مؤلف کا یہ سوال کرنا کہ کیا مومن میں آپ ﷺ داخل نہیں؟ یہ سوال ہی غلط ہے، اولا اس لیے

کہ آیت کا سیاق وسباق گواہ ہے کہ فرشتوں، مومنین کا سجدہ اختیاری، اور کافر کا سجدہ سائے کے حوالے سے اضطراری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات اور سائے کے سجدے کا تذکرہ کہیں نہیں کیا جارہا اور احادیث اور آثار سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ تھا۔

"قال عثمان ان اللہ ما اوقع ظلک علی الارض لئلا یصنع انسان قدمہ علی ذالک الظل" (تفسیر مدارک ج ۳ ص ۱۳۱ بحوالہ مقیاس النور)

ترجمہ: حضرت عثمان نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ بے شک اللہ تعالی نے آپ کا سایہ زمین پر نہیں ڈالا تاکہ اس پر کوئی انسان قدم نہ رکھے۔ علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی نے فرمایا

"وکان اذا مشی فی قمر او شمس لایظھر لہ ظل" (الجواہر البحار، ج ا ص ۴۵۲)

ترجمہ: جب آپ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو آپ کا سایہ نہ ہوتا۔

زرقانی میں ہے: **"لم یکن لہ ﷺ ظل فی شمس ولا قمر لانہ کان نورا کما قال ابن سبع"** (زرقانی، ج ۴ ص ۲۲۰)

ترجمہ: سورج اور چاند کی روشنی میں آپ ﷺ کا سایہ نہ ہوتا تھا کیونکہ آپ ﷺ نور تھے۔ ابن سبع نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام جلاالدین سیوطی نے فرمایا:

"اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان، ان رسول اللہ ﷺ لم یکن یری لہ ظل فی شمس ولا قمر قال ابن سبع من خصائصہ ان ظلہ کان لایقع علی الارض وانہ کان نورا وکان اذا مشی فی الشمس او القمر لاینظر لہ ظل، وقال بعضھم ویشھد لہ قولہ ﷺ فی دعائہ واجعلنی نورا" (خصائص کبری، ج ا، ص ۶۸)

ترجمہ: بے شک رسول اللہ ﷺ کا سایہ سورج اور چاند کی روشنی میں نہیں دیکھا جاتا تھا، اور ابن سبع نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ کے خصائص میں سے ہے کہ آپ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔

اور بے شک آپ نور تھے، اور جب سورج اور چاند کی روشنی میں چلتے تو آپ کا سایہ دکھائی نہ دیتا تھا، بعض علماء نے کہا ہے کہ آپ کا فرمان شہادت دیتا ہے کہ آپ کا نور تھے اور آپ کا سایہ نہ تھا، آپ ﷺ نے دعا میں یہ کہا ہے کہ اے اللہ مجھے نور بنا دے، قاضی عیاض نے فرمایا :

"وماذکر من انه کان لا ظل لشخصه فی شمس ولا قمر لانه کان نورا

وان الذباب کان لا یقع علی جسده ولا ثیابه" (شفاء ج ۱، ص ۲۴۲)

ترجمہ: امام قاضی عیاض نے فرمایا: کہ آپ ﷺ کے دلائل نبوت ورسالت میں سے یہ بات بھی مذکور ہوئی ہے کہ آپ کے جسم انور کا سایہ نہ دھوپ میں تھا نہ چاندنی میں، اس لیے کہ آپ نور تھے، اور مکھی آپ ﷺ کے جسم اور لباس پر نہ بیٹھتی تھی۔ اسکی شرح میں ملا علی قاری فرماتے ہیں: **"کان من خصائصه انه کان نورا وکان اذا مشی فی الشمس**

او القمر لا یظهر له ظل" (ص ۵۰۵)

ترجمہ: مصطفیٰ ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ آپ ﷺ نور تھے، اور جب سورج اور چاند کی روشنی میں چلتے تو آپ کا سایہ ظاہر نہ ہوتا۔ علامہ امام احمد بن محمد قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : **"لم یکن له ﷺ ظل فی شمس ولا قمر"** (زرقانی علی المواهب ج ۴، ص ۲۲۰)

ترجمہ : رسول اللہ ﷺ جب سورج اور چاند کی روشنی میں چلتے تو آپ ﷺ کا سایہ نہ ہوتا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سایه ایشاں بر زمی نمے افتد" (تفسیر عزیزی سورئہ والضحی)

ترجمہ : حضور ﷺ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"ونہ بود آنحضرت ﷺ را سایہ نہ در آفتاب نہ در قمر" (مدارج النبوت ۲۶)

ترجمہ: آنحضرت ﷺ کا سایہ نہ دھوپ میں تھا نہ چاندنی میں۔

ان کے علاوہ دیوبندی مکتب فکر کے جیّد علماء مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، بلکہ

غیر مقلدین کے بڑے عالم حافظ محمد لکھوی بھی حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونے کے قائل تھے۔

مولانا عبدالرحمن جامی اور مجدد الف ثانی بھی رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہ ہونے کے دعویدار تھے، غیر مقلدین کے بڑے عالم اور مفسر حافظ محمد لکھوی رسول اللہ کا سایہ نہیں مانتے،

ان کا شعر ملاحظہ ہو: جاں گرمی سخت ہوندی تاں سر پر بدل سایہ کردا
تے اپر زمین نہ پوندا سایہ حضرت پیغمبر دا

(تفسیر محمدی منزل ہفتم ص ۴۲۹، بحوالہ مقیاس النور، ص ۱۲۱)

بحمد اللہ تعالی جلیل القدر مفسرین، محدثین، اور علمائے ربانی کی تصریحات سے یہ واضح اور ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اقدس کا سایہ نہ تھا کیونکہ آپ نور تھے، مؤلف کا "ظللهم" اور 'کل شخص سواء کان مومنا او کافرا' سے آپ کا سایہ ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی توقیفیہ ہیں۔ قیاسی نہیں آپ مومن بہ ہیں اگر آپ کو لفظ مومن کے مدلول میں شمار اور داخل کر کے آپ کو مومن کہا جائے تو تین خرابیاں لازم آتی ہیں:

(۱) آپ خاتم النبیین نہ رہیں گے یہ نص قطعی کے خلاف ہے۔

(۲) دور لازم آئے گا۔

(۳) تسلسل لازم آئے گا یہ بھی باطل ہے،

☆ کما لا یخفی علی من له ادنی شغف فی المنطق و المعقول ☆

{و الحمد لله رب العالمین و الصلوة و السلام علی رحمة للعالمین}

سایہ کا نہ ہونا رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے ہے جس کے لیے وقت اور جگہ کا کوئی تعین نہیں ایسا ممکن نہیں کہ کبھی سورج کی روشنی میں آپ کا سایہ ہوا اور کبھی نہ ہوا،

سوال کا جواب

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پر فرشتوں نے جوان پر پروں سے سایہ کیے رکھا اس سے مراد ڈھانپنا ہے۔سایہ کثیف شیء کا ہوتا ہے۔فرشتے عالم امر سے ہیں لطیف اور ہوائی اجسام کے مالک ہیں لطیف اور ہوائی چیز کا سایہ نہیں ہوتا، ہر مومن کے اعمال کی تدوین اور حفاظت کے لیے کراماً کاتبین مامور ہیں کیا ان کو کسی نے دیکھا ہے؟ کیا ان کا سایہ ہے؟ اگر ان کا سایہ ہے تو پھر لطیف، ہوائی اجسام کے مالک اور نوری نہیں، نوری ہیں اور یقیناً نوری ہیں تو پھر حضرت عبداللہ پر

اپنے پر بچھانے والے فرشتوں کا سایہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اگر ان کا سایہ ہے جو حضرت عبداللہ پر، اپنے پر بچھائے ہوئے تھے تو لازم آئے گی ترجیح بلا مرجح یہ بھی باطل ہے۔

سایہ کثیف اور نظر آنے والی شیء ہے اگر حقیقتاً سایہ ہوتا تو سب کو نظر آتا مگر کسی صحابی نے نہ دیکھا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا، یہ سایہ نور اور رحمت تھا،،

آئیے دیکھیں کہ ظل کیا ہے؟

ظل کیا ہے؟

آئیے دیکھیں ظل کیا ہے؟ ظل مصدر ہے، اس کا اطلاق جوہری چیز کے خیال اور تخیّل اور عکس وجود پر ہوتا ہے، صاحب روح المعانی نے نقل فرمایا:

"قال الفراء مصدر ثم اطلق علی الخیال الذی یظھر للجرم" (جز ۲۶، ۱۴)

حدیث حضرت زینب رضی اللہ تعالی عنہا میں ہے کہ "انا بظل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقبلاً" میں ظل سے مراد ذات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال اور تخیل کا آنا ہے، اگر واقعی یہ سایہ تھا تو حضرت زینب رضی اللہ تعالی عنہا نے سایہ تو دیکھ لیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیوں نہیں دیکھا؟ سایہ جسم سے الگ تو ہو نہیں سکتا، پھر مقبلا کا لفظ واضح بتا رہا ہے کہ وہ آ رہا تھا اکیلا سایہ کیسے آ رہا تھا سایہ جسم کثیف کا

لازم ماہیت ہے دھوپ سورج کو تپش آگ کو لازم ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ دھوپ ہو اور سورج نہ ہو، تپش ہو مگر آگ نہ ہو۔ بقول حضرت زینب اگر سایہ آرہا تھا تو رسول اللہ ﷺ آرہے تھے سایہ جسم سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اس سے متصل اور اسی کے تابع حرکت ہوتا ہے، بہر حال حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ آرہے ہیں۔ (وھوالمراد)

محدث ابن جوزی، شیخ شہاب الدین سہروردی، ملا علی قاری، علامہ اسماعیل حقی رحمہم اللہ نے نقل فرمایا جس مٹی سے آپ کا وجود عنصری بنایا گیا تھا اس کا نام درۃ البیضاء ہے آب تسنیم سے دھو دھو کر کثافت کو دور کر کے لطیف بنایا گیا تھا جو نور کے ہم پلہ تھی،، (جواہر البحار، مرقات)

جب جسم اطہر ہی لطیف تھا، نور کا پیکر اور نور کا ہم پلہ تھا، کثافت نام کی کوئی چیز اس میں نہ تھی، مکھی نہیں بیٹھتی تھی، اندھیرے دور کر کے روشنی پھیلاتا تو اس کا سایہ کہاں سے آتا؟ متضاد جنس ہو کر لازم وجود کیسے بنتا؟ جسم مبارک کیلئے سایہ کا ثابت کرنا احادیث مبارکہ کی روشنی میں آپ کے جسم کی کثافت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے ''فافہم''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بحث نور

آپ ﷺ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلی ہیں

مولف نے فائدہ،ص ۲۷ کے ضمنی نمبر ۳ میں لکھا ہے

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ اور نور نہیں ہیں بلکہ بشر اور انسان ہیں،،

توضیحاً کہا جائے گا کہ: اس کا جواب ولا اقول لکم انی ملک کے جواب میں امام رازی کی بیان فرمودہ تشریح اور تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں فرمایا اور اس جملہ میں صفت ملکی کی نفی کا اعلان اللہ تعالیٰ نے کیوں کرایا؟۔ امام رازی نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، اور فرشتوں کی صفات میں اختلاف تو ہے مگر تفاوت، تبائن اور تضاد نہیں ہم قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ کا قول پہلے نقل کر آئے ہیں کہ انبیاء کرام کا باطن ایسی بلند پایہ صفات سے متصف ہوتا ہے جہاں فرشتوں کی نورانیت کا گزر تک نہیں ہوسکتا

مولف کا آئیہ مقدسہ ''ولا اقول لکم انی ملک'' سے آپ کے نور نہ ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے اس لئے کہ مفسرین نے فرمایا کہ ''قد جاکم من اللہ نور و کتاب مبین'' میں نور سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ہم دیگر مفسرین کو چھوڑ کر صرف امام رازی کی تفسیر پیش کرتے ہیں، امام نے فرمایا۔ ان المراد بالنور محمدو بالکتاب القرآن، ترجمہ آئیہ کریمہ میں نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے، امام رازی نے فرمایا نور اور کتاب مبین کے درمیان واؤ حرف عطف ہے لیکن یہ عطف تفسیری نہیں کیونکہ نور معطوف علیہ اور کتاب مبین معطوف ہے معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت کا پایا جانا ایک اصول اور ضابطہ ہے۔

قرآن حکیم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور قرآن کو نور فرمایا ہے ان کا نور ہونا ظاہر ہے امام نے فرمایا ''لان النور الظاھر ھو الذی یتقوی بہ البصر علی ادراک الاشیاء الظاھرۃ والنور الباطن ھو الذی تتقوی بہ البصیرۃ علی ادراک الحقائق

والمعقولات(گبیرجز11-190)

ترجمہ :نوردوقسم کاہے

:ا نورظاہر جوظاہری اشیاءکےعلم،تعارف اورشناخت میں آنکھ کوتقویت دیتا ہے

:۲ نورباطن جواشیاءکےحقائق،خواص اورتعارف میں بصیرت انسانی اورفراست ایمانی کو تقویت دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف ان انوار سے نوازا بلکہ پوری عالم نورانیت کے لئے مرکزمنبع اور مبداء بنایا انوار ارضیہ ہوں یا سماویہ یہ سب آپ کے نور مقدس کی کرنیں اورشعاعیں ہیں۔ گویا ہرنوری چیز کا وجودآپ کے ہی نور سے ہے اور ہرنوری مخلوق میں آپ کےنور کی ہی چمک دمک ہے۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ فرشتے عالم امر سے ہیں عالم علوی کےمکین عظیم اجسام کے حامل اور بے پناہ قوت کے مالک ہیں مگر یہ سب کچھ فیضان محمدی کا ہی کرشمہ ہے اوران تمام امورکی تہہ میں نورمحمدی ہی کارفرما ہے مولانااشرف علی تھانوی رقمطراز ہیں کہ عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے روائت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پرفدا ہوں مجھ کوخبر دیجئے کے سب اشیاء سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کونسی چیز پیدا کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے جابر اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نوراپنےنور سے پیدا کیا(نہ بایں معنی کہ نورالٰہی اس کا مادہ تھا بلکہ اپنےنور کے فیض سے پیدا کیا۔ پھر وہ نور قدرت الٰہی سے جہاں اللہ تعالیٰ کومنظور ہواسیر کرتا رہا۔اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا، نہ بہشت تھی اور نہ دوزخ تھا، نہ فرشتہ تھا نہ آسمان تھا اور نہ زمین تھی نہ سورج تھا اور نہ چاند تھا اور نہ جن تھا اور نہ آسمان تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جب اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو ااس نور کے چار حصے کئے، ایک حصہ سے قلم پیدا کیا اور دوسرے حصے سے لوح اور تیسرے حصے سے عرش اور چوتھے حصے سے فرشتے۔

(نشرالطیب پہلی فصل نورمحمدی ﷺ کے بیان میں)

علامہ محمود احمد آلوسی نے فرمایا: "ولذا کان نورہ ﷺ اول المخلوقات ففی الخبر اول ماخلق اللہ تعالیٰ نور نبیک یا جابر" (روح المعانی جلد ۹ جزء ۱۷، ص ۱۰۵)

ترجمہ : کہ ساری مخلوق کو فیض دینے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کا نور ساری مخلوق سے پہلے پیدا کیا گیا، حدیث میں ہے کہ اے جابر ساری مخلوق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تیرے نبی کے نور کو پیدا فرمایا۔ آپ کا فرمان ہے کہ "کنت نبیا و آدم بین الروح و الجسد" میرا نور اس وقت بھی وصف نبوّت سے متصف تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسم کی درمیانی حالت میں تھے، اور تخلیقی منازل طے کر رہے تھے۔ اس وقت بشریت تو تھی نہیں نوری مخلوق موجود تھی۔ یعنی فرشتے، حور و غلماں ان کو فیض دینے کیلئے نوری وجود کی ضرورت تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نوری وجود کو تخلیق کیا اور منصب نبوّت سے سرفراز فرما کر نوری مخلوق کو مستفیض فرمایا۔ امام رازی کے فرمان کے مطابق نور دو قسم ہے نور ظاہر جو اشیاء کو دیکھنے، معلوم کرنے اور شناخت کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ لیکن اس نور ظاہر کا سارا عمل اور تاثیر صرف سامنے اور آگے دیکھنے کی حد تک محصور ہے دائیں، بائیں اور پیچھے دیکھنے میں غیر مؤثر ہے ہاں اگر دیکھنے والا سامنے کی بجائے دائیں بائیں یا پیچھے مڑ کر دیکھے تو مؤثر اور کارگر ہو سکتا ہے۔ آئیے دیکھیں نبی کریم ﷺ اس ظاہری نور کے اجالے میں کس قدر دیکھتے تھے؟ کیا ایک وقت میں صرف سامنے اور آگے دیکھتے تھے یا اسی آن اور اسی حالت اور اسی کیفیت میں پیچھے بھی دیکھتے تھے ۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز ظہر پڑھائی آخری صف میں ایک شخص نماز اچھے طریقہ سے نہیں پڑھ رہا تھا جب اس نے سلام پھیرا تو نبی کریم ﷺ نے:

'نادٰہ رسول اللہ ﷺ یا فلان الا تتقی اللہ الا تری کیف تصلی انکم ترون انہ یخفی علی شیء مما تصنعون واللہ انی لاری من خلفی کما اری من بین یدی" (رواہ احمد،

مشکوۃ باب صفۃ الصلوۃ)

ترجمہ: اس کو آواز دی کہ اے فلاں کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے ؟ تمہیں معلوم نہیں کہ تم کس طرح نماز پڑھ رہے ہو؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ مجھ پر پوشیدہ ہے، خدا کی قسم بے شک میں البتہ پیچھے کی طرف سے بھی ایسے ہی دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نماز کیلئے اقامت کہی گئی، تو آپ ﷺ نے ہماری طرف التفات فرما کر ارشاد فرمایا: اپنی صفوں کو سیدھا کرو اور کندھے سے کندھا ملاؤ، ”فانی اراکم من وراء ظھری، رواہ البخاری، وفی المتفق علیہ قال اتمو الصفوف فانی اراکم من وراء ظھری“ (مشکوۃ باب تسویۃ الصّف)

ترجمہ : پس بے شک میں اپنی پشت کی طرف سے ایسے ہی دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ حالت نماز میں پشت کی طرف سے بھی ایسے ہی دیکھتے تھے، جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے۔

ابوداؤد کی حدیث میں ہے ”فو الذی نفسی بیدہ انی لاراکم من خلفی کما اراکم من بین یدی“ (مشکوۃ باب مذکور)

ترجمہ: مجھے قسم ہے اس ذات وحدہ لاشریک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے بے شک میں پشت اور سامنے کی جانب سے یکساں دیکھتا ہوں،

یہ دیکھنا دل کے ساتھ ہو یا آنکھ سے، یا کشف سے، مگر یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکی آپ کی چشم ہائے مبارکہ سے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے والا، اور اس کی ہر ہر حرکت آپ ﷺ کے پیش نظر تھی، ظاہری نور تو انسانی آنکھ کی رویت کی حد نگاہ تک لے جاتا ہے اور صرف ان چیزوں کے ادراک پر قوت عطا کرتا ہے جو زیر نظر ہوں اوجھل، پوشیدہ، اور کثیف اجسام کی دوسری جانب دیکھنے کی صلاحیت دیتا ہے نہ پیدا کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ

ہے کہ وہ کون سا نور ہے جو نبی کریم ﷺ کو اجالے اور تاریکی میں کثیف اجسام کے ظاہر اور باطن کو یکساں دیکھنے کی قدرت عطا کرتا ہے۔ ماننا پڑیگا کہ یہ ظاہری نور کا کرشمہ نہیں کیونکہ حد نگاہ تک اس نور کی حد مقرر ہے بلکہ یہ نور ذات ہے، جس کیلئے حد مقرر ہے نہ فقط سامنے سے دیکھنے کی پابندی، ذات نبوی ﷺ کے نور کی حد رویئت عالم ممکنات سے بھی پار ہے اور کائنات کے ذرے ذرے کو شامل اور محیط ہے۔ حضرت ثوبان روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"ان اللہ ذوی لی الارض، فرائیت مشارقھا و مغاربھا الحدیث" (رواہ مسلم

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے پوری روئے زمین کو میرے قریب کر دیا، اور میں نے زمین کے مشارق و مغارب کو دیکھا۔ اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے فرمایا: **قال التور بشتی ذوی ذویت الشی جمعتہ و قبضتہ یرید بہ تقریب البعید منھا و حاصلہ انہ طوی لہ الارض و جعلھا مجموعۃ کھیئۃ کف فی مرأۃ نظرہ" (مرقات جلد ۱۱ ص ۵۰)**

ترجمہ : تور پشتی نے فرمایا **"ذوی ذویت الشیء"** سے ماٴخوذ ہے جس کا معنی جمع کرنا، مٹھی میں لینا، اور اس کا معنی مرادی یہ ہے زمین کے دور دراز حصوں کو میرے قریب کیا اور میں نے پوری روئے زمین کو ہتھیلی کی طرح بچشم سر ملاحظہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری روئے زمین کو ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح مجھے دکھایا۔ کیا یہ دیکھنا ایک عام انسان کی طرح دیکھنا تھا، کیا یہ نور ظاہری کا کمال تھا، ہرگز نہیں، کیونکہ زمین کی ہر ہر سمت کو دیکھنا، اور کائنات ارضی کی ہر ہر شیء کو دیکھنا پھر ساتوں زمینوں اور ان میں موجود مخلوقات کو دیکھنا نور ظاہر اور عام انسان اور بشر کے بس میں نہیں، ثابت ہوا کہ تمام زمینوں کی ہر ہر سمت کا دیکھنا اور جملہ کائنات ارضیہ کا ملاحظہ کرنا اس نور ذات کا ہی خاصہ ہے جو پشت اور سامنے سے، اجالے اور اندھیرے میں یکساں دیکھتی ہے" اس نور ظاہر کا دائرۂ کمال، اور نکتہء اثر حد نگاہ تک محدود ہے۔ مگر ذات نبوی کی نور

فشاں نگاہوں اور چشم نور کی قوت روئیت دیکھیئے ۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

"قال نعی النبی ﷺ زیداو جعفر او ابن رواحۃ للناس قبل ان یاتیھم خیر ھم فقال اخذاالرأیۃ زید فاصیب ثم اخذ جعفر فاصیب ثم اخذابن رواحہ فاصیب و عیناہ تذرفان حتی اخذالرأیۃ سیف من سیوف اللہ یعنی خالدبن الولید حتی فتح اللہ علیہم "(رواہ البخاری، مشکوۃ ۵۳۳)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید، حضرت جعفر، حضرت ابن رواحہ کی شہادت کی خبر، ان کی خبر شہادت کے آنے سے پہلے دی، پھر پورا نقشہ اور جنگ کے مناظر بھی بیان فرمائے ،فرمایا اس وقت لشکر صحابہ کا علامتی جھنڈا زید کے ہاتھ میں ہے وہ شہید ہو گئے ہیں۔اب جھنڈا جعفر کے ہاتھ میں ہے وہ بھی شہید ہو گئے ہیں ان کی شہادت کے بعد اب جھنڈا ابن رواحہ کے ہاتھ میں ہے اس منظر کشی کے وقت آپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسوں بہہ رہے تھے، ابن رواحہ بھی شہید ہو گئے ہیں ،ان کے بعد اب جھنڈا سیف من سیوف اللہ خالد بن ولید کے ہاتھ میں ہے، اب اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح سے ہمکنار فرمایا ہے۔غور کرنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ میدان جنگ جو مدینہ منورہ سے بہت دور ہے،مگر رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہو کر سارا منظر ملاحظہ فرما کر صحابہ کرام کو تفصیل بتا رہے ہیں ، یہ نور عادی یعنی نور ظاہر کا اثر اور کمال نہیں بلکہ اس نوری حقیقت کا کمال اور اس نوری جسم کا کمال ہے جس کی رگ رگ میں نور نبوّت جلوہ فرما ہے،جس کے سامنے موتہ سے لیکر مدینہ منورہ تک کی دوری اور بعد مسافت کے باوجود کوئی پہاڑ، یا صحراء حجاب اور پردہ نہ بن سکا بلکہ ان نوری نگاہوں ،اور نور برساتی نظروں کے سامنے طبقات سماوی بھی حجاب نہ بن سکے۔

حضرت عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں مرض وفات کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:"**انی بین ایدیکم فرط، و اناعلیکم شھیدو ان موعدکم**

الحوض و انی لانظر الیہ و اناقی مقامی ھذا الحدیث"(متفق علیہ)

ترجمہ : کہ بے شک میں تمہارے آگے کیلئے سامان نجات ہوں، اور میں تم پر گواہ ہوں، بے شک تمہارا اور میرا وعدۂ ملاقات حوض کوثر کا مقام ہے اور بے شک میں البتہ حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں حالانکہ میں مسجد نبوی کے منبر پر جلوہ آراء ہوں۔

واضح رہے کہ زمین سے پہلے آسمان تک کا فاصلہ پانچ سو برس کا ہے اسی طرح پہلے آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ پانچ سو سال کا اسی طرح دوسرے سے تیسرے کا، تیسرے سے چوتھے کا، چوتھے سے پانچویں کا، چھٹے، اور ساتویں کی مسافت بھی پانچ پانچ سو سال کی ہے اور ساتوں آسمانوں سے اتنی ہی دوری پر واقع جنت ہے جس میں یہ حوض کوثر ہے ہزاروں سال کی دوری پر واقع حوض کوثر کو ملاحظہ فرمانا نور عادی یعنی نور ظاہر کا کمال ہے؟ نہیں نہیں ہر گز نہیں اس نور نبوّت اور نور ذات کا کمال ہے جس کے سامنے کثیف سے کثیف تر چیز بھی حجاب نہیں بن سکتی ۔ بلکہ اس نور ذات اور نور نبوت کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جس چیز پر پڑتا ہے نہ صرف اس کو روشن و منور کرتا ہے بلکہ اس کے بعد والی ہر چیز اس سے اکتساب نور کرتی روشن اور ظاہر ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ ملا علی قاری نے فرمایا:

"والنور ھو الظاھر بنفسہ المظھر لغیرہ"(مرقاۃ جلد ۱۱، ص ۴۰)

ترجمہ: نور وہ چیز ہے جو خود ظاہر ہو اور جس پر پڑے اسکو بھی روشن کر دے، یعنی خود روشن اور منور ہو دوسری چیز کو بھی روشن اور منور کر دے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا کہ ایک تاریک اندھیری رات میں قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے ایک شاخ دی اور فرمایا لے جاؤ یہ تمہیں تمہارے دس گز آگے اور دس گز پیچھے روشنی دے گی، اور جب تم گھر میں داخل ہو گے تو اس کو سیاہ دیکھو گے، تو اس کو مارنا یہاں تک کہ وہ سیاہی نکل جائے کیونکہ وہ شیطان

ہے پس پہلے تو اس ٹہنی نے روشنی دی پھر جب گھر میں داخل ہوئے تو اس میں سیاہی پائی تو انہوں نے اس کو مارا یہاں تک وہ سیاہی دور ہو گئی (مسند امام احمد، شفاء شریف)

اسی طرح آپ ﷺ نے قتادہ بن ملجان رضی اللہ عنہ کے چہرے کو مسّ فرمایا تو ان کا چہرہ چمکنے لگا یہاں تک کہ لوگ ان کے چہرے میں ایسے دیکھتے تھے جیسے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔

(شفاء شریف باب المعجزات فصل ۲۲)

کھجور کی شاخ آپ کے دست اقدس سے مسّ ہوئی وہ مینارۂ نور بن گئی اس کی حقیقت بدل گئی قتادہ بن ملجان رضی اللہ عنہ کے چہرے کو مسّ کیا وہ نور کا آئینہ بن گیا۔ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ وہ صرف اس لئے کہ آپ کی ذات مقدسہ نور ہے جو چیز آپ ﷺ سے مس ہوتی جائے گی وہ نور ہی بنتی جائے گی۔ کیونکہ نور کا خاصہ ہے خود روشن اور دوسری چیز کو روشن کرنے والا۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ:

"مارئیت یوما قط کان احسن و لا اضوء من یوم دخل علینا فیہ رسول اللہ ﷺ"

ترجمہ: اس دن جیسا حسین اور روشن تر دن میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مزید فرمایا:

"وفی روایۃ الترمذی لما کان الیوم الذی دخل فیہ رسول اللہ المدینۃ اضاء منہا کل شی الحدیث" (ترمذی، مشکواۃ ص ۵۴۷)

ترجمہ: حضرت انس کی روایت جو ترمذی میں ہے اس کے الفاظ یوں ہیں۔ کہ جب وہ دن آیا جس دن رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اس دن مدینہ کی ہر شیء روشن ہو گئی، یعنی مدینہ کے مکانات، بازار، اشجار و احجار، محلے، گاؤں، گلی کوچے، بلکہ مدینہ طیبہ کا ہر ذرہ چمک اٹھا، روشن اور منوّر ہو گیا۔ یعنی آپ کا نور ظاہری ہر ذرے پر پڑا اور ہر ذرہ آپ ﷺ کے نور پاک سے جگمگانے لگا۔ یہ نور حسی تھا۔ آپ کے جسم پاک سے نکلنے والا نور تھا۔ جس نے مدینہ

منورہ کی تمام اشیائے ظاہرہ اوراشیائے باطنہ کونور بخشا،اور مدینہ کی جملہ کائنات کونور میں نہلا دیا
اوراہل مدینہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے :"طلع البدر علینا من ثنیة الوداع"
یعنی آپ ﷺ کا مدینہ کی سرزمین پر قدم رکھنا گویا ایک منبع نور کا داخلہ تھا جونور برساتا ہوا آیا،وہ ایک نوری چاند کا طلوع ہوتا تھا جس کی ضیاء بار کرنوں سے مدینہ کی ہر گلی بلکہ ہر کلی خوشبوئے رسالت سے چمک اور نوررخ مصطفی سے دمک اٹھی اسی کی تائید اور توثیق حضرت عباس بن عبد المطلب کے مشہور قصیدہ سے بھی ہوتی ہے۔جو آپ نے غزوۂ تبوک سے واپسی کے موقعہ پر آپ کے سامنے پڑھا۔جس کے دو اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:"وانت لماولدت اشرقت الارض وضائت بنورک الافق فنحن فی ذالک الضیاءوفی النور،سبل الرشادترق"(البدایہ والنہایہ جز ۲،ص ۲۴۱)
ترجمہ:اے اللہ کے رسول جب آپ پیدا ہوئے پوری روئے زمین چمک اٹھی اورآپ کے نور سے آسمان کے افق جگمگا اٹھے،ہم روشنی اور نور کے اجالے میں رشد وہدایت کی منازل طے کرتے ہیں،حضرت عرباض بن ساریہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"و رؤیاامی التی رأت حین وضعتنی وقدخرج لھا نور اضاءت لھامنہ قصور الشام رواہ فی شرح السنةورواہ احمدمشکوة باب فضائل سید المرسلین)
ترجمہ: میں اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو میری ماں نے میری ولادت کے وقت دیکھا کہ ایک ایسا نورنکلا جس نے میری والدہ کے لئے شام کے محلات روشن کردیئے۔حجرۂ آمنہ رضی اللہ عنہا چاروں طرف سے بند تھا،مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے حجرۂ مبارکہ میں تشریف رکھتے ہوئے ملک شام جیسے دور ملک کے محلات دیکھ لئے،جس سے ثابت ہوا کہ یہ نور ذات مصطفیٰ ﷺ سے پھوٹنے والا نور تھا جس نے حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی آنکھوں کے

سامنے سے تمام حجابات اٹھا دیئے۔ اور یہ نُور حسی تھا۔ شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی نے فرمایا:

"وقدجاءت الاخیار انها کانت فی الیقظة فینبغی ان یحمل الرؤیا علی الرؤیة بالعین (لمعات) شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا۔ اس مضمون میں دوسری احادیث بھی وارد ہوئی ہیں کہ یہ واقعہ، یہ دیکھنا عالم بیداری کا ہے، یعنی حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے یہ نور حالت بیداری میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ نور وجود مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نُور تھا: ان تمام مندرجات کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ اللہ نے فرمایا میرا رسول نُور ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

"قدجاء کم من اللہ نور و کتاب مبین"

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا۔ میں نُور ہوں۔ حدیث جابر پہلے گزر چکی ہے۔

۳۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے فرمایا خرج منی نُور، میرا بیٹا نُور ہے۔ اس نے مجھے شام کے محلات دکھائے،

۴۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا فرماتے ہیں آپ نُور ہیں۔ (قصیدہ حضرت عباس)

۵۔ اہل مدینہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نُور ہیں۔ (اضاء منها کل شی، الحدیث)

۶۔ امام رازی، دیگر مفسرین، ابن جریر، بیضاوی، جلالین، معالم التنزیل، خازن، صاوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نُور ہیں۔

۷۔ جمہور محدثین نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نُور کہا، آپ کیوں نُور نہ ہوئے؟ اور کیوں نُور نہیں جبکہ آپ نے خود اپنی ذات مقدسہ اور جسم مبارک کے نُوری ہونیکے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی ہے۔ جو دُعائے نُور کے نام سے مشہور ہے ملاحظہ ہو وہ دُعائے نُور۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے گھر گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھوڑی دیر اہل خانہ کے ساتھ گفتگو فرمانے کے بعد سو گئے، جب رات کا آخری

تیسرا حصہ ہوا تو یا اس کا کچھ حصہ ہوا ہوگا آپ اُٹھے اور نگاہ مبارک آسمان کی طرف اٹھائی پھر آپ نے آئیہ کریمہ **"ان فی خلق السمٰوٰت و الارض و اختلاف الیل و النھار لاٰیات لاولی الالباب"** ساری سورۃ ختم فرمائی، پھر آپ نے مشکیزہ کے پاس جا کر اس کا منہ کھولا اپنی آنکھوں پر پانی ڈالا اور پھر وضوء کیا لیکن بہت ہی عمدہ، پھر کھڑے ہو کر نماز شروع فرمائی، میں بھی اُٹھا وضو کیا اور آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا، محبت سے میرا کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے دائیں پہلو کھڑا کیا، آپ نے تیرہ رکعت نماز مکمل فرمائی، پھر لیٹ گئے، اور سو گئے، اور آپ کے سانس کی آواز آنے لگی، آپ کی عادت مبارکہ تھی جب آپ سوتے تو خراٹوں کی آواز آیا کرتی تھی۔ حضرت بلال نے نماز کیلئے اذان دی، پھر آپ نے وضوء کئے بغیر نماز پڑھی اور آپ یہ دُعا کرنے لگے،

"اللھم اجعل فی قلبی نورًا و فی بصری نورا و فی سمعی نورا وعن یمینی نورا وعن یساری نورا و فوقی نورا وتحتی نورا و امامی نورا و خلفی نورا و اجعل لی نورا وزاد بعضھم وفی لسانی نورا و ذکر، وعصبی ولحمی ودمی وشعری و یشری، متفق علیه، وفی روایة لھما واجعل فی نفسی نورا و اعظم لی نورا وفی اخری لمسلم اللھم اعطنی نورا: (مشکواۃ باب صلوۃ اللیل)۔

ترجمہ:۔ اے اللہ میرے دل میں نور کر دے، میری آنکھوں میں نور کر دے، میرے کانوں میں نُور کر دے، میرے دائیں نُور کر دے، میرے بائیں نُور کر دے، میرے اوپر نُور کر دے، اور میرے نیچے نُور کر دے میرے آگے نُور کر دے، اور میرے پیچھے نُور کر دے، اور میرے لئے نُور بنا دے، بعض راویوں نے ان الفاظ کی ایزاد گی کی ہے:۔ میری زبان میں نُور کر دے، میرے اعصاب میں نُور کر دے، میرے گوشت، میرے خون، اور میرے بالوں، میری صورت ظاہری میں نُور کر دے، (بخاری، مسلم) صحیحین کی ایک روایت میں یہ

الفاظ بھی ہیں، میری جان یعنی ذات میں نور کر دے، اے اللہ میرے لئے نُور کی زیادتی فرما۔ مسلم شریف کی ایک دوسری روائیت کے الفاظ یہ بھی ہیں۔ اے اللہ مجھے نُور عطا فرما:۔ اس دُعا کے ملاحظہ کرنے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جسم مقدس کے ہر ہر عضو کیلئے نُور کی التجاء اور دُعا کی ہے۔ ہر ہر سمت اور ہر ہر جہت کیلئے نُور کی درخواست کی ہے:

"واجعل فی نفسی نورا واعظم لی نُورا واعطنی نورا" کے دُعائیہ کلمات تو بالکل واضح ہیں کہ اے اللہ میری ذات کو نُور بنا دے، اور میری نورانیت میں اضافہ اور زیادتی فرما: آپ ﷺ کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ اور آپ ﷺ کے ہر ہر عضو کو نور اور آپ ﷺ کی ذات مقدسہ کو نورالانوار بنایا۔۔ مسجد نبوی کے منبر سے حوض کوثر کو دیکھنا، موتہ کی جنگ کا لمحہ بہ لمحہ نقشہ پیش فرمانا۔ قتادہ بن نعمان کی شاخ کا نور اگلنا، قتادہ بن ملجان کے چہرے کا آئینہ نور بننا، حضرت بلال مکہ میں چل رہے تھے ان کے چلنے کی آواز آپ نے جنت میں سنی (مشکوۃ)، حضرت اسید بن حضر، اور عباد بن بشر کی لاٹھیوں اور سوٹیوں سے نور کا نکلنا اور راستہ دکھانا، اندھیرا دور کرنا اسی دعائے نور کے اثرات اور ثمرات ہیں، مافوق الفطرت چیزوں کا دیکھنا، اور مافوق الفطرت آوازوں کا سننا اسی دعائے نور کا کرشمہ ہے۔ حضرت ابی ذر سے مروی ہے : کہ آپ ﷺ نے فرمایا!"انی اری مالاترون واسمع مالا تسمعون" (مشکوۃ باب البکاء والخوف، ۴۵۷)

میں وہ کچھ سنتا ہوں جو تم نہیں سن سکتے، اور وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نور بنایا۔ اور تمام اعضائے مبارکہ کو نوری بنایا، جبریل کی نورانیت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے مگر آخری منزل اور آخری آماجگاہ سدرۃ المنتہی ہے، مگر دعائے نور کے مانگنے والے لامکان میں "دنی فتدلی، فکان قاب قوسین اوادنی" کی حالت میں اس نور سے ملاقی ہوئے جو سب نوروں کا خالق ومالک ہے، اب

فیصلہ ناظرین کے ہاتھ میں ہے کہ جو کچھ بیان ہوا یہ درست ہے یا مؤلف کا صرف یہ لکھ دینا کہ "آپ ﷺ فرشتہ اور نور نہیں بلکہ بشر اور انسان ہیں" (ص ۲۷)

مؤلف کے فہم وادراک پر تعجب ہے کہ اس انہوں نے آپ ﷺ کی نورانیت کو فرشتہ ہونے پر موقوف اور معلق رکھا ہے، نور اور بشر کو ایک دوسرے کی ضد، اور ان کے درمیان تغائر اور تضاد کی نسبت قائم کی ہے، ہم مؤلف کی معلومات میں اضافہ، اور ظاہر حق کے لئے یہ تحریر کرتے ہیں کہ، نور اور لا نور، بشر اور لا بشر، حجر اور لا حجر میں تضاد ہے، تضاد اور مغائرت اس وقت ہو گی جب ایک کا اطلاق اور حمل دوسرے پر نہ ہو سکے،، مثلاً روشنی اور اندھیرا، دن اور رات، زمین اور آسمان، عالم اور جاہل، ذرہ اور خوشید، قطرہ اور سمندر، انسان اور چار پائے، انسان اور پتھر، پستی اور بلندی، نابینا اور بینا وغیرہ یہ باہم متضاد ہیں، ان کے درمیان مغائرت پائی جاتی ہے، انسان اور فرشتے کے درمیان اختلاف ماہیت اور مادہ کے باوجود کوئی مغائرت نہیں، اس لئے فرشتہ زمین پر جب بھی آیا شکل انسانی میں آیا، اگر انسانیت اور ملکیت میں تضاد ہوتا تو ان کا یک جا اجتماع نہ ہوتا قرآن حکیم میں متعدد بار فرشتوں کا شکل انسانی میں آنا موجود ہے، ہاروت اور ماروت فرشتے تھے مگر شکل انسانی میں رہے اور انسانوں جیسے کام بھی کئے دیکھیئے تفسیر ابن کثیر، سورۃ مریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا" جبریل آمین روح یعنی نوری فرشتہ بھی ہیں اور عین اسی وقت بشرا سویا بھی ہیں، سورۃ ھود میں ہے کہ: جب فرشتے خوشخبری لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس صورتِ انسانی میں آئے ان کو مہمان سمجھ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گائے کے بھونے ہوئے گوشت سے ان کی تواضع کرنا چاہی تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ ہم فرشتے ہیں (پورا واقعہ سور ذاریات میں ہے) فرعونیوں کو غرق کرنے کے لئے جبریل علیہ السلام صورت انسانی میں ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اکثر دحیہ

کلبی کی صورت میں آتے تھے علامہ محمود الوسی نے نقل فرمایا:

"ان جبریل علیہ السلام فی وقت ظھورہ فی صورۃ دحیۃ الکلبی بین یدی المصطفی ﷺ لم یفارق سدرۃ المنتھی" (روح المعانی جلد اوّل، ص ۲۱۹)

ترجمہ: بے شک جبریل علیہ السلام دحیہ کلبی کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو پھر بھی سدرۃ المنتھیٰ پر موجود ہوتے۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ : میں نے غزوہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے دائیں بائیں دو مرد دیکھے **"علیھما ثیاب بیض یقاتلان کاشد القتال ما رائیتھما قبل ولا بعد یعنی جبریل و میکائیل"** (متفق علیہ)

ترجمہ: جو سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور بہت ہی سخت قتال کر رہے تھے انہیں اس دن سے پہلے
اور اس دن کے بعد کبھی نہیں دیکھا وہ جبریل اور میکائیل تھے۔

غزوۂ خندق کے موقعہ پر حضرت جبریل علیہ السلام ہتھیار پہن کر آئے اور اپنے سر کو میدان جنگ کے گرد و غبار سے صاف کر رہے تھے جبکہ حضور ﷺ اوزار جنگ اتار چکے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی آئیں نبی قریظہ کی طرف چلیں، آپ حضور ﷺ جبریل علیہ السلام کے ہمراہ نبی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے، بخاری کی روایت ہے:

"قال انس کانی انظر الی الغبار ساطعا فی سقاق نبی غنم مرکب جبریل علیہ السلام حین سار رسول اللہ ﷺ الی نبی قریظہ" (مشکوۃ ص، ۵۳۲) **ترجمہ:** حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کی معیت میں بنی قریظہ کے لشکریوں کا تعاقب کیا اور انھوں نے بھاگنا شروع کیا تو مجھے ان کے قدموں سے اڑنے والی غبار اس وقت بھی نظر آ رہی ہے۔ یہ واقعہ بخاری و مسلم میں موجود ہے۔

مندرجہ بالا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ثابت ہوا کہ فرشتے نوری ہونیکے باوجود صورت بشری میں ہی آتے رہے؟ فرشتوں کا صورت بشری میں آنا اور انسانی افعال کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ بشریت اور نورانیت کا یکجا اجتماع ممکن اور اموروا قعیہ میں سے ہے۔ بشریت اور نورانیت کو ایک دوسرے کے مقابل لانا، اور باہم اجتماع کو محال جاننا قرآن وحدیث سے لاعلمی کی دلیل ہے، مثلاً دن اور رات باہم مغائر اور مناقض ہیں کیا کسی آن اور کسی مقام پر ان کا اجتماع ممکن ہے؟ ذرہ خورشید کی مثال لے لیجئے، ذرہ ذرہ ہے خورشید نہیں، قطرہ قطرہ ہے سمندر نہیں، سیاہی سیاہی ہے سفیدی نہیں۔ علی ہذا القیاس۔ پس رسول اللہ ﷺ بھی ہیں اور بشر بھی بشریت نور کے مناقض نہیں،، فافہم

مؤلف کا یہ کہنا کہ، آپ چونکہ فرشتہ نہیں اس لئے نور نہیں، بلکہ آپ بشر اور انسان ہیں، غلط اور فرشتہ نہ ہونے سے آپ کے نور ہونے کا انکار کرنا ایک باطل استدلال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ خزانوں کا مالک بنایا ہے

اسی طرح مؤلف کا یہ کہنا کہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام خزانوں کا مالک اور مختار نہیں، بھی غلط ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ”وانی قد اعطیت مفاتیح خزائن الارض“ (متفق علیہ)

ترجمہ: آپ نے فرمایا! بے شک مجھے روئے زمین بلکہ تمام زمینوں کے پیٹ میں جو خزانے مدفون ہیں ان کی چابیاں دی گئی ہیں۔ مفاتیح جمع منتہی الجموع ہے، یہ خزائن کی طرف مضاف ہے، خزائن خود منتہی الجموع ہے اور الارض کی طرف مضاف ہے۔ مفاتیح کی اضافت نے معنی جمعیت سلب کر لئے اور جنسیت کا معنی پیدا کیا، جس سے مفتاح کے عدد کا تعین جاتا رہا اسی طرح خزائن جب الارض کی طرف مضاف ہوا تو بوجہ اضافت اس سے جمعیت کا معنی سلب ہو گیا اور

جنس کا معنیٰ متحقق ہوا۔ عدد کا تعین ممکن نہ رہا، پھر جمع کے دو صیغے، بالمقابل آ گئے، جنہوں نے تقسیم احاد بطرف احاد کا فائدہ دیا، ان قواعدہ نحویہ کو سامنے رکھنے کے بعد حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ زمین میں جس قدر، جس نوع اور جس جنس کے خزانے ہیں ان میں سے ہر ہر خزانہ کی چابی مجھے دی گئی ہے یعنی مجھے ان کا مالک بنا دیا گیا ہے ،اور جو خزانے عالم بالا میں ہیں مثلاً جنت ، حور وغلماں، حوض کوثر، قیامت کے دن لوائے حمد، یعنی حمد کا خزانہ، اذن شفاعت مقام محمود، مقام وسیلہ، وغیرہ اللہ تعالیٰ نے سب کا مجھے مالک بنا دیا ہے مختار کل کی بحث میں امام ابن حجر، ابن داوٗد، اور ملا علی قاری کے فرمودات ہم نقل کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

انا اعطینک الکوثر، اس کی تفسیر میں امام رازی نے فرمایا:

"ان المراد من الکوثر جمیع نعم اللہ علی محمد علیہ السلام ھو المنقول عن ابن عباس قال لہ بعضھم ان ناسا یزعمون انہ نھر فی الجنۃ فقال سعید النھر الذی من الخیر الکوثیر الذی اعطاء اللہ ایاہ" (کبیر ۳۲، ص ۱۲۸)

ترجمہ: کوثر سے مراد وہ تمام انعامات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو عطا فرمائے ہیں یہ قول حضرت عبداللہ ابن عباس کا ہے۔ ایک شخص نے آپ سے پوچھا اے ابن عباس لوگ کہتے ہیں کوثر اس نہر کا نام ہے جو جنت میں ہے تو حضرت سعید نے جواب دیا کہ جو خیرات کثیرہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہیں، نہر کوثر ان خیرات کثیرہ میں سے ایک ہے، امام رازی کی اس تفسیر اور حضرت سعید بن جبیر کے قول سے معلوم ہوا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو بے انتہا انعامات سے نوازا ہے جن کا تعلق عالم سفلی اور عالم علوی سے ہے، اور ان انعامات سے ایک انعام حوض کوثر، اور نہر کوثر بھی ہے، اندریں حالات مؤلف کا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خزانوں کے مالک نہیں غلط ہے، آیات و اخبار سے لاعلمی ہے۔ حضرت ربیعہ بن کو جنت عطا فرمائی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو خزانہء حفظ جو عالم غیب

میں تھا عطا فرمایا۔ کسی چیز کے دینے اور دوسرے کو مالک بنانے سے پہلے خود اس کا مالک ہونا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ غیوبات کا علم عطا فرمایا ہے

”مسئلہ علم غیب“

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۲۶ ، پر تحریر کیا ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر صراحۃً دال ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو کلی غیب نہ ذاتی طور پر دیا گیا ہے اور نہ عطائی طور پر، اور اس مختصر رسالہ میں قرآن مجید کی آیات میں سے صرف ایک آیت اور اس کی مستند تفسیر پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جو سمجھ دار منصف مزاج کی راہنمائی کے لئے کافی ہے اور وہ آیت یہ ہے: ''قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ و لا اعلم الغیب و لا اقول لکم انی ملک''

(انعام،۵۰،۶۰)

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں

فائدہ کے تحت لکھا کہ :۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم مختار کل نہیں

۲۔ کلی علم غیب آپ کو نہیں دیا گیا

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرشتہ اور نور نہیں، بلکہ بشر اور انسان ہیں،

اس کے بعد اس آیت کا شان نزول ذکر کیا، کہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو آپ ہمیں آئندہ کے حالات کی خبر دیں، تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ۔مؤلف نے تفسیر کبیر ص ۲۳۰ جلد ۱۲، سے عربی عبارت بھی نقل کی ہے

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ مؤلف نے آیہء کریمہ کا صرف ترجمہ کیا اور من پسند نتیجہ اخذ کیا سیاق دیکھا نہ سباق ''امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ :

''اعلم ان هذا من بقية الكلام على قوله (لو لا انزل عليه آية من ربه) فقال الله تعالى قل لهؤلاء الاقوام انما بعثت مبشرا و منذرا و ليس لي ان اتحكم على الله تعالى، و امره الله تعالى ان ينفي عن نفسه امورا ثلاثة اولها قوله لا اقول لكم عندي خزائن الله، فاعلم ان القوم كانوا يقولون ان كنت رسولا من عندالله فاطلب من الله حتى يوسع علينا منافع الدنيا و خيراتها ويفتح علينا ابواب سعادتها فقال تعالى قل لهم اني لا اقول لكم عندي خزائن الله فهو تعالیٰ يؤتي الملك من يشاء و يعز من يشاء و يذل من يشاء بيده الخير لا بيدي، و ثانيها قوله (و لا اعلم الغيب) و معناه ان القوم كانوا يقولون ان كنت رسولا من عندالله فلا بد ان تخبرنا عما يقع في المستقبل من المصالح و المضار، حتى نستعد لتحصيل تلك المصالح و لدفع تلك المضار، فقال تعالى قل اني لا اعلم الغيب فكيف تطلبون مني هذه المطالب }

آگے امام ان دونوں امور کا خلاصہ بیان فرماتے ہوئے نقل کرتے ہیں کہ :

''والحاصل انهم كانوا في المقام الاول يطلبون منه الاموال الكثيرة و الخيرات الواسعة و في المقام الثاني كانوا يطلبون منه الاخبار عن الغيوب ليتوسلوا بمعرفة تلك الغيوب الى الفوز بالمنافع و الاجتناب عن المضار و المفاسد و ثالثها قوله (و لا اقول لكم اني ملك) و معناه ان القوم كانوا يقولون (مالهذا الرسول ياكل

الطعام ویمشی فی الاسواق ویتزوج ویخالط الناس فقال تعالیٰ قل لھم انی لست من الملائکۃ"(کبیر ج ، ۱۲، ص ۱۳۰)

ترجمہ: تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ "**قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ الایۃ**" آیہ کریمہ "**لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ**" کا بقیہ حصہ یعنی تتمہ کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا: کہ ان مشرکین سے یہ کہہ دیں کہ بے شک میں جنت کی خوشخبری سنانے والا اور دوزخ سے ڈرانے والا ہوں۔ یعنی میں رسول ہوں، میری مجال ہی نہیں کہ کہ میں اللہ تعالیٰ پر حکم چلاؤں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا! کہ آپ اپنی ذات سے مندرجہ ذیل ان تین امور کی نفی کا اعلان کردیں۔ پہلا امر یہ کہ میرے پاس اللہ کے خزانے نہیں، یعنی میں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک نہیں، یہ اس لئے فرمایا کہ مشرکین کہتے تھے کہ اگر تو واقعی اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دنیا کی ہر قسم کی بھلائی اور بہتری مانگ، اللہ تعالیٰ ہم پر سعادتوں کے دروازے کھول دے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ (میں مبشر اور نذیر ہوں) میں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ مالک اور مختار ہے وہ اپنی مرضی سے جس کو چاہے بادشاہت عطا فرماتا ہے، اور جس کو چاہے ذلت دیتا ہے، اچھائی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرے ہاتھ میں نہیں، اور دوسرا امر (**ولا اعلم الغیب**) یہ اس لیے فرمایا کہ اگر تو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہے تو مستقبل میں آنے والے فوائد اور نقصانات کی خبر دے تا کہ ان سے بچنے کے لئے تیاری کریں کوئی لائحہ عمل مرتب کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ کہہ دیں کہ میں غیب نہیں جانتا، تم مجھ سے یہ مطالبات کیوں کرتے ہو؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ سے **اموال کثیرہ** "یعنی بے شمار دنیاوی مال واسباب" اور **وسیع البنیاد** اچھائیوں کا مطالبہ کرتے تھے تو اس کے جواب میں فرمایا میں اللہ کے خزانوں کا

مالک نہیں ہوں۔

اور دوسرے مقام کے ”لااعلم الغیب“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ :۔ مشرکین آپ ﷺ سے مطالبہ کرتے کہ اگر آپ واقعی اللہ کے فرستادہ رسول ہیں تو آئندہ آنے والے فوائد اور نقصانات ہمیں بتائیے تا کہ ان غیوبات کے توسل سے فوائد حاصل کریں اور نقصانات سے بچیں۔

اور تیسرا امر، یعنی ولا اقول لکم انی ملک ، اس لئے فرمایا کہ مشرکین کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا، بازاروں میں خرید وفروخت کرتا، لوگوں سے میل جول رکھتا، اور شادیاں کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ آپ کہہ دیں کہ میں فرشتہ نہیں کہ کھاؤں نہ پیئوں، لوگوں سے میل ملاپ رکھوں نہ بیاہ شادی کروں، یہ امور فرشتہ کے لئے ممنوع ہیں، اور میں فرشتوں میں سے نہیں ہوں تا کہ ان کا کرنا میرے لئے ممنوع ہو۔ مندرجہ بالا امام موصوف کی تفسیر اور بیان فرمودہ وجوہات سے معلوم ہوا کہ کفار اور مشرکین کا یہ نظریہ تھا کہ رسول فرشتہ ہی ہوسکتا ہے جو نہ کھائے پیئے، میل ملاپ رکھے نہ کاروبار حیات کرے، شادی بیاہ بھی نہ کرے، تو اس کا رد فرمایا رسول فرشتہ نہیں ہوتا انسان ہوتا ہے، اخبار مستقبلہ کا مطالبہ کیا گیا فرمایا میں غیوب نہیں جانتا کہ تمہیں آنے والے خطرات اور نقصانات کی تفصیل بتاؤں اور ان سے بچنے کی تدابیر سے بھی آگاہ فرماؤں، ذاتی طور پر امور غیبیہ اللہ ہی جانتا ہے، تم مجھ سے بے پناہ مال ودولت کا مطالبہ کرتے ، اور مال ومتاع کی فراوانی چاہتے ہو، یہ اللہ ہی کے دست قدرت میں ہے، وہ جس کو چاہے ملک ودولت اور عزت سے نوازتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے ذلت اور خواری سے ہمکنار فرماتا ہے ۔یہی وہ نچوڑ ہے جو امام موصوف نے مندرجہ بالا عبارات میں تحریر فرمایا ہے، آیات قرآنیہ کی تفسیر ان الفاظ سے کرنا کہ آپ ﷺ مختار کل نہیں فرشتہ اور نور نہیں بشر ہیں، اللہ کے خزانوں کے مالک ومختار نہیں، تمام غیبوں کو نہیں جانتے ،، غلط ہے اور امام موصوف کی تفسیر کے برعکس اور متناقض ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں:۔

”واعلم ان الناس اختلفوا فی انه ما الفائدة فی ذکر نفی ھذہ الامور الثلاثة“

ترجمہ:۔ معلوم ہونا چاہیے کہ مفسرین نے اس بات میں باہم اختلاف کیا ہے کہ ان امور ثلثہ کی نفی کا کیا فائدہ اور کیا مقصد ہے؟ فرماتے ہیں:۔

{(القول الاول) ان المراد منه ان یظهر الرسول من نفسه التواضع لله، والخضوع له والاعتراف بعبودیته حتی لا یعتقد فیه مثل اعتقاد النصاری فی المسیح علیه السلام }

ترجمہ:۔ پہلا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ امور ثلثہ کہلوا کر رسول اللہ ﷺ سے عاجزی، انکساری، تواضع اور عبدیت کا اظہار کروایا ہے تا کہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ سمجھ لیں، یعنی تینوں امور کی نفی کا مقصد، تواضع، عاجزی، اور عبدیت کا اظہار اور اعتراف ہے۔

{القول الثانی: ان القوم کانوا یقرحون منه اظهار المعجزات القاهرة القویه، کقولهم لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا الی آخر الایة فقال تعالی فی اخر الایه (قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا؟ لا ادعی الا الرسالة والنبوة واما هذه الامور التی طلبتموها فلا یمکن تحصیلها الا بقدرة الله، وکان المقصورة من هذا الکلام اظهار العجز، والضعف وانه لا یستقل بتحصیل هذه المعجزات التی طلبوها}

ترجمہ:۔ مشرکین رسول اللہ ﷺ سے ایسے معجزات طلب کرتے تھے جن کا ظہور وصدور بہت بڑی قوت اور طاقت کا مرہون منت تھا، مثلاً ان کا یہ مطالبہ کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ زمین سے پانی کا چشمہ نہ جاری کر دیں، اور دیگر مطالبات جن کا اسی آیت میں ذکر موجود ہے، اسی آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا }

یعنی میرا دعوی صرف اتنا ہے کہ میں اللہ کا نبی اور رسول ہوں یہ امور یعنی یہ بڑے بڑے کام اللہ کی قدرت سے ہی ان کا حصول اور صدور ممکن ہے، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے یہ کلام، (تین امور کی نفی) عاجزی، انکساری، کے طور پر فرمائی ہے۔ کیونکہ یہ بڑے بڑے معجزات جو مشرکین نے طلب کیے تھے ان کے اظہار میں آپ مستقل بالذات نہ تھے،

والقول الثالث: ان المراد من قوله لا اقول لکم عندی خزائن اللہ معناہ انی لا ادعی کونی موصوفا بالقدرة الائقة باللہ تعالی وبمجموع ھذین الکلامین جعل انه لا یدعی الالوھیة}

ترجمہ:۔ ان امور ثلثہ کی نفی میں مفسرین کا تیسرا قول یہ ہے کہ **لا اقول لکم عندی خزائن اللہ** سے مراد یہ ہے کہ میں اس قدرت کے رکھنے کا دعویدار نہیں جو اللہ تعالی کی شایان شان ہے ۔اور نہ ہی میرا یہ دعوی ہے کہ میں اس علم سے موصوف (مالک ہوں) ہوں جو علم خاصہء باری تعالی ہے، ہر دو کلام کے مجموعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں الوہیت یعنی اللہ ہونے کا مدعی نہیں۔

امام فرماتے ہیں **:ثم قال "ولا اقول لکم انی ملک" وذالک لانه لیس بعد الالھیة درجة اعلی حالا من الملئکة ولکنی ادعی الرسالة، وھذا منصب لا یمتنع حصوله للبشر، فکیف اطبقتم علی استنکار قولی ودفع دعوی"**

(کبیر جلد ۲ ص ۲۳۱)

ترجمہ: پھر آپ نے فرمایا میں نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ اس لئے فرمایا کہ الوہیت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے بعد فرشتوں کا درجہ بلند ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ میں الہ ہونے کا دعوی کرتا ہوں نہ فرشتہ ہونے کا، میرا دعوی رسالت ہے اور یہ ایک ایسا منصب ہے جس کا حصول بشر

کے لیے ممنوع نہیں، تو پھر تم اے مشرکین اس بشریت کو میرے دعوی رسالت اور اعلان توحید پر منطبق کرتے ہوئے انکار کیوں کرتے ہو؟

یہی امام رازی اسی آیت کے تحت نقل فرماتے ہیں:

"ولقائل ان یقول یتحمل ان یکون المراد ولا اقول لکم انی ملک وفی کثرۃ العلوم وشدۃ القدرۃ، والذین یدل علی صحۃ ھذا الاحتمال وجوہ، الاول ھو ان الکفار طالبوہ بالامور العظیمۃ نحو صعود السماء ونقل الجبال واحضار الاموال العظیمۃ وھذہ الامور لا یمکن تحصیلھا الا بالعلوم الکثیرہ والقدرۃ الشدیدۃ}

ترجمہ: کہنے والا یوں بھی کہہ سکتا ہے کہ "ولا اقول لکم انی ملک" سے مراد یہ ہے کہ میں فرشتے کی طرح کثرت علوم کا جامع اور اس جیسی قوت شدیدہ کا مالک نہیں ہوں۔ درج ذیل وجوہات کی روشنی میں یہ احتمال صحیح ہے۔

الاول) کفار آپ ﷺ سے بڑے بڑے امور کا مطالبہ کرتے تھے، جیسے آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور وہاں سے کتاب لائیں ہم خود اس کو پڑھیں، مکہ کے پہاڑوں کو کہیں اور منتقل کر دیں، بڑے بڑے خزانے لا حاضر کریں یہ وہ کام تھے۔ علوم کثیرہ، اور قدرت شدیدہ کے بغیر جن کا حصول اور وقوع ناممکن تھا۔ اس لیے آپ نے فرمایا: میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتے کی طرح علوم کثیرہ اور قوت شدیدہ کا مالک ہوں۔

(الثانی) ان قولہ ولا اعلم الغیب یدل علی اعترافہ بانہ غیر عالم بکل المعلومات}

ترجمہ:۔ "ولا اعلم الغیب" آپ کا فرمان دلالت کرتا ہے کہ یہ جملہ کہہ کر آپ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ میں تمام معلومات کا عالم نہیں ہوں۔ **"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ، ھذا یدل علی اعترافہ بانہ غیر قادر علی کل المقدورات، اور 'قل لا اقول لکم عندی**

خزائن اللہ'' یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ آپ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ میں تمام مقدروات پر قادر نہیں ہوں۔

ترجمہ:۔ یعنی میں ہر ہر معلوم کا عالم نہیں ہوں۔ یہ اللہ ہی کی شان ہے۔ موجود بھی معلوم اور اللہ کے نزدیک معدوم بھی معلوم وجود وعدم اللہ کے نزدیک علم میں یکساں ہیں۔ اسی طرح اللہ ہر ہر چیز پر قادر ہے۔ موجود ہو یا معدوم ''ولا اقول لکم انی ملک'' کے تحت امام نے فرمایا :''کما لا ادعی قدرۃ مثل قدرۃ الملک ولا علما مثل علومھم''

ترجمہ: جس طرح میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میں تمام مقدورات پر قادر ہوں، اور تمام معلومات کا علم رکھتا ہوں، اسی طرح میں یہ دعوی بھی نہیں کرتا کہ مجھ میں فرشتہ ہونے کی نفی اور اعتراف بشریت نہیں فرمایا بلکہ فرمایا میں فرشتہ اور حسی طور پر قوت شدیدہ اور فرشتوں جیسے علوم کثیرہ نہیں رکھتا،،

اس آیت سے مؤلف کا یہ ثابت کرنا کہ میں بشر ہوں فرشتہ نہیں، غلط ہے اسی طرح آپ نے فرمایا میں کل المعلومات اور کل مقدورات کا عالم نہیں، کیونکہ یہ خاصہء باری تعالیٰ ہے میں خدا ہونے کا مدعی نہیں، کہ تم مجھ سے یہ مطالبات کرو، امام موصوف آگے فرماتے ہیں کہ آپ کا مقصدُو لا اقول لکم انی'' سے یہ نہیں کہ میری اور فرشتوں کی صفات میں کوئی قدرے مشترک نہیں اور وہ الگ الگ ہیں۔''ولا دلالہ فیہ علی وقوع التفاوت فی کل الصفات فان عدم الاستواء فی الکل غیر وحصول الاختلاف فی الکل غیر''(کبیر جز ۲، ص ۲۲۳)

مفسر کبیر کی توضیح صاف بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صفات علیا، اور فرشتوں کی صفات میں من کل الوجوہ تفاوت اور تضاد نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات میں مساوات کا نہ پایا جانا اور بات ہے اور تمام صفات میں اختلاف کا پایا جانا اور بات ہے، بہر حال مذکورہ بالا بحث اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صفات مبارکہ اور فرشتوں کی صفات میں اختلاف ہے تضاد نہیں

،اگر آپ کی جمیع صفات صفات ملائکہ کے متضاد ہوتیں تو یہ کہنا درست ہوتا کہ میں فرشتہ نہیں، نوری نہیں، بلکہ بشر ہوں'' اسی طرح و لا اعلم الغیب سے یہ ثابت کرنا کہ میں تمام غیبوں کو نہیں جانتا غلط ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جمیع معلومات یعنی جمیع علوم کو نہیں جانتا، مفسر کبیر نے کل المقدورات ، اورکل المعلومات کے الفاظ تحریر کیے ہیں، مقدورات ، اور معلومات جمع مؤنث سالم ہیں ان پر الف ولام داخل ہیں قاعدہ کے مطابق جمع پر الف ولام داخل ہوکراس کی جمعیت کے معنی کو ساقط کر کے استغراق کا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ ہر فرد معلوم اور ہر فرد مقدور کو جاننا خاصہء باری تعالیٰ ہے اس لیے بامر رب تعالیٰ آپ نے ان دونوں کی اپنی ذات سے نفی فرمادی۔ اور واضح فرمایا کہ میں الہ ہونے کا دعوی تو نہیں کرتا کہ تمہارے ان مطالبات کو پورا کروں اور تمہارے ان سوالات کا جواب دوں؟ اسی طرح اس آیہ کریمہ سے یہ ثابت کرنا کہ آپ مختار کل نہیں غلط ہے، آیت کا شان نزول وہی اور آیت کا مدلول وہی مصداق وہی ہے جو مفسر کبیر نے بیان کیا اور ہمیں اس کے نقل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے ۔حاصل کلام یہ ہے کہ آیہء مقدسہ ''**قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ و لا اعلم الغیب، و لا اقول لکم انی ملک**'' تین امور پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ نے ان امور کی نفی کا حکم دے کر ارشاد فرمایا۔ اے نبی آپ بطور عاجزی، انکساری، اور ضعف قوت کا اعلان کردیں اور یہ بتادیں کہ میں خدا نہیں اس کا بھیجا ہوں رسول ہوں۔ تا کہ لوگ آپ کو بھی عیسائیوں کی طرح خدا کا بیٹا ہونا تصور نہ کرلیں۔

آئیے دیکھیں کہ غیب کیا ہے؟ کیا نبی کریم ﷺ غیب جانتے ہیں یا نہیں؟

غیب مصدر ہے واضح ہو کہ: اس کے لغوی معنی پوشیدہ اور چھپنے کے ہیں، علامہ بیضاوی نے غیب کا اصطلاحی معنی نقل کرتے ہوئے فرمایا: ''**الخفی الذی لا یدرکہ الحس و لا یقتضیہ بداھۃ العقل**

ترجمہ: غیب وہ امر خفی (پوشیدہ) ہے حواس خمسہ جس کا ادراک نہ کر سکیں، اور عقلی پرواز کو بھی اس تک رسائی نہ ہو۔ امام رازی نے فرمایا:

"فان قیل افتقولون العبد یعلم الغیب ام لا، قلنا قد بینا ان الغیب فینقسم الی ما علیہ دلیل و الی ما لا دلیل علیہ اما الذی لا دلیل علیہ فھو سبحانہ و تعالیٰ العالم بہ لا غیرہ و اما الذی علیہ دلیل فلا یمتنع ان تقول تعلم من الغیب ما لنا علیہ دلیل" (کبیر جز ۲، ص ۲۸)

ترجمہ: اگر یہ سوال کیا جائے کہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ بندہ بھی غیب جانتا ہے یا نہیں؟ تو ہم کہیں گے ہم بیان کر چکے ہیں کہ غیب دو قسم ہے، (۱) جس پر کوئی دلیل قائم ہو (۲) جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ جس غیب پر کوئی دلیل قائم نہیں یعنی جس غیب پر کوئی دلیل شرعی قائم نہیں اللہ سبحانہ ہی اس کا عالم ہے ۔ امام رازی کے فرمان کے مطابق غیب کی دو قسمیں ہوئیں۔ جس پر دلیل سمعی، شرعی قائم ہو جیسے اللہ کی ذات، صفات، فرشتے جنت، دوزخ، حساب کتاب، قیامت، ثواب وعقاب وغیرہ کا علم غیب ہے ہر کلمہ گو مسلمان جانتا اور ان پر ایمان رکھتا ہے، اور ان پر ایمان رکھنا تکمیل ایمان ہے، سوال یہ ہے کہ یہ امور، اشیاء غائبہ ہیں، یہ بعض غیب کے زمرہ میں آتے ہیں یا کل کے؟ ابتداء آفرینش سے لے کر قیام قیامت تک کے امور ممکنہ اور اشیاء کا علم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دیا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **"وعلم آدم الاسماء کلھا"**

امام رازی نے اس کی تفسیر کرتے فرمایا: **ان المراد اسماء کل ما خلق اللہ من اجناس المحدثات من جمیع اللغات المختلفۃ التی یتکلم بھا ولد آدم الیوم"**

ترجمہ : اس سے مراد تمام مخلوقات کی ہر ہر جنس کے نام اور مختلف قسم کی لغات ہیں، اولاد آدم آج تک جن جن زبانوں میں کلام کرتی ہے، امام موصوف نے **اسماء کل ما خلق اللہ من**

اجناس المحدثات من جمیع اللغات المختلیفة“ کے خصوصی الفاظ تحریر فرما کر مسئلہ ہی حل کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کل مخلوقات کے کل اسماء اور کل لغات کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دیا۔ کیا یہ علم کلی نہیں؟ بلکہ فرشتے بھی علم کلی، یعنی علم ما کان و ما یکون جانتے ہیں، امام رازی نے فرمایا: ”لما کتب القلم فی اللوح ماھو کائن الی یوم القیامة فلعلھم طالعوا اللوح فعرفوا ذالک“ (کبیر جز ۷۰ ا، ۲)

ترجمہ: جب قلم نے لوح محفوظ میں قیامت تک ہونے والے تمام حالات، واقعات اور امور لکھے اور فرشتوں نے لوح محفوظ کا مطالعہ کیا تو کہا کہ یہ انسان تو پیدا ہو رہا ہے مگر اس کی اولاد زمین کو فتنہ وفساد، خون ریزی اور دیگر اخلاقی برائیوں سے بھر دے گی۔ معلوم ہوا کہ ”ما کان و مایکون“ لوح محفوظ میں درج ہے، ملائکہ نے اس کو پڑھا اور پھر معترض ہوئے۔ مؤلف کا یہ کہنا کہ کلی علم غیب آپ کو نہیں دیا گیا، غلط ہے، اگر کل المخلوقات، کل المحدثات کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور علم ”ما کان و مایکون“ کا علم فرشتوں کو حاصل ہے۔ جیسا کہ امام رازی نے نقل فرمایا ہے: ”انہ تعالیٰ انما کتب ھذہ الامور فی اللوح المحفوظ لتقف الملائکة علی نفاذ علم اللہ تعالیٰ فی المعلومات“

ترجمہ: قیامت تک ہونے والے تمام امور، لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیئے ہیں تا کہ لوح محفوظ پر مأ مور فرشتوں کو علم ہو کہ اللہ تعالیٰ کا علم معلومات پر محیط ہے۔ (کبیر جز، ۱۳، ۱۱) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم کلی بمعنی جمیع المغیبات، اور جمیع الکائنات کیوں نہیں دیا گیا؟ اور یہ کیوں ممنوع اور شرک ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ۔ ”قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقاما فاخبر ناعن بدء الخلق حتی دخل اھل الجنة منازلھم و اھل النار منازلھم حفظ ذالک من حفظه و نسیه من نسیه“ (رواہ البخاری، مشکوٰة، باب بدء الخلق)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے ہم میں ایک جگہ قیام فرمایا: ہمیں ابتدائے آفرینش سے لے کر جنتیوں کے جنت میں جانے، اپنی اپنی نشست پر فائز ہونے اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے اور اپنی اپنی منزلوں میں پہنچنے تک کی خبر دی، جس نے یاد رکھا اس نے یاد رکھا، جو بھول گیا وہ بھول گیا۔

یہ خبر دو قسم کی تھی: (۱) ابتدائے افرینش کی، کہ ابتداء مخلوق کیسے پیدا کی گئی، (۲) دوزخیوں کے دخول جہنم اور جنتیوں کے دخول جنت تک کے حالات و واقعات کی، پہلی خبر ما کان اور دوسری خبر ما یکون کی ہے۔ یہ دوسری قسم کی خبر مستلزم ہے علم ما کان و ما یکون کو پس رسول اللہ ﷺ کو ما کان و ما یکون کا علم تھا اسی لیے خبر دی اگر نہ ہوتا تو آپ کیسے خبر دیتے یہی علم کلی ہے۔ دوسری حدیث: **"عن عمرو بن اخطب الانصاری قال صلی بنا رسول اللہ ﷺ یوما الفجر و صعد علی المنبر فخطبنا حتی حضرت الظھر فنزل فصلی ثم صعد المنبر فخطبنا حتی حضرت العصر ثم نزل فصلی بھم ثم صعد المنبر حتی غربت الشمس فاخبرنا بما ھو کائن الی یوم القیامۃ قال فاعلمنا احفظنا" (رواہ مسلم ، مشکوۃ، باب المعجزات)**

ترجمہ: حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فجر کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہو کر ہم سے خطاب فرمایا، اور یہ خطاب نماز ظہر تک جاری رہا، پھر آپ نے ہمیں نماز ظہر پڑھائی، پھر منبر پر جلوہ فرما ہوئے پھر خطاب فرمایا، یہاں تک کہ نماز عصر کا وقت آ گیا آپ نے نماز عصر پڑھائی پھر آپ رونق افزائے منبر ہوئے خطاب فرمایا، جو غروب آفتاب تک جاری رہا، پس آپ نے ہمیں قیامت تک ہونے والے تمام حالات اور تمام واقعات کی خبر دی راوی نے کہا ہم میں سب سے بڑا

عالم وہ ہے جس نے زیادہ محفوظ کرلیا۔

حضرت عبد الرحمن بن عائش سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب عزوجل کو اسکی شان کے مطابق بہت ہی اچھی صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا ! بتاؤ آسمانی فرشتے کس بات مین مباحثہ کرر ہے ہیں؟ میں نے عرض کیا اے اللہ! تو سب سے زیادہ اور بہتر جانتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھا جسکی ٹھنڈک (یعنی فیض ربانی) میں نے اپنے سینے میں محسوس کی ،فعلت مافی السموت والارض الحدیث ،(ترمذی ، دارمی ،مشکوۃ) پھر مجھے زمین وآسمان کی ہر چیز کا علم ہو گیا۔ اس پر امام ابن حجر نے فرمایا۔

ای جمیع الکائنات التی فی السموت بل و ما فوقھا کما یستفاد من قصۃ المراج ای جمیع مافی الارضین السبع بل و ماتحتھا کما افادہ اخبارہ علیہ السلام عن الثور و الحوت الذین علیھم الارضون کُلھا۔ (مرقاۃ۔ جلد۔ ۲۔ ۲۱۰)

ترجمہ:۔ **فعلمت مافی السموات والارض** کی تفسیر میں امام ابن حجر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کو ساری کائنات جو آسمانوں میں ہے بلکہ اُن سے بھی جو اُوپر ہے اس کا علم ہو گیا جیسا کہ واقعہ معراج سے مستفاد ہے، اور آپ کو ساتوں زمینوں بلکہ اُن سے بھی جو نیچے مخلوق ہے مثلاً بیل اور مچھلی جن پر ساتوں زمینوں کا قیام ہے ان کا بھی علم ہو گیا، کیا یہ علم کُلی نہیں؟ خود قرآن نے اپنی شان میں فرمایا تبیانا لکل شی، کل شی سے کیا مراد ہے؟ کلی یا جُزی یا دونوں میں سے ایک بھی نہیں؟ لفظ کُلی کو مولف برداشت نہیں کر سکے، واضح ہو کہ لفظ کُلی اور جُزی امور اعتباریہ ہیں، منطق اور معقول والوں کی خود تراشیدہ اصطلاحات اور عنوانات ہیں ان کے نزدیک کلی کی پانچ قسمیں ہیں۔ نوع، فصل، خاصہ، عرض عام، اور جنس، اور ان میں سے کوئی ایک بھی بدوں وجود افراد خارج میں موجود ہوتی ہے اور نہ پایا جانا ممکن ہے، لیکن علم باری تعالیٰ، اللہ تعالیٰ

کی صفت ذاتی ہے۔ باری تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سات ہیں

:(۱)علم(۲)قدرت(۳)سمع(۴)بصر(۵)ارادہ(۶)حیات(۷) کلام، یہ صفات سبعہ اللہ تعالیٰ کی ازلیہ، ابدیہ، اورسرمدیہ ہیں۔

حضور علیہ السلام کا علم کلی ہے جزی نہیں

مذکورہ بالا صفات سبعہ مخلوقات کی خلقت اور ایجاد کے وقت پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اظہار ہوتا ہے،لیکن کلی اور جزی کا تعلق مخلوقات، اور عوارضات کی موجودگی سے ہے اگر کلی کا کوئی بھی فرد خارج میں موجود نہ ہو، نہ پایا جائے تو کلی کا وجود متحقق نہ ہوگا،لیکن علم باری تعالیٰ کائنات کے ذرے ذرے کو اس وقت بھی شامل اور محیط تھا جب کائنات ارضیہ اور سماویہ کے کسی بھی فرد کا وجود نہ تھا، اور جب کائنات کا وجود اور تصور نہ ہوگا اس وقت بھی اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک علیم ،بصیر، قادر، اور سمیع ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ علم باری تعالیٰ کلی ہے تو اس کا تحقق اور وجود، وجود افراد پر موقوف ہوگا، افراد حادث ہیں، تو لازم آئے گا علم باری تعالیٰ حادث ہو یہ محال شرعی ہے ،(۲)علم باری تعالیٰ متناہی ہوگا، ہر متناہی شی حادث ہے پھر علم باری تعالیٰ کا حادث ہونا لازم آئے گا، کیوں علم: ''**صفة نفسانية بها نيكشف المعلوم فاذا قامت هذه الصفة بالنفس فقد تحقق حصو لها'' و لفظ العلم يطلق عليهما**'' جب انکشاف معلوم کا نام علم ہے تو عدم معلوم عدم انکشاف کو مستلزم ہے اس صورت میں جہل باری تعالیٰ لازم آتا ہے یہ محال شرعی ہے ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا علم جز کلی سے پاک ہے غیر متناہی بالفعل ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم کو کلی مانتے ہیں انہیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم جزی کلی کے تصور اور اعتبارات سے پاک ہے کلی ایک متناہی اور محدود ہے، مخلوقات کا علم حادث اور

متناہی ہے، عطائی ہے، اللہ کی عطا پر موقوف ہے، وہ جس کو چاہے دے، اور جتنا چاہے اتنا ہی دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بے حساب علوم غیبیہ عطا فرمائے لیکن وہ سب متناہی اور عطائی ہیں، چنانچہ ملا علی فرماتے ہیں:

"اخبارہ علیہ السلام بمغیبات لا تحصٰی"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لاتعداد امور غیبیہ کی خبریں دی ہیں، جب آپ کی اونٹنی گم ہوئی تو منافقین نے طعن کیا کہ محمد آسمان کی خبریں دیتے ہیں لیکن وہ نہیں بتا سکتے ان کی اونٹنی کہاں ہے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! میں وہی جانتا ہوں جو اللہ مجھے بتاتا ہے میرے رب نے مجھے بتا دیا ہے

کہ "وھی فی موضع کذا و کذا حبسھا شجرۃ بحظامھا فذھبوا فوجدوھا کما اخبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" (مرقات جلد ۲، ص ۲۷۰)

ترجمہ: میری اونٹنی فلاں مقام پر ہے اس کی نکیل ایک درخت کے ساتھ اٹکی ہوئی ہے۔ صحابہ گئے، اونٹنی کو اس طرح پایا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی تھی۔

اسرافیل علیہ السلام کا علم کلی ہے، امام رازی نے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل علیہ السلام کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آسمان کا ایک اُفق کھلا ایک فرشتہ نکلا جو زمین پر اترا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے، فرماتا ہے اور آپ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ آپ بادشاہ بننا پسند کرتے ہیں یا بنیء عبد؟ جبریل کی مشاورت سے آپ نے تواضع کے طور پر فرمایا کہ میں بنیء عبد بننا پسند کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل سے پوچھا کہ یہ کون سا فرشتہ ہے تو جبریل نے عرض کیا یہ اسرافیل ہیں۔ وقت پیدائش سے لے کر اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں اور آنکھ تک نہ جھپکی اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھا ہے:

”بين الرب و بينه سبعون نو را امامنها نو ريدنو منه الا احترق و بين يديه اللوح المحفو ظ فاذا اذن الله له في شيء من السماء او من الارض ارتفع ذالک اللوح بقرب جبينه فينظر فيه فان کان من عملي امر ني به و ان کان من عمل ميکائيل امر به و ان کان من عمل ملک الموت امر به الحديث“

(کبير جز ۲، ص ۱۶۴)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اوراس کے درمیان نور کے ستر (۷۰) پردے حائل ہیں اوراگرآگے بڑھے توجل جائے جب اللہ تعالیٰ اس کوکسی آسمانی یاارضی امر کے متعلق حکم فرماتا ہے اپنے سامنے رکھی ہوئی لوح محفوظ کواپنی پیشانی کے قریب کرکے دیکھتا ہےااوراگروہ امرمیرے متعلق ہوتواس کا مجھے حکم دیتا ہے۔اوراگروہ کام میکائیل کا ہوتواس کوحکم دیتا ہے۔اوراگرملک الموت سے تعلق رکھتا ہوتواس کوحکم دیتا ہے۔لوح محفوظ میں ماکان و مایکون کے علوم ہیں۔اوروہ لوح محفوظ ہرلمحہ اسرافیل کے زیرِ نظر ہے۔لوح محفوظ میں علوم کائنات اوراحوال موجودات اوراوصاف حادثات ہیں۔یہ متناہی علوم اورمعلومات کا سلسلہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا علم محدود، معدود، اس کائنات کے وجودتک محصورنہیں بلکہ علوم باری تعالیٰ کی کوئی انتہانہیں،علوم باری تعالیٰ کاعلم اللہ تعالیٰ کےسواکسی مخلوق کونہیں۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”ولا يحيطون بشيء من علمه“، عالم الغيب و الشهادة“

خلاصہ یہ ہے کہ علم کا کلی ہونااوراللہ کے لیےثابت کرناشان خداوندی کےخلاف ہے۔یہ مخلوق کی صفت ہے۔امراعتباری فرضی ہے امکانی ہے اورمحدودوحادث ہے اللہ تعالیٰ کاعلم غیر متناہی بالفعل ہے،مخلوق کاعلم ممکنات،موجودات کاعلم ہے ذات باری تعالیٰ کاعلم اس سے وراء الوریٰ ہے۔مخلوق کاعلم اللہ تعالیٰ کی عطاءاوررضاہے اللہ تعالیٰ کاعلم ذاتی ، ازلی ، ابدی ،اور سرمدی ہے۔جیسا کہ ہم پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ کے ضمن میں ذکرکرچکے ہیں۔اگربقول

مؤلف یہ کہا جائے کہ کلی علم غیب آپ کو نہیں دیا گیا تو جن احادیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ابتدائے آفرینش سے لے کر لوگوں کے جنت اور دوزخ کی منازل تک پہنچنے کی تفصیل بیان فرمائی ہے ان کا کیا جواب ہوگا؟ پھر اللہ کے فرمان ”تفصیل الکتب لا ریب فیہ“ یعنی لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے یہ اس کی تفصیل ہے، اور پھر یہ تفصیل اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو سکھائی اور بتائی۔ ”الرحمن ★علم القرآن★خلق الانسان ★علمه البیان ★ان آیات کا معنی کیا ہوگا ؟”تبیانالکل شیء“ کی کس طرح تاویل کی جائے گی ؟امام رازی کے اس قول ”ان المرادکل ماخلق الله من اجناس المحدثات من جمیع اللغات المختلفة“ (کبیر جز ۲، ص ۱۷٦)

ترجمہ: علم آدم الاسماء کلها کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل مخلوق کی ہر ہر جنس کا نام جو مختلف زبانوں میں لیا جائیگا وہ بھی آدم کو سکھایا‘ کی تردید کون کرے گا؟ وعلمک مالم تکن تعلم“ کے مقابل کون سی آیت ہے؟ جو دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول تو بنایا، ابتدائے خلق سے لے کر دخول جنت تک کی ساری مخلوق کی سیادت اور قیامت کا تاج تو سر پر رکھا مگر کسی چیز کا علم دیا اور نہ تعارف کرایا کم از کم کوئی حدیث تو ہونی چاہیے۔

مولف اگر نبی کی تعریف اور لغوی معنی جان لیتے، یا پڑھ لیتے تو کم از کم رسول اللہ ﷺ سے کلی جزی کا چکر چلا کر علم غیب کی نفی نہ کرتے، ”نبی نبأ“ سے ماخوذ ہے نبی صفت مشبہ ہو کر اسم فاعل ہے، معنی یہ ہوگا کہ جن چیزوں پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا ہے آپ ﷺ ان کی خبر دینے والے ہیں، اور نبوت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ عزوجل نے آپ ﷺ کو اپنے غیوب پر مطلع فرمایا۔ اور ان کو بتا دیا اور آپ ﷺ اس کے نبی ہیں (شفاء شریف قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ)

مزید نبوت کیا ہے؟ خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام پا کر غیب کی بات بتانا، پیشنگوئی کرنا، النبی

،اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی بناء پر غیب کی باتیں بتانے والا، خدا کے متعلق خبریں دینے والا۔(المنجد)

مندرجہ بالا ان لغوی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ نبی وہی ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے غیوب پر مطلع فرمائے اور وہ غیب کی خبریں بتائے ، نبی ماننا اور ان کے لیے علم غیب تسلیم نہ کرنا انکار نبوت کو مستلزم ہے، شفاء شریف اور المنجد کی توضیح اس بات پر دال ہے کہ غیوب کا علم رکھنا اور غیب کی خبریں دینا نبوت کے لیے اجزائے ماہیت ہیں جس طرح ماہیت انسان کے لیے حیوان ناطق اجزائے حقیقیہ ہیں، جس طرح وجود انسان کے لیے حیوان ناطق کا ہونا ضروری ہے ان دونوں جزؤں کے بغیر وجود انسان کا تحقق ناممکن ہے یا مثلاً مکان ہے اس کے اجزائے ترکیبیہ ،لکڑی، اینٹ، گارا یا سمنٹ وغیرہ ہیں اور ان کے بغیر مکان کا کوئی وجود نہیں، اسی طرح نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے غیوب پر مطلع فرماتا ہے اور وہ لوگوں کو غیب کی خبریں بتاتا ہے ۔اگر نبی سے علوم غیبیہ جاننے کی نفی کردی جائے تو پھر باقی انسان ہی رہ جائے گا ،صرف انسان بدوں علم غیب اور اخبار غیب نبی ہی نہیں ہوسکتا، ”فتفکر و تدبر“ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو کس قدر علوم غیبیہ عطا فرمائے یہ اللہ ہی جانتا ہے کیونکہ الہام اور وحی کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر علوم غیبیہ کی برسات فرمائی ہے ۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : ”فاوحی الی عبدہ ما اوحی“ اور آپ ﷺ نے کس قدر علوم غیبیہ کی خبریں دیں اعداد وشمار سے بالاتر ہے، جیسا کہ ملا علی قاری نے فرمایا:

”واخبارہ علیہ السلام بمغیبات لا تحصی“ (مرقات جلد ۲ ص ۲۷۰)

ترجمہ : نبی کریم ﷺ نے لاتعداد امور غیبیہ کی خبر دی ہے۔

خوف طوالت دامن گیر ہے ورنہ بحمد اللہ وبفضل اللہ اس موضوع پر مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے

”آپ ﷺ مختار کل نہیں۔فائدہ ضمن (۱) ص ۲۷“

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ مختار کل بنایا ہے

جواباً کہا جائے گا کہ مؤلف کتابچہ کا یہ کہنا غلط اور خلاف واقعات ہے، امام رازی نقل فرماتے ہیں: کہ اسرافیل رسول اللہ ﷺ کے سامنے متمثل ہوئے اور عرض کیا: **"یا محمد ان ربک یقرئک السلام و یخیرک بین ان تکون نبیا ملکا، و بین ان تکون نبیا عبدا"**

ترجمہ: اے محمد ﷺ آپ کا رب آپ کو سلام فرماتا ہے اور آپ کو اختیار دیتا ہے کہ اگر آپ نبوت کے ساتھ بادشاہت چاہتے ہیں تو آپ کو روئے زمین کی بادشاہت بھی دی جاتی ہے اور اگر آپ نبوت کے ساتھ منصب عبدیت کو پسند کرتے ہیں تو وہ دے دیا جاتا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے نقل فرمایا: **"و فی الصحیح انه علیه افضل الصلوۃ و السلام خیر بین ان یکون نبیا ملکا او عبدا رسولا فاختار ان یکون عبدا رسولا"**

(ابن کثیر جلد ۳)

ترجمہ: صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے اگر چاہیں تو نبوت کے ساتھ بادشاہ بھی ہوں اور اگر چاہیں منصب رسالت کے ہمراہ مقام عبدیت پر بھی فائز ہوں۔ یہ اختیار آپ ﷺ کی ذات تک محدود، اور آپ کی ذات کے حوالے سے ہے، آپ کی چاہت ہو تو روئے زمین کے بادشاہ بنا دیئے جائیں، اور اگر رسالت کے ہمراہ شرف عبدیت کو پسند فرمائیں تو آپ کی مرضی، مگر آپ نے اپنا اختیار بروئے کار لاتے ہوئے رسالت معہا عبدیت کو پسند کیا اور اختیار فرمایا۔ ابو سعید الخدری روایت کرتے ہیں کہ:

"ان النبی ﷺ جلس علی المنبر فقال ان عبدا خیرہ اللہ بین ان یوتیه من زهرة الدنیا و بین ما عندہ فاختار ما عندہ" (بخاری، مسلم)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے

ایک بندے کو اختیار دیا ہے چاہے وہ دنیا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو اور چاہے تو اللہ کے ہاں رحمت جزیلہ اور فضل بیکراں سے ہمکنار رہو، تو اس نے اللہ کے ہاں جانا اختیار کیا ہے۔ یہ اختیار بھی فقط رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے باقی انسانوں کے لیے نہیں، باقی افراد انسانیت کیلئے ،، "اذا جاء اجلھم لا یسأخرون ساعۃ و لا یستقدمون "کا حکم اٹل ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد" (البلد)

اس کی تفسیر میں امام رازی نے فرمایا: "قال قتادہ او انت حل ای لست باثم و حلال لک ان تقتل بمکۃ من شئت و ذالک ان اللہ تعالیٰ فتح علیہ مکۃ و احلھا لہ، و ما فتحت علی احد قبلہ فاحل ما شاء و حرم ما شاء فقتل عبد اللہ ابن خطل، و ھو متعلق باستار الکعبۃ و مقیس بن صبابۃ و غیرھما، و حرم دار ابی سفیان ثم قال ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السموت و الارض فھی حرام الی ان تقوم الساعۃ لم تحل لاحد قبلی و لم تحل لاحد بعدی" (کبیر جز ۳۱، ص ۱۸۱)

ترجمہ: حضرت قتادہ و انت حل کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے نبی (ﷺ) آپ کے لیے یہ حلال ہے، اگر آپ کسی کو قتل کر دیں اور اس کے قتل کرنے پر آپ گنہگار بھی نہ ہوں گے، مکۃ المکرمہ میں آپ جسے چاہیں قتل کر دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ آپ کو عطا فرمائی اور اسی نے آپ کے لیے یہ حلال کر دیا ہے آپ جس کو چاہیں قتل کر دیں ،آپ سے پہلے فتح مکہ کسی کے ہاتھ پر رونما نہیں ہوئی۔ اس لیے آپ کو اختیار ہے جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس کو چاہیں حرام قرار دیں، پس آپ ﷺ نے عبداللہ بن اخطل کو جو کعبۃ اللہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا قتل کر دیا، مقیس بن صبابہ کو قتل کیا اور ابوسفیان کی حویلی میں داخلے کو حرام قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: جس دن سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا گیا ہے اسی دن سے مکۃ المکرمہ کو حرمت بخشی گئی ھے۔ اور یہ حرمت قیام قیامت

تک باقی رہے گی۔ مجھ سے قبل یہ حلت کسی کو نہ ملی ہے اور نہ بعد ملے گی۔

مفسر کبیر کی تفسیر سے روز روشن کی طرح واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اشیاء کے حلال وحرام کرنے کا مکمل اختیار دے رکھا تھا جبکہ یہ خالصتاً اللہ کا اختیار ہے، پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کو فتح مکہ کے موقعہ پر بھرپور انداز میں استعمال کیا۔

بخاری میں ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ آپ سے احادیث مبارکہ سنتا ہوں اور بسا اوقات بھول جاتا ہوں ، آپ نے فرمایا !اپنی چادر بچھاؤ، میں نے اپنی چادر بچھائی ،آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے کچھ اشارہ فرمایا جیسے کہ کوئی دولپ بھر کر ڈالتا ہو، اور پھر فرمایا!اب اس چادر کو اپنے سینے سے لگالو، میں نے اس چادر کو اپنے سینے سے لگا لیا، اس کے بعد میں آپ ﷺ کی کسی حدیث کو نہیں بھولا، شارح بخاری امام ابن حجر نے فرمایا: کہ آپ ﷺ نے ابوہریرہ کی چادر مین دولپ بھر کر کیا ڈالا؟ کسی حدیث میں اس کی تصریح نہیں ،مگر مولانا محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی فرماتے ہیں کہ عالم غیب میں جو خزانہء حفظ ہے آپ ﷺ نے اس سے دولپ بھر کر ابوہریرہ کی چادر میں ڈالیں پھر وہ حفظ چادر کے ذریعے ابوہریرہ کے سینے میں پہنچا، مزید فرمایا حفظ اگرچہ عالم شھادت والوں کے نزدیک غیر محسوس ہے مگر محرمان عالم غیب کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور نہ ہی مخفی، (سیرۃ المصطفیٰ) ابوہریرہ سے مروی دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے تمام صحابہ کے لیے یہ اعلان فرمایا کہ

”لن یبسط احدمنکم ثوبہ حتی اقضی مقالتی ھذہ ثم یجمعہ الی صدرہ فینسی من مقالتی، شیئا ابدا“ (بخاری، مسلم، مشکوۃ ص ۵۳۵)

ترجمہ: آج تم میں سے جو کوئی بھی میری گفتگو کے ختم ہونے تک اپنی چادر بچھائے رکھے گا وہ کبھی بھی میری حدیث کو بھول نہیں پائے گا، اس حدیث اور پہلی حدیث سے ثابت ہوا کہ عالم

غیب میں بھی خزانے موجود ہیں، مگر رسول اللہ ﷺ کے تصرف اور اختیار میں ہیں اسی لیے آپ نے دو لپ بھر کر ابوہریرہ کی چادر میں ڈالے، ابوہریرہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس اختیار، اور عالم غیب میں موجود خزانوں میں تصرف کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:

ثم جمعتها الی صدری فو الذی بعثه بالحق مانسیت من مقالته ذالک الی یو می هذا"(متفق علیه، مشکوۃ ۵۳۵)

ترجمہ: میں نے وہ چادر اپنے سینے سے لگائی پھر قسم ہے اس ذات وحدہ لاشریک کی جس نے آپ ﷺ کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے میں آج تک آپ ﷺ کی کوئی بات نہیں بھولا،

"وعن المسور ان علی بن ابی طالب خطب بنت ابی جهل و عنده فاطمة بنت النبی ﷺ فلما سمعت بذالک فاطمة اتت النبی ﷺ فقالت له ان قومک یتحدثو ن انک لا تغضب لبناتک و هذا علی نا کح ابنة ابی جهل الحدیث"

مسور روایت کرتے ہیں کہ علی بن ابی طالب نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا، حالانکہ حضرت فاطمہ ان کے عقد زوجیت میں تھیں، جب حضرت فاطمہ نے سنا تو نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں، اور کہنے لگیں کہ آپ کی قوم باتیں کر رہی ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں سخت رویہ نہیں رکھتے اور یہ علی ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے والے ہیں اس کے بعد آپ جلوہ آرائے منبر ہوئے اور ارشاد فرمایا:

و انی لست اُحرم حلالاً و لا احل حراماً و لکن و اللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ و بنت عدو اللہ مکانا و احدا ابدًا۔ (مرقاۃ۔جلد۔۱۱۔۳۷۵)

ترجمہ:۔ بے شک میں حلال کو حرام اور نہ حرام کو حلال قرار دیتا ہوں، لیکن قسم بخدا۔ اللہ کے رسول کی بیٹی، اور اللہ کے دشمن کی بیٹی کبھی بھی ایک مکان میں جمع نہیں ہو سکتیں،:

قال ابن داود حرم اللہ علٰی علی ان ینکح علی فاطمة حیاتها، بقوله

عز وجل وما اتاکم الرسول فخدوہ ومانھا کم عنه فانتھوا افلما قال النبی ﷺ لا اذنُ لم یکن یحل لعلی ان ینکح علی فاطمه الا ان یاذن رسول اللہ ﷺ (مرقاۃ۔جلد۔ ۱۱۔۳۷۵)

ترجمہ:۔ابن داؤد نے فرمایا،اللہ تعالیٰ نے حضرت فاطمہ کی زندگی میں حضرت علی کے لیے دوسرا نکاح کرنا حرام کردیا تھا اس لیے کہ اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے جو چیز یعنی جو حکم، اللہ کے رسول ﷺ آپ کو دیں اس کو پکڑ لو، یعنی اس پر عمل پیرا ہو جاؤ اس حدیث بلکہ پورے واقعہ سے ثابت ہوا کہ حلال وحرام کا اختیار اللہ تعالیٰ نے آپ کو دے رکھا ہے ورنہ حضرت علی کے لیے دوسرا نکاح پھر سیدہ فاطمہ کی زندگی تک کیوں حرام فرمایا؟ جبکہ ہر کس وناکس کے لیے چار شادیاں کرنا جائز اور حلال ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اختیار کلی پر "ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھا کم عنه فانتھوا" نص قطعی موجود ہے، حضرت ربیعہ بن کعب کہتے ہیں کہ :

"کنت ابیت مع رسول اللہ ﷺ فاتیته بوضوئه وحاجته فقال لی سل فقلت اسئلک مرافقتک فی الجنة قال او غیر ذلک قلت ھو ذاک قال فاعنی علی نفسک بکثرۃ السجود" (رواہ مسلم، مشکوۃ)

ترجمہ: میں رات کو رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا وضوء کے لیے پانی ،لوٹا، مسواک اور مصلی پیش کرتا ایک رات آپ نے فرمایا کہ اے ربیعہ تم میری خدمت کرتے ہو مانگو، ربیعہ کہتے ہیں میں نے آپ سے جنت میں آپ ﷺ کی رفاقت مانگی ، پھر فرمایا اور کچھ؟ میں نے عرض کیا یہی رفاقت چاہیے اور کچھ نہیں ۔تب آپ نے فرمایا کثرت سجود سے میری اعانت کرتے رہنا۔امام ابن حجر نے فرمایا:

"یؤخذ من اطلاقه علیه السلام لامر بالسوال ان اللہ تعالی مکنه من اعطاء کل ما اراد

من خزائن الحق و من ثم عدائمتنا من خصائصه علیه السلام انه یختص من شاء بماشاء کجعله شهادة خزیمة بن ثابت بشهادتین رواه البخاری و کتر خیصه فی الیناحة لام عطیة فی آل فلان خاصة رواه مسلم للشارع ان یخص من العموم ماشاء و باالتضحیة بالعناق لابی بردہ بن نیار روغیرہ، و ذکر ابن سبع فی خصائصه وغیرہ ان اللہ تعالیٰ اقطعه ارض الجنة یعطی منها ماشاء لمن یشاء''(مرقات جلد ۲، ص ۳۲۳)

ترجمہ: ابن حجر نے فرمایا کہ آپ کا مطلقاً ''سل''(مانگ) فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے کل خزانوں کے مالک اور مختار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان خزانوں میں سے ہر اس چیز کے عطا کرنے کی طاقت بخشی ہوئی ہے جو آپ چاہیں، اسی بناء پر ہمارے آئمہ کرام نے آپ کے خصائص میں سے اس امر کو شمار کیا ہے کہ آپ جس کو چاہیں اور جو چاہیں دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ خزیمہ بن ثابت اکیلے کی شہادت دو گواہوں کے مساوی قرار دی،، ام عطیہ کو نوحہ کرنے کی اجازت فرمائی، آپ کو عام سے خاص کرنے کی اجازت اور اختیار حاصل ہے۔ ابی بردہ بن دینار کو کم عمر قربانی کی اجازت دی، ابن سبع اور دیگر آئمہ نے آپ کے خصائص میں ذکر کیا ہے کہ جنت آپ کی مملوکہ ہے آپ ﷺ جس کو چاہیں اسے عطا فرمائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

''قال رسو اللہ ﷺ یا عائشه لو شئت لسارت معی جبال الذهب الحدیث''

(مشکوہ، ص ۵۲۱)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اگر میں چاہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلتے، یعنی اگر آپ ﷺ چاہتے تو سونا پہاڑوں کی شکل میں آپ ﷺ کے زیر قدم ہوتا، دنیا کے ہر قسم کے مال و اسباب آپ کے زیر قبضہ، زیر تصرف اور زیر استعمال ہوتے لیکن آپ نے شہنشاہیت اور

ملوکیت پر عبدیت کو ترجیح دی جس پر نبوت اور رسالت کی چھاپ ہو،
حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ:

"ان النبی ﷺ اخذ حریرا فجعلہ فی یمینہ، فاخذ ذھبا فجعلہ فی شمالہ ثم قال ان ھذین حرام علی ذکور امتی۔ (رواہ احمد، ابو دائو، والنسائی)

ترجمہ: بے شک نبی کریم ﷺ نے ریشم لیا اور اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا، پھر آپ نے سونا لیا اور اس کو اپنے بائیں ہاتھ میں رکھا پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے میری امت کے مردوں پر حرام کردی ہیں، معلوم ہوا سونا حرام ہے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا! سونے کی انگوٹھی پہننا ایسے ہی ہے جیسا آگ کا انگارہ ہاتھ میں رکھنا،

(مسلم، مشکوۃ ص ۳۷۸)

لیکن سفر ہجرت کے موقعہ پر جب سراقہ بن مالک نے آپ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پالیا تو آپ نے سراقہ بن مالک سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا **"کیف بک اذا لبست سوار کسری"** اے سراقہ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا؟ جب تو شہنشاہ عجم کسری کے سونے کے کنگن پہنے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہء خلافت میں عجم فتح ہوا شہنشاہ عجم کسری کے سونے کے کنگن، تاج اور زیورات مال غنیمت کے طور پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے مسجد نبوی میں پیش ہوئے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سراقہ بن مالک کو بلوا کر وہ کنگن اپنے ہاتھوں سے پہنائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ کو اپنی زندگی اور انتقال میں اختیار کا دیا جانا یہ اختیار فی القدر ہے، کیونکہ موت وحیات تابع تقدیر باری تعالیٰ ہیں، رسالت کے ہمراہ بادشاہت اور عبدیت کا اختیار دیا جانا یہ اختیار فی المعاملات ہے، خانہء کعبہ میں کفار کے قتل کی اجازت اور حلت، حلت وحرمت میں اختیار ہے، جو اوامر ونواہی ہیں، اور احکام شریعہ منزل من اللہ

ہیں، صحابہ کے سامنے یہ اعلان فرمانا جو چادر بچھائے گا وہ پوری عمر نسیان سے محفوظ اور اس کی قوت حافظہ زوال پذیر نہ ہوگی، ابوہریرہ کی چادر میں دو لپ بھر کر غیر محسوس شیء کا ڈالنا علم بالغیب ملک بالغیب، اور خزانہ ہائے غیب میں تصرف کا اختیار ہے، اور فوق الفطرت تصرف ہے ربیعہ بن کعب کو جنت عطا فرمانا عالم علوی میں تصرف ہے جو ملکیت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کی شخصیت کو دو مومن مردوں کے مساوی بطور گواہ قرار دینا امور شرعیہ میں اختیار ہے، قرآن نے نصاب شہادت میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو لازمی قرار دے رکھا ہے، ہر مومن مرد صاحب استطاعت کے لیے قرآن نے چار عورتوں سے بیک وقت نکاح کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، مگر حضرت علی کے لیے حضرت فاطمہ کی حین حیات تک دوسرا نکاح کرنا حرام قرار دیا تھا، ام عطیہ کو نوحہ کرنے کی اجازت دی جبکہ نوحہ کرنا ممنوع تھا، یہ امور شرعیہ میں اختیار ہے، سونے کے پہاڑ چلنے کا فرما کر اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تصرف فی الکائنات دیا ہے، سراقہ بن مالک کو کنگن پہنانے کی خوشخبری دینا اور فاروق اعظم کا بلوا کر سونے کے کنگن سر اجلاس مسجد نبوی میں پہنانا شریعت مطہرہ کی تعبیر و تشریح اور اس میں تبدیلی آپ کے مکمل اختیار کو ظاہر کرتی ہے، جبکہ آپ نے ریشم اور سونے کو اپنی امت کے مردوں پر حرام قرار دے رکھا تھا، حضرت عکاشہ کی تلوار بدر کے دن ٹوٹ گئی تھی۔ لکڑی کی ایک جڑ دی اور فرمایا اس سے مارو، وہ تلوار بن گئی، کاٹتی تھی، لمبی، سفید اور تیز دھار تھی، غزوۂ احد کے موقع پر عبد اللہ بن جحش کی تلوار ٹوٹ گئی، آپ نے ان کو کھجور کی ٹہنی دی، وہ ان کے ہاتھ میں تلوار بن گئی۔ (شفاء شریف) یہ اختیار فی الماہیت ہے، آپ نے ہاتھ میں لی اور اس کی حالت

بدل گئی، یعنی لکڑی کی ماہیت تبدیل ہو کر لوہا بن گئی، اگر اس تبدیلی کا آپ کو علم اور اختیار نہ ہوتا حالت جنگ میں لکڑی دے کر یہ نہ فرماتے کہ اس سے مارو، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کا

اختیار دے رکھا تھا جیسا کہ امام ابن حجر، اور ملا علی قاری کے فرامین پہلے نقل ہو چکے ہیں، اور ابن داوٗد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی پہلے گزر چکا ہے کہ اس آیت سے آپ کا مختار کل ہونا ثابت ہے ۔احمد ممتاز مفتی کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ مختار کل نہیں باطل محض ہے،

"مااتکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا عنہ"

{وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ}

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر چیز آپ کے زیر مشاہدہ ہے

مسئلہ حاضر و ناظر

مسئلہ حاضر و ناظر

حاضر، حضر، حضورًا، سے ماخود ہے۔جس کا معنی موجود ہونا اور حاضر ہونا ہے،، حاضر جو موجود ہو اور حاضر ہو۔ **(المنجد)**

ناظر، نظر، نظرًا، سے ماخوذ ہے اس کا معنی دیکھنا اور غور کرنا ہے۔ **(المنجد)**

یعنی موجود ہونے والا حاضر، اور دیکھنے والا ناظر ہے،، معنوی طور پر ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ جہاں تک انسان کی آنکھ دیکھ سکتی ہے وہاں تک انسان ناظر ہے، اور جہاں موجود ہو

وہاں وہ حاضر ہے، یا جہاں تک اس کی پہنچ ممکن ہو وہاں تک وہ حاضر ہے،، جہاں موجود ہے وہاں حاضر بالفعل ہے اور جہاں تک اس کا حاضر ہونا اس کے بس اور اس کی قدرت میں ہے وہاں تک حاضر بالقوۃ ہے، اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ہر شیء کے دیکھنے ہر ہر آواز کے سننے، اور ہر ہر چیز پر قدرت رکھتے اور ہر ہر شیء خواہ موجود ہو یا نہ ہو کا اپنی شان کے مطابق علم رکھنے والا ہے، ملاحظہ کرنے اور دیکھنے والا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''**لا یعزبُ عنه مثقال ذرة**'' مخلوق کا ذرّہ ذرّہ اسکے علم اور اسکی نظر میں ہے اور ہر شیء پر قادر اور اس میں متصرف ہے۔ ''**واللہ علی کل شیء شهید، ان اللہ علی کل شی قدیر**'' اللہ ہر شی کو دیکھنے، ہر شی پر قادر ہونا اسی کی شان ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو بھی یہ صفت عطا فرماتا ہے کہ وہ پوری کائنات کو دیکھتے ہیں، مشرق ومغرب تک پھیلی روئے زمین ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح اُن کے سامنے ہوتی ہے وہ جہاں چاہیں جائیں، اور جس جگہ چاہیں وہاں تصرف بھی کر سکتے ہیں، ان کے لئے کوئی ممانعت اور رکاوٹ نہیں۔ یہ عقیدہ اہل سنت وجماعت کا ہے اور یہ قرآن وحدیث اور اقوال علمائے اُمت سے ثابت ہے، جہاں تک ہمارے رسول ﷺ کے حاضر وناظر ہونے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق اتنی وضاحت ہے کہ کائنات کی ہر شیء نگاہ نبوّت کے سامنے ہے، ابتدائے کائنات سے لیکر قیام قیامت تک کے تمام احوال اور جملہ واقعات آپ کے زیر مشاہدہ ہیں، اور جہاں آپ کی مرضی ہو وہاں جاسکتے ہیں، جسم اصلی کے ساتھ خواہ جسم مثالی کے ساتھ'' یہ عقیدہ شرک نہیں بلکہ جز وایمان اور عین اسلام ہے۔ اب ہم اس مؤقف کو قرآن وحدیث، اقوال علماء سے ثابت کرینگے۔ {**وباللہ التوفیق**}

چنانچہ قرآن مجید نے فرمایا: ''**یاایها النبی انا ارسلنک شاهدا و مبشرا و نذیرا الایه**''

ترجمہ: اے غیب کی خبریں دینے والے ہم نے آپ کو حاضر، ناظر، خوشخبری دینے والا، اور ڈر بتانے والا بھیجا ہے۔

اس آیہء مقدسہ کی تفسیر میں علامہ محمود آلوسی نے فرمایا: "**علی من بعث الیھم تراقب احوالھم وتشاھد اعمالھم وتتحمل الشھادۃ بماصدر عنھم من التصدیق والتکذیب وسائر ماھم علیہ من الھدی والضلال وتؤدیھا یوم القیامۃ اداءً مقبولا فیما لھم وما علیھم**" (روح المعانی جلد ۱۱، ص ۴۵)

ترجمہ: جن کی طرف آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا ہے آپ ان کے احوال کے دیکھنے والے ، اوران کے اعمال کے مشاہدہ کرنے والے، انہوں نے جو آپ کے پیغام کی تصدیق کی یا تکذیب کی اس کی شہادت دینے والے ان کی گمراہی اور ہدایت کی گواہی دینے والے، قیامت کے دن ان کے نفع اور نقصان پر مبنی بیان دینے والے، آپ کا بیان ہی مقبول ہوگا ان صفات کا حامل بنا کر آپ کو بے شک ہم نے بھیجا ہے اس سے ثابت ہوا کہ جن اقوام، اور جن جن ادوار، اور جس جس مخلوق کیلئے آپ کو مبعوث فرمایا گیا اس کے احوال واعمال کے آپ ناظر ہیں۔ آپ کی بعثت تمام افراد انسانیت کیلئے ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"**وما ارسلنک الا کافۃ للناس**"

خود آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "**بعثت الی الخلق کافۃ**"

لہذا ثابت ہوا کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے اعمال اور احوال پر آپ ﷺ نظر رکھتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے خود فرمایا:

"**فانی لاعرف اسمائھم واسماء آبائھم والوان خیولھم، ھم خیر فوارس او من خیر فوارس علی ظھر الارض یومئذٍ**" (رواہ مسلم، مشکوۃ باب الملاحم فصل اوّل ص ۴۶۷)

ترجمہ: دجال سے جہاد کرنے والے مجاہدین کے نام، ان کے باپ دادوں کے نام، ان کے گھوڑوں کے رنگ میں جانتا اور پہچانتا ہوں، وہ اس وقت پوری روئے زمین پر موجود اور پائے جانے والے سواروں میں بہترین سوار ہوں گے۔

اگر دجال کے خروج، اوراس کے ساتھ لڑنے والے مجاہدین کا علم اور شناخت نہ ہوتی اور پورا منظر، بلکہ جہاد میں شریک گھوڑوں کے رنگ اور تعداد زیر نظر نہ ہوتے تو کیسے فرماتے: ”انی لاعرف“ کہ البتہ بے شک میں انہیں اور ان کی پشتوں کو جانتا پہچانتا ہوں، بلکہ ان کے نام تک میرے علم، اور خاندانوں کے خاندان میری نظر میں ہیں۔علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”نعم قد یقال انہ علیہ الصلوۃ و السلام یعلم بطاعات و معاص تقع بعدہ من امتہ“

ترجمہ: یوں بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد، آپ کی امت جو گناہ اور نیکیاں کرتی ہے یا کرے گی آپ انہیں جانتے ہیں۔

مزید فرمایا: ”و اشار بعض السادۃ الصوفیۃ الی ان اللہ تعالیٰ قد اطلعہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم علی اعمال العباد فنظر الیھا و لذالک اطلق علیہ علیہ الصلوۃ و السلام شاھد ،وقال مولانا جلال الدین الرومی قدسرہ العزیز فی مثنویہ' درنظر بودش مقامات العباد: زاں سبب نامش خدا شاہد نہاد“ (روح المعانی، ایضاً)

ترجمہ: اکابر صوفیائے کرام نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے بندوں کے اعمال پر مطلع فرمایا ہے اور آپ بندوں کے اعمال کو دیکھتے ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شاہد رکھا ہے۔عارف رومی نے فرمایا! بندوں کے مقامات آپ کی نظر میں ہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا نام شاہد رکھا ہے۔

معلوم ہوا علمائے محققین اور اولیائے کاملین کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اعمال اُمت اور مقامات اُمت پر ناظر ہیں، اور ساری اُمت آپ کے مشاہدہ اور نظر میں ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ تعالی نے نقل فرمایا کہ امام جلال الدین السیوطی رحمہ اللہ تعالی نے فرمایا: ”فمحصل من مجموع ھذا الکلام و النقول و الاحادیث ان النبی ﷺ حی بجسدہ و روحہ و انہ یتصرف و یسیر حیث شاء فی اقطار الارض و فی الملکوت

وھو بھیئتہ التی کان علیھا قبل وفاتہ لم یتبدل منہ شیء وانہ مغیب عن الابصار کما غیب الملائکۃ مع کونھم احیاء باجسادھم فاذا اراد اللہ تعالیٰ رفع الحجاب عمن اراد اکرامہ برؤیتہ راہ علی ھیئتہ التی ھو علیہ الصلوۃ والسلام علیھا لا مانع عن ذالک" (روح المعانی جلد ۱۲، ص ۳۶)

ترجمہ: تمام اقوال، احادیث اور نقول کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے جسم اور روح کے ساتھ زندہ ہیں اور بے شک روئے زمین کے جس کونے میں یا آسمانوں میں جہاں چاہیں تشریف فرما ہوتے ہیں اور تصرف بھی فرماتے ہیں، آپ کی حالت وہی اور اسی طرح ہے جس طرح وفات سے پہلے تھی۔ آپ کی کسی بھی چیز ذات شریفہ یا وصف میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ،صرف آپ کو نظروں سے غائب کر دیا گیا ہے۔ جسطرح فرشتے اجسام کے مالک اور زندہ ہیں مگر ہم سے غائب کر دیئے گئے ہیں، جس شخص کو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی زیارت کا شرف بخشنا چاہتا ہے ۔اس کیلئے حجاب اٹھا دیتا ہے۔ اور وہ آپ ﷺ کو اصلی حالت میں دیکھ لیتا ہے۔ اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

معلوم ہوا رسول اللہ ﷺ اپنی ظاہری زندگی کے ساتھ روضہ انور میں رونق افروز ہیں اور وہ تمام صفات نبوّت، اور خواص رسالت آپ کو حاصل ہیں جو قبل از وفات حاصل تھے ،جسطرح آپ کو قبل از وفات کائنات میں اختیار تصرف حاصل تھا اسی طرح اب بھی ہے اور جس طرح آپ سیر فی الارض کے مجاز تھے اسیطرح اب بھی روئے زمین پر جہاں چاہیں سیر فرما سکتے ہیں۔ حاضر و ناظر کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں۔

قیامت کے دن ہر نبی کی اُمت سے ان کے نبی کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اس نے میرے احکام تم کا پہنچائے تھے یا نہیں؟ ہر نبی کی اُمت انکار کرے گی کہ تیرے نبی نے تیرے احکام ہم تک نہیں پہنچائے، انبیائے کرام عرض کریں گے کہ پہنچائے تھے۔، وہ انبیاء

کرام اپنی صفائی اورسچائی میں اُمت مصطفیٰ ﷺ کو پیش کرینگے۔ یہ اُمت انبیائے کرام کے حق میں گواہی دے گی، اس پر اعتراض اٹھایا جائے گا کہ تم نے ان پیغمبروں کا زمانہ نہیں پایا، بغیر دیکھے کیسے گواہی دے رہے ہو۔ یہ اُمت کہے گی ہم سے ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، اُمت مصطفی ﷺ کی، تکذیب اور تصدیق معلوم کرنے کیلئے نبی کریم ﷺ سے گواہی لی جائے گی

آپ ﷺ اپنی گواہی میں فرمائیں گے میری اُمت سچی شہادت دے رہی ہے انبیائے کرام کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی ساری اُمت گواہی دے گی یا چند مخصوص افراد؟ اس کی کوئی تعین نہیں ہاں صرف اُمت کا آیا ہے کہ وہ گواہی دے گی اُمت کا اطلاق آپ کے زمانہء پاک سے لے کر قیامت تک ہونے والے مسلمانوں کو شامل ہے۔

جب آپ اپنی ساری اُمت کے سچا ہونے کی تصدیق فرمائیں گے اور ساری اُمت کا تزکیہ فرمائیں گے تو اس کا واضح مقصد اور مفہوم یہ ہے کہ آپ اپنی قیامت تک ہونے والی اُمت کے کردار کو جانتے، اور اُمت کے ہر فرد کو پہچانتے ہیں۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''والمراد بھؤلاء اُمتہ ﷺ عند اکثر المفسرین ولم یستبعد ان یکون المراد بھولاء مایشمل الحاضرین وقت النزول وغیرھم الی یوم القیامۃ'' (روح المعانی ج۸،ص ۲۱۳)

ترجمہ: آیہء مقدسہ میں ہٰؤلاء سے مراد رسول اللہ ﷺ کی اُمت ہے۔ جو اس وقت موجود تھی اور آیہء کریمہ کے نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک ہونے والی ساری اُمت کا مراد لینا بھی بعید نہیں،،

کیونکہ ''فان اعمال اُمتہ تعرض علیہ بعد موتہ'' آپ کی وفات کے بعد آپ کی اُمت کے اعمال آپ پر پیش کئے جاتے ہیں:

"وقد روی عنہ ﷺ انہ قال حیاتی خیر لکم تحدثون ویحدث لکم ومماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما رایت من خیر حمدت اللہ تعالیٰ علیہ وما رایت من شر استغفرت اللہ تعالی لکم" (روح المعانی، ج،۸ص ۲۱۳)

ترجمہ:۔آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا میری حیات تمہارے لئے بہتر ہے تم کوئی واقعہ کروگے تو اس کا جواب تمہیں مل جائے گا، میری وفات بھی تمہارے لئے بہتر ہے تمہارے اعمال مجھ پر پیش کئے جائیں گے، جو اعمال ان میں نیک ہونگے میں ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرونگا، اور جو بُرے اعمال ہونگے ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے تمہاری مغفرت طلب کرونگا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا ہر ہر اُمتی اور اس کا عمل نیک ہو یا بد آپ کی نظر میں ہے، اور آپ اپنی اُمت کے گناہوں کو دیکھ کر ان کیلئے بخشش طلب فرماتے ہیں، یہ حضور علمی اور نظری ہے، یعنی آپ اپنے علم کے لحاظ سے اعمال اُمت پر حاضر وناظر ہیں۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۵۴ پر لکھا:

اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کے دلائل

دلیل نمبر ۱ :وھو بکل شیءمحیط 'اور وہی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے:

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ یہ درست ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اس کا انکار کفر ہے۔مگر مؤلف اس کا مدلول اور مفہوم نہیں سمجھ پائے، اس لئے کہ شیء کا معنی الشیء المطلق ہے یا مطلق الشیء، اگر الشیء سے مراد الشیء المطلق ہو تو وہ ہر وجود خواہ واجب ہو، یا ممکن موجود ہو یا معدوم پر بولی جائیگی یہ ماہیت کلی اور قضیہ مہملہ ہے یہ مفہوم اشیائے غیر متنائیہ بالفعل ہے یہ خاصہءباری تعالیٰ ہے، اگر مطلق الشیء ہو تو یہ شیءممکن الوجود فی الخارج ہے، اس کا علم اور اس کا ناظر ہونا مخلوق کیلئے ممکن بلکہ ثابت ہے رہا محیط تو احاطہ سے ہے جو استغراق کا معنی دیتا ہے، یعنی کسی شیء

کے مأ خذ، حقیقت مادہ، اس کے جمیع لوازمات، عوارضات کو کامل اور اکمل طور پر جاننے کا نام استغراق اور احاطہ کرنا ہے، یہ بھی اللہ ہی کی شان ہے کیونکہ کوئی مخلوق کسی چیز کے مادہ ،حقیقت، ماہیت، عوارضات اور لوازمات کامن کل الوجود احاطہ نہیں کرسکتی، کسی چیز کو دیکھنے، معلوم کرنے کا نام احاطہ نہیں، دیکھنے والا دیکھ کرناظر بنتا اور اس کا علم حاصل کرتا ہے یہ علم حصولی حادث اور ممکن ہے، مقید بجہت واستعداد ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے دیکھنے اور اس شیٔ کا عالم ہونا اور معنی میں ہے، وہ یہ کہ جمیع اشیاء موجودہ اور معدومہ اپنے جمیع عوارضات اور لوازمات اپنی اپنی ماہیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر اور قائم ہیں، یہ علم حضوری دائمی ابدی اور سرمدی ہے، جب کائنات معرض وجود میں نہ آئی تھی تو اس سے قبل بھی ساری کائنات کے نقوش وامثال اللہ کے حضور، حاضر اور قائم تھے، یہ علم حضوری قدیم ہے اور یہ صفت باری تعالیٰ ہے۔ مخلوق کیلئے محال شرعی اور محال اصطلاحی ہے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر شیٔ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی کیفیات اور حیثیات کے ساتھ حاضر ہے اور اللہ کا علم اور قدرت، اسکی سمع، اور رؤیت ہر شیٔ پر محیط ہے۔ کوئی بھی چیز اپنی کسی حیثیت اور کسی جہت میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات ذاتیہ ازلیہ، ابدیہ سرمدیہ سے خارج نہیں۔ مخلوق کا علم ظاہری اور محدود درجے تک ہے شیٔ سے پہلے تھا نہ شیٔ کے معدوم ہونے پر ہوگا اتنا فرق اور اتنی تمیز ہونے کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ یہ شرک ہے تو کہنے والے کی جہالت اور حماقت ہوگی ۔

مؤلف نے لکھا ہے کہ حاضر و ناظر ہونے کیلئے محیط ہونا ضروری ہے

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ یہ غلط ہے جو صفت اللہ کا خاصہ ہو اس کا مخلوق کیلئے صفت ہونا محال شرعی

ہے حاضر کیلئے محیط ہونا محال عادی اور محال عرفی ہے۔مثلاً ایک شخص گاڑی میں بیٹھا ہے وہ گاڑی کے عنوان میں حاضر وناظر ہے، کیا اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ گاڑی کے ہر ہر پرزے اس کے عمل، اس کی ساخت، اس کی جنس رفتار، خرابی، اور درستگی، رنگ وروغن وغیرہ ہر شیء پر محیط ہو، وہ ڈرائیور ہے نہ مکینک ، نہ سانچہ ساز، ایک شخص کسی بازار یا مارکیٹ میں جاتا ہے پوری مارکیٹ کو دیکھتا ہے جہاں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں مختلف اجناس، مختلف رنگ وصورت کی اشیاء موجود ہیں کیا اس کا اس مارکیٹ یا بازار کا حاضر وناظر ہونا اس وقت قابل تسلیم ہوگا جب ہر ہر چیز پر بشمول قیمت اس کا علم محیط ہو؟

محال شرعی اس لئے ہے کہ اس پر ”وَلَا یُحیطون بشیء من علمه“ نص قطعی موجود ہے۔

مؤلف نے اپنے موقف کی تائید میں کتابچہ کے ص ۵۴ پر دلیل دوم یہ آیہء کریمہ نقل کی

”الم تری ان اللہ یعلم مافی السموت و مافی الارض و مایکون من نجوی ثلثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا هو معهم این ما کانوا ثم ینبئهم بما عملوا یوم القیامة ان اللہ بکل شیء علیم“ (المجادلۃ)

ترجمہ: کیا تو نے نہیں دیکھا بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، نہیں ہوتے تین سرگوشیاں کرنے والے مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہیں سرگوشیاں کرتے پانچ مگر چھٹا ان کا اللہ ہوتا ہے اور نہیں ہوتے اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتے ہیں، جہاں وہ ہوتے ہیں، اس کے بعد قیامت کے دن ان کو ان کے عملوں کی خبر دے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب چیزوں کا جاننے والا ہے۔

مؤلف : نے طرز استدلال میں لکھا کہ:

تین افراد سر گوشیاں کرنے والوں میں چوتھا اللہ کا موجود ہونا اور پانچ افراد میں چھٹا رب قدوس کا ہونا نیز اس کی معیت لازمہ (ساتھ ہونا) اس کے حاضر ہونے پر اور قیامت کے دن مخلوق کے ہر عمل کی خبر دینا اس کے ناظر ہونے پر صراحۃً دال ہے۔

"سبحان اللہ عما یشرکون"

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ مؤلف کو تلاش بسیار کے بعد سورۂ مجادلہ کی یہ آیت معلوم ہوئی حالانکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ہر ذرّے پر قادر، علیم اور خبیر ہے اور وہ بندوں کے ساتھ ہے وہ جہاں بھی ہوں، اس میں کوئی شک اور کوئی کلام نہیں،

بلکہ اللہ تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، یہ قربت علم قدرت کے اعتبار سے ہے اللہ کی رحمت، اعانت اور دید وشنید کے اعتبار سے ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندے کو خود خبر نہیں دے گا بلکہ صحیفہ اعمال خبر دے گا، بندے کے اعضاء اور جلد خبر دے گی۔ بہر حال بندے کو خبر ہو جائے گی کہ وہ دنیا میں کیا کیا اعمال کرتا رہا ہے۔ آیہء کریمہ میں نجویٰ اور اعداد کا ذکر ایک خاص مفہوم خاص مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "ان ھذا اشارۃ الی کمال الرحمۃ و ذالک لان الثلاثۃ اذا اجتمعو افاذا اخذ اثنان فی التناجی و المشاورۃ بقی الواحد ضائعا وحیدا فیضیق قلبہ فیقول اللہ تعالیٰ انا جلیسک و انیسک و کذا الخمسۃ اذا اجتمعو ابقی الخامس وحیدا فریدا، اما اذا کانو اا ربعۃ لم یبق واحد منھم فریدا، فھذا اشارۃ الی ان کل من انقطع عن الخلق مایترکہ اللہ تعالیٰ ضائعا" (کبیر ج ۲۹)

ترجمہ: اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے پر رحمت کاملہ کا اشارہ ہے، وہ یوں ہے کہ جب تین آدمی جمع ہوں تو دو سر گوشی کرنے لگیں گے ایک بیکار ہو جائیگا۔ اور ایک بچ جائے گا وہ

ایسی صورت میں اکیلا رہ جائے گا اس کا دل تنگ ہوگا تو اللہ ارشاد فرماتا ہے اے میرے بندے گھبرا مت میں تیرا ساتھی، اور تیرا دوست ہوں، اسطرح جب پانچ ہوں وہ دو، دو ہو کر سرگوشی کریں گے اور پانچواں پھر بچ جائے گا وہ اکیلا رہ جائے گا اسکو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں تیرا ساتھی، اور میں تیرا غم خوار ہوں، اگر چار ہوں تو پھر کوئی بھی نہیں بچ پائے گا، پس اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بندہء مومن خلق سے خالق کی طرف منہ موڑتا اور متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو ضائع کرتا ہے اور نہ بیکار چھوڑتا ہے۔

امام آگے فرماتے ہیں کہ یہ آیہء مقدسہ منافقین کے ایک ٹولے کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

"ان الایۃ نزلت فی قوم المنافقین اجتمعوا علی التناجی مغایظۃ المومنین و کانوا علی ھذین العددین، قال ابن عباس نزلت ھذہ الایۃ فی ربیعہ، و حبیب ابنی عمرو و صفوان بن امیہ کانوا یوما یتحدثون فقال احدھم، ھل یعلم اللہ مانقول و قال الثانی یعلم البعض دون البعض، و قال الثالث ان کان یعلم البعض فیعلم الکل" (کبیر جز ۲۹، ۲۶۵)

ترجمہ: یہ آیت منافقین کے ایک ٹولے کے متعلق نازل ہوئی ہے جو مؤمنین کے ساتھ غیظ وغضب میں سرگوشیاں کرنے جمع ہوئے تھے، اور ان کی تعداد اتنی تھی جتنی آیہء کریمہ میں بیان ہوئی ہے ،حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا! یہ آیہء کریمہ ربیعہ، حبیب جو عمرو کے بیٹے تھے، اور صفوان بن اُمیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ ایک دن بیٹھے آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے کہ کیا اللہ ان باتوں کو جانتا ہے جو باتیں ہم اس وقت کررہے ہیں، دوسرے نے جواب دیا کہ بعض باتوں کو جانتا ہے اور بعض کو نہیں، تیسرے نے کہا کہ اگر بعض کو جانتا ہے تو پھر سب باتوں کو جانتا ہے۔

مؤلف نے طرز استدلال کے آخر میں لکھا کہ:

"فسبحان اللہ عمایشر کون" یعنی اشارہ کیا کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو حاضر ناظر مانتے ہیں وہ مشرک ہیں اور اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ آیہء کریمہ کا شان نزول خاص ہے اور وہ منافقین جن کے حق میں نازل ہوئی ان کی تعداد صرف تین ہے، آیہء کریمہ میں فرمایا گیا عدد تین، پانچ، کا عدد فرد ہے یعنی تقسیم ہونے والا نہیں وحدانیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عدد اللہ کو بہت پسند ہے، امام موصوف علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "ان العدد الفرد اشرف من الزوج لان اللہ وتر یحب الوتر"

ترجمہ: مفرد عدد یعنی جو اکائی کو ظاہر کرے اور تقسیم نہ ہو وہ اس عدد سے اشرف ہے جو تقسیم ہوتا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ ایک اکائی یعنی ایک ہے اور اکائی پر دلالت کرنے والے عدد کو پسند فرماتا ہے۔ امام موصوف نے اس آیہء کریمہ سے ثابت کیا کہ اللہ رب العزت اپنے بندوں پر کمال مہربانی کرتا ہے، اور جو شخص خلق کو چھوڑ کر خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا انیس اور جلیس ہوتا ہے اس کو ضائع ہونے سے محفوظ اور مأمون رکھتا ہے لیکن مؤلف نے طرز استدلال کا چکر دے کہ اہل سنت و جماعت کو نعوذ باللہ مشرک کہا ہے جو سراسر غلط، اور عقل ونقل کے خلاف ہے، نومولود بچہ دایہ کے ہاتھوں میں ہے یا آغوش مادر میں ہے موجود ہے یا معدوم؟ بالکل موجود ہے اور موجود ہونے کو مؤلف نے طرز استدلال میں حاضر کہا ہے، کیا وہ موجود نومولود ماں یا دایہ کو دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا ہے اور اس کا دیکھنا اس کا ناظر ہونا ہے اسکا حاضر و ناظر ہونا کسی استدلال کا محتاج نہیں کیونکہ یہ بدیہی ہے ۔اگر اس نومولود بچے کو حاضر ناظر نہیں مانو گے تو کیوں؟ اور اگر حاضر و ناظر مانو گے تو کس معنی میں ؟تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوق کا حاضر اور ناظر ہونا اور معنی میں ہے اور خالق یکتاء کا حاضر و ناظر ہونا اور معنی میں ہے، اللہ تعالیٰ کا حاضر اور ناظر ہونا بغیر واسطہ، ذات اُلوہیت کے اعتبار سے ہے اور یہ حضور ونظور ازلی ابدی، دائمی اور سرمدی ہے، جبکہ بچہ یا دیگر مخلوق کا حاضر

وناظر ہونا، امر حادث، عارضی، اور اسباب کے تابع ہے، وجود مخلوق کیلئے مکان اور زمان کا ہونا ضروری ہے، اور دیکھنے کیلئے بصر اور بصارت کا ہونا ضروری ہے، پھر جب تک بصر اور بصارت رہے گی ناظر ہوگا بصر یا بصارت کے زائل ہونے پر یہ ناظر نہیں، اس توضیح کا کوئی بھی شخص جو عقل وشعور کا مالک ہے انکار نہیں کر سکتا مؤلف کے علم میں اضافہ کیلئے یہ بتانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بھی ہر جگہ موجود ہونے اور ہر شیء کو ایک ہی وقت دیکھنے اور تصرف کرنے کی قوت عطا فرما رکھی ہے، ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

''مثل ابلیس ای فی طی الارض لہ حتی یوسوس من فی الشرق الغرب وفی جریہ مجری الدم للنبی آدم'' (شرح فقہ اکبر ص ۹۶)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمن شیطان کو بھی یہ طاقت دے رکھی ہے کہ پوری زمین کا چکر لگاتا ہے یہاں تک مشرق میں ہو کر مغرب میں لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، ہر انسان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ روئے زمین میں جہاں چاہے موجود ہو سکتا ہے اور جس انسان کو چاہے اس کے دل میں وسوسہ بھی ڈال سکتا بلکہ ڈالتا ہے، اور ہر انسان کی رگ رگ میں خون کی طرح موجود اور رواں دواں ہے، قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق اس لعین نے اللہ تعالیٰ کے حضور، اللہ تعالیٰ کی عزت اور جلال کی قسم کھا کر کہا تھا کہ ہر آن، ہر مکان میں ہر انسان کو گمراہ کرونگا اور یہ سہولت شیطان نے قیامت تک کیلئے لے رکھی ہے، پوچھنا چاہوں گا کہ پوری روئے زمین شیطان کے زیر نظر اور زیر تصرف نہیں؟ مشرق میں رہ کر اہل مغرب کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنیکی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کیا ہر انسان کی رگوں میں موجود اور متصرف ہے یا نہیں؟ یہ طاقت اسکی ذاتی نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ ہے، کیا یہ شرک ہے یا نہیں اگر یہ شرک ہے تو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو شرک کرنے کی اجازت اورصلاحیت کیوں دی؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، :

"ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم"

انسان کے جسم میں شیطان کا اثر ونفوذ رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کی طرح ہے۔
بخاری اور مسلم کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شیطان انسان کو ورغلانے، پھسلانے کی مکمل طاقت رکھتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

"مامن بنی آدم مولود الا یمسه الشیطان حین یولد فیستهل صارخا من مس الشیطان غیر مریم وابنها" (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۱۸)

ترجمہ: اولاد آدم کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو اپنے ہاتھ سے چُھوتا ہے اور اس کے چُھونے کی وجہ سے بچہ بلند آواز سے رونے لگتا ہے، سوائے مریم علیہا السلام اور اُن کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کے"

غور کیجئے اولاد آدم پوری روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہے مشارق و مغارب کی پہنائیاں انسانی بستیوں سے آباد اور شاد ہیں، پورے کرۂ ارض پر لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں، حدیث کے مطابق ہر بچے کو شیطان مَس کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی وقت میں شیطان لاکھوں جگہ حاضر، ناظر اور تصرف کر سکتا ہے کیونکہ بغیر علم حضور ممکن ہے نہ مَس کرنا، کیا اس حضور اور نظور سے اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے اگر اثر پڑتا ہے تو اتنی وسیع نظر، اتنا وسیع تصرف اور اتنی جگہوں پر حاضری کی قوّت دشمن خدا کو کیوں دی گئی؟ اگر نہیں پڑتا تو مؤلف کا یہ حصر اور قصر کہ اللہ ہی حاضر و ناظر ہے کہاں گیا اور یہ کیسے صحیح ہے؟
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل فرمایا:

"واعلم ان مافی الارض بیت مدر ولا شعر فی بر ولا بحر الا وانا اتصفحهم فی کل یوم خمس مرات حتی انی اعرف بصغیرهم وکبیرهم منهم بانفسهم" (ابن کثیر جلد ۳، ص ۴۵۸)

ترجمہ: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ کو معلوم ہونا چاہیے، کہ روئے زمین پر کوئی گھر، کوئی خیمہ خواہ جنگل یعنی خشکی میں ہو یا دریا اور سمندر میں ہر روز میں پانچ مرتبہ اس کا معائنہ کرتا اور شناخت کرتا ہوں، اوران گھروں اور خیموں میں مقیم ہر چھوٹے بڑے کو اسطرح اور اتنا جانتا ہوں جتنا وہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے: حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ:

”ماعلی ظهر الارض من بيت شعر و مدر الا و ملک الموت يطوف به کل يوم مرتين“

ترجمہ: روئے زمین پر کوئی مکان، خیمہ ایسا نہیں جس کا عزرائیل علیہ السلام دن میں دومرتبہ چکر نہ لگائیں، حضرت کعب اخبار رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”واللہ مامن بيت فيه احد من اهل الدنيا الا ملک الموت يقوم علی بابه کل يوم سبع مرات ينظر هل فيه احد امر ان يتوفاه رواه ابن ابی حاتم“

(ابن کثیر، جلد ۳، ص ۴۵۸)

ترجمہ: خدا کی قسم روئے زمین پر کوئی گھر جس میں دُنیا والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی رہتا ہو عزرائیل علیہ السلام ہر روز سات مرتبہ اس گھر کا چکر لگاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا اس میں کوئی ایسا آدمی تو نہیں جس کی جان نکالنے کا حکم دیا گیا ہو حضرت مجاہد نے فرمایا:

”حويت له الارض فجعلت مثل الطست يتناول منها متی يشآء“ (ابن کثیر۔ ایضاً)

ترجمہ: پوری زمین عزرائیل علیہ السلام کے سامنے تھالی کی طرح ہے جسطرح کھانے والا جب چاہے جہاں سے چاہے تناول کرسکتا ہے اسی طرح عزرائیل جہاں سے چاہیں لے لیتے ہیں، ان احادیث اور آثار سے واضح اور معلوم ہوا کہ روئے زمین پر موجود ہر گھر اور ہر خیمہ عزرائیل علیہ السلام کی نظر میں ہے، اور پوری روئے زمین پر آباد تمام انسانوں کو خواہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا جانتے اور شناخت کرتے ہیں، اور ہر گھر اور ہر خیمہ جس میں کوئی انسان رہتا ہو دو، پانچ یا سات مرتبہ اس کا

چکر لگاتے ہیں، انسان اتنا بہترا پنے آپ کو نہیں جانتا جتنا عزرائیل علیہ السلام جانتے ہیں، ایک ہی وقت میں روئے زمین پر رہنے والے ہوں یا دریا اور سمندر میں ہزاروں انسانوں کی جان نکالتے ہیں، ایک ہی وقت میں ہزاروں جگہ موجود ہو کر حاضر ہوئے، مرنے والوں اور دیگر زندہ انسانوں کو دیکھنے کی وجہ سے ناظر بھی ہوئے، یہ وہ اُمور ہیں جو احادیث اور آثار سے ثابت ہیں، یہ اُمور شرک نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، ورنہ عزرائیل علیہ السلام تو اپنی مرضی اور اپنی طاقت سے ایک مچھر کی جان نہیں نکال سکتے‘ خود عزرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا ہے:

”واللہ یا محمد لو انی اردت ان اقبض روح بعوضة ما قدرت علی ذالک حتی یکون اللہ ھو الامر لقبضھا“

ترجمہ: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم ہے خدائے وحدہ لاشریک کی اگر میں مچھر کی جان نکالنا چاہوں تو اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اس کی جان نکالنے کا مجھے حکم نہ دے۔

ملا علی قاری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”ورءویته علی المنبر باالمدنیة جیشه بنهاوند حتی قال لامیر الجیش یا ساریة الجبل الجبل محذرً اله من وراء الجبل لکمن العدو هنالک وسماع ساریة کلامه ذالک مع بُعد المسافة“ (شرح فقہ اکبر ص ۹۴)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسجد نبوی کے منبر سے نہاوند کے مقام پر اپنی فوج کو دیکھنا اور پھر امیر لشکر کو یہ ہدایت دینا کہ پہاڑ سے تم پر حملہ ہونے والا ہے، بچو اور تدبیر اختیار کرو، کیونکہ دشمن کا مورچہ اس پہاڑ کے پیچھے تھا، اور حضرت ساریہ کا امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی آواز کا سننا باوجود یکہ دونوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ حائل تھا“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کے منبر پر دوران خطبہ نہاوند جیسے دور دراز علاقہ کو دیکھا، پہاڑ کے پیچھے مورچہ زن دشمن اسلام کو دیکھا اور ان کے حملہ کے منصوبہ کو ملاحظہ فرمایا، امیر لشکر حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو ہدایت دی، امیر لشکر حضرت ساریہ

رضی اللہ عنہ نے آپ کی آواز سنی، بلکہ لشکر کے ہر ہر سپاہی نے آپ کی آواز کو سنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر حاضر اور میدان جنگ کیلئے ناظر ہوئے، حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ سامع ہوئے' یہی ملا علی قاری علیہ الرحمہ نقل فرماتے ہیں:

"وذالک اذاتنور الروح القدسیه وازداد نوریتها واشراقها بالاعراض عن ظلمة والم الحس وتحلیة مرائة القلب عن صداء الطبیعة والمواظبة علی العلم والعمل و فیضان الانوار الالٰهیة حتی یقوی النور وینسبط فی فضاء قلبه فتنعکس فیه النقوش المرتسمة فی اللوح المحفوظ ویطلع علی المغیبات ویتصرف فی اجسام العالم السفلی بل یتجلی حینئذ الفیاض الاقدس بمعرفته التی هی اشرف العطایا فکیف بغیرها" (مرقات۔جلد۔۱۔ص ۶۲)

ترجمہ: اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جب روح انسانی صفات قدسیہ سے متصف ہو، عالم محسوسات کی ظلمت سے اعراض کرے تو روح کی نورانیت اور روشنی میں اضافہ اور زیادتی ہونے لگتی ہے، اور طبیعت کی کثافتوں سے شیشہ دل چمکیلا اور ضیاء بار ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ آدمی اپنے علم اور عمل پر پابندی سے کاربند ہوجاتا ہے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کے انوار کا فیضان ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک یہ انوار اس کے دل پر چھا جاتے ہیں اور دل کے نُور کو اتنی تقویت ملتی ہے کہ

لوح محفوظ کے علوم ونقوش اس کے دل میں اتر جاتے ہیں اور وہ اشیائے غائبہ پر مطلع ہوتا ہے اور زمینی کائنات میں تصرف بھی کرتا ہے، بلکہ اس وقت اس کے دل پر انوار باری تعالیٰ کی تجلی ہونے لگتی ہے، کائنات تو رہی درکنار وہ ذات اقدس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ملا علی قاری علیہ الرحمہ کی اس تشریح سے ثابت ہوا کہ:

(۱) ۔نور قدسی کا حامل شخص غیب جانتا ہے (۲) اس نور کا حامل شخص لوح محفوظ کو دیکھتا ہے (۳) اس نور قدسی کا حامل ساری کائنات بلکہ ذات وحدہ لاشریک کا مشاہدہ کرتا

ہے(۴) جب انوار خداوندی کی تجلی ہونے لگتی ہے تو زمین کے کونے کونے میں اسکی آمدورفت امر واقعی ہوجاتی ہے(۵) وہ اپنے جسم اصلی یا جسم مثالی کے ساتھ جہاں چاہے جاسکتا ہےاور تصرف بھی کرسکتا ہے، اسی مضمون کی طرف خود نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله"

ترجمہ: مومن کی فراست ایمانی سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے' اس حدیث کا معنی اور تشریح بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"وسببها نور يقذفه الله تعالٰى فى قلب عبده"

ترجمہ: اس کا سبب وہ نور الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں پیدا کرتا ہے' ملا علی قاری علیہ الرحمہ مزید فرماتے ہیں کہ:

"قال ابو سليمان الدارنى الفراسة مكاشفة النفس و معاينة الغيب وهى من مقالات الايمان" (شرح فقہ اکبر ص ۹۵)

ترجمہ: امام ابوسلیمان دارنی نے فرمایا کہ نفس کے مکاشفہ اور اشیائے غائبہ کے جاننے آنکھوں سے دیکھنے کا نام فراست ہے اور یہ ایمان کے متعلقہ مقالات سے ہے، یعنی بندہء مومن کا دل اور اس کا نفس نور قدسی سے متصف ہوتے ہیں تو کائنات کی ہر شیء اس بندہء مومن پر منکشف ہوجاتی ہے، اور تمام مخفی اور غائب اُمور اس کے علم اور مشاہدے میں آجاتے ہیں۔ ان تشریحات سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہء مومن جو اطاعت الٰہی میں علم وعمل، کا کمال رکھتا ہو حُب رسول، اور اُسوہء رسول کا جمال رکھتا ہو، اس کے دل پر انوار ذوالجلال کی برسات ہوتی ہو، وہ کائنات کو بچشم باطن دیکھتا اور قوت قدسیہ سے مسلح ہو کر جہاں چاہے جاسکتا اور تصرف کرسکتا ہے" ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے فرمایا

"والروح اذا كانت لطيفة يتبعها الجسد فى اللطافة فتسير بجسدها حيث شآئت و :

تتمتع بما شائت و تاوی الی ماشاء اللہ لھا کما وقع لبنیا علیہ الصلٰوۃ و السلام فی المعراج و لا تباعد من الاولیآء حیث طویت لھم الارض و حصل لھم ابدان مکتسبۃ متعددۃ و جدوھا فی اماکن مختلفۃ فی آن واحد و اللہ علی کل شئی قدیر" (مرقات: ج،۴ ص ۳۱)

ترجمہ: روح امر لطیف ہے اور جب بدن بھی لطیف ہو جائے تو وہ روح جسم سمیت جہاں چاہے سیر کرتی ہے، اور جس سے چاہے لطف اندوز ہوتی ہے، اور جہاں چاہے اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہے، جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ کے لئے معراج میں واقع ہوا ہے، یہ صفت اوّلیائے کرام سے بھی کوئی بعید نہیں کیونکہ ان کیلئے روئے زمین کو سمیٹا گیا ہے، ان کو تعدد اجسام حاصل ہیں، جو ایک ہی وقت میں کئی مقامات پر موجود ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر پسندیدہ چیز پر قادر ہے:

علامہ محمود آلوسی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ:

"ان جبریل علیہ السلام مع ظھورہ بین یدی النبی علیہ الصلوۃ و السلام فی صورۃ دحیۃ الکلبی او غیرہ لم یفارق سدرۃ المنتھیٰ" (روح المعانی ج ۱۲: ص ۳۷)

ترجمہ: بے شک جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے سامنے دحیہ کلبی یا کسی اور صحابی کی صورت میں حاضر ہوتے تھے، اس کے باوجود وہ سدرۃ المنتھی پر بھی موجود ہوتے،

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس تو سب سے زیادہ لطیف ہے بلکہ مخلوق نوری میں بھی آپ سے زیادہ لطیف کوئی مخلوق نہیں آپ کا متعدد مقامات پر ایک ہی وقت میں جلوہ گر ہونا کیوں ممکن نہیں؟ علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

"اما جسد مثالی تعلقت بہ روحہ ﷺ المجرد القدسیۃ، و لا مانع من ان یتعدد الاجساد المثالی الی ما لا یحصی من الاجساد مع تعلق روحہ القدسیہ علیہ من اللہ

تعالیٰ الف الف صلوۃ و تحیۃ بکل جسد منھا" (روح المعانی، جلد ۲۱ ص ۳۷)

ترجمہ : آپ کی روح مقدسہ کا تعلق آپ کے لاتعداد جسم مثالی کے ساتھ ہو، ہر ہر مثالی جسم پر اللہ تعالیٰ کروڑوں درود و نازل فرمائے پھر فرمایا: کہ **شیخ صفی الدین بن ابی منصور** اور **شیخ عبد الغفار**، نے **الشیخ ابو العباس الطنجی** سے نقل فرمایا کہ **:من انہ رای السمآء و الارض و العرش و الکرسی مملوءۃ من رسول** ﷺ **و یحل بہ السوال عن کیفیۃ رویۃ المتعددین لہ علیہ الصلوۃ و السلام فی زمان و احد فی اقطار متباعدۃ"**

ترجمہ : انہوں نے زمین، آسمان، عرش، کرسی کو نور مصطفٰی ﷺ سے **معمور دیکھا، اور اس سے** اس سوال کا حل بھی معلوم ہوا کہ متعدد لوگ ایک ہی وقت میں دور دراز زمین کے اطراف میں رسول ﷺ کی زیارت سے کیسے بہرہ ور ہوتے ہیں، علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان کا ایک شعر بھی نقل فرمایا ہے:

کاالشمس فی کبد السماء و ضوئھا

یغشی البلاد مشارقا و مغاربا

ترجمہ: آپ ﷺ کی مثال کائنات میں حاضر اور ناظر ہونیکی اسطرح ہے جیسے آسمان پر سورج ہے، اور اسکی روشنی نے پوری روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ملا علی قاری علیہ الرحمہ نقل فرماتے ہیں: **"و قد ورد ان الموتی یعلمون احوال الاحیاء و ما نزل بھم من شدۃ و رخاء"** (مرقات جلد ۴ ص ۹۷)

ترجمہ: حدیث میں آیا ہے کہ مردے زندوں کے حالات و واقعات کا علم رکھتے ہیں، ان کی تنگی، تکلیف اور خوشحالی کو بھی جانتے ہیں ثابت ہوا اہل برزخ اہل دنیا کے حالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں جب عام بندۂ مومن دنیا کے حالات و واقعات سے باخبر ہے تو رسول ﷺ کو روضہء انوار کے اندر رہتے ہوئے اپنی اُمت کے حالات و واقعات کا علم نہیں؟ رہا یہ کہ آپ ﷺ ہر مومن کی

قبر میں حاضر ہوتے ہیں، اسکے بارے میں ملا علی قاری علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں:

"قیل تصور صورته علیه الصلوۃ والسلام فلیشار الیه"

ترجمہ:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مثالی دکھائی جاتی ہے، اور اسکی طرف **"ھذا الرجل"** سے اشارہ کیا جاتا ہے، حاشیہ مشکوٰۃ میں ہے:

"قیل یکشف للمیت حتی یری النبی علیه السلام ھی بشری عظیمة"

ترجمہ: کہا گیا ہے کہ میت کے سامنے سے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو دیکھتا ہے، مومن کیلئے یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔

شارح بخاری امام ابن حجر علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"علی تقدیر صحته یحمتل ان یکون مفیدا بعض دون بعض" (مرقات جلد ۱ ص ۱۹۹)

ترجمہ: اگر حجابات کے اٹھائے جانے والا قول صحیح ہو تو پھر اس کا فائدہ بعض مردوں کو ہو سکتا ہے، امام کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بارگاہ خداوندی اور بارگاہ رسالت کے مقرب ہیں، ان کیلئے حجابات اٹھا دیئے جاتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود بندہ مومن کی قبر میں تشریف فرما نہیں ہوتے، اور یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ۳۳ پر جو تحریر کیا کہ:

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ ہر قبر میں آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم بنفس نفیس تشریف لیجاتے ہیں غلط ہے، ہدہد کا علم اور نظریہ دیکھے: **"وکون الھدھد یری الماء تحت الارض رواہ ابن ابی شیبه"** (روح المعانی جلد ۱۰ جز ۲ ص ۱۸۲)

ترجمہ: حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہدہد زمین کے نیچے پانی دیکھتا تھا، ایک پرندے کا علم اور اس کا دیکھنا اس کمال کا حامل ہے کہ زمین کی موٹی تہوں کے نیچے پانی دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے ،فضاء میں موجود یعنی حاضر، اور زمین کے نیچے چھپے اور بہتے ہوئے پانی کیلئے ناظر ہے، ہدہد پرندہ

ایک چھوٹا سا جانور ہے، اللہ کی مخلوق ہے اگر وہ ہوا میں اڑتے ہوئے زمین کی تہوں کے نیچے پانی دیکھ لے تو جائز ہے، اگر رسول ﷺ روضہ انور کے اندر موجود ہو کر اپنی اُمت اور اعمال اُمت کو دیکھ لیں تو یہ کیوں ممنوع ہے؟ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"وبا چندیں اختلافات وکثرت مذاہب کہ در علمائے اُمت است یک کس رادریں مسئلہ خلافے نیست کہ آنحضرت ﷺ بحقیقت حیات بے شائبہ مجاز وتوہم تاویل دائم وباقی است وبراعمال امت حاضروناظر، ومر طالبان حقیقت راومتوجہان آنحضرت ﷺ رامفیض ومربی است" (اسلوک اقراب السبل بالتوجہ الی سید الرسل، رسالہ ہژدم ص ۹۴۔۹۵)

ترجمہ: علمائے اُمت میں اختلافات اور کثرت مذاہب کے باوجود کسی شخص کو اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ بغیر کسی تاویل اور شائبہ مجاز کے اپنی حقیقی زندگی کے ساتھ دائم اور باقی ہیں، امت کے اعمال پر حاضر و ناظر ہیں، حقیقت کے طلبگار اور حاضرین بارگاہ کو فیض پہنچاتے اور ان کے مربی ہیں، اور یہی شیخ مجمع البرکات میں فرماتے ہیں: "وے علیہ السلام بر احوال واعمال امت مطلع است ہر مقربان وخاصان درگاہ خود مفیض وحاضروناظر است"

ترجمہ: حضور ﷺ اپنی امت کے حالات اور اعمال پر مطلع ہیں، اور جو ان کی بارگاہ رسالت میں مقرب اور خاص ہیں، انہیں فیض دیتے اور حاضر و ناظر ہیں۔

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "قال اذا رخلت المسجد اقول السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" (شفاء جلد دوم)

ترجمہ: جب میں مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اے نبی سلام ہو آپ ﷺ پر اور اللہ کی رحمت اور برکات آپ پر نازل ہوں، قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر مسجد میں کوئی نہ ہو تو کہو،

"السلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" (شفاء، ج ۲)

ان حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ رسول ﷺ کی روح مقدسہ تمام مساجد اور مومنین کے گھروں میں موجود ہوتی ہے،، جیسا کہ اسکی شرح میں ملا علی قاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لان روح النبی علیہ السلام حاضر فی بیوت اھل الاسلام،،

امام غزالی رضی اللہ عنہ نے احیاء العلوم جلد اول باب چہارم، فصل سوم نماز کی باطنی شرائط کا تذکرہ فرماتے ہوئے فرمایا:

و قبل قولک السلام علیک احضر شخصه الکریم فی قلبک و لیصدق املک فی انه یبلغه و یرد علیک ماھو اوفی منه" (مرقات۔ جلد۔ ۲۔ ۳۴۲)

ترجمہ: اے نمازی السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ کہنے سے پہلے آپ ﷺ کی ذات کریمہ کو اپنے دل میں حاضر کر اور اس بات کا پختہ یقین کر کہ تیرا سلام آپ ﷺ کو پہنچ رہا ہے اور آپ ﷺ اس سے زیادہ کامل اور مکمل سلام کا جواب دے رہے ہیں۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

"وھم فی یقظتھم یشاھدون الملائکة و ارواح الانبیاء و یسمعون منھم اصواتا و یقیتبسون منھم فوائد" (المنقذ من الضلال، روح المعانی، ج ۱۲ ص ۴۰)

ترجمہ: اوّلیائے کرام علیہم السلام حالت بیداری میں ملائکہ کو دیکھتے اور ارواح انبیاء علیہم السلام کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کی آوازوں کو سنتے ہیں اور ان سے بے شمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے اپنی کتاب قانون التاویل میں فرمایا:

"ذھبت الصوفیة الی انه اذا حصل الانسان طھارة النفس و تزکیة القلب و قطع العلائق و جسم مواد اسباب الدنیا من الجاہ و المال و الخلطة بالجنس و الاقبال علی اللہ تعالیٰ بالکلیة علما و عملا، مستمرا کشفت له القلوب و رای الملائکة و سمع کلامھم و اطلع علی ارواح الانبیاء

والملائکۃوسماع کلامھم"(روح المعانی۔جلد ۲۱،ص ۴۰)

ترجمہ: صوفیاء کا کہنا ہے کہ جب انسان کو طہارت نفس، تزکیہ قلب، حاصل ہوجائے، جسمانی خرابیوں، دنیاوی مال ومرتبہ کی خواہش، اورلوگوں کے ساتھ میل جول کی محافل سے قطع تعلق کرے، علم اور عمل پر مسلسل کاربند رہے، اور ہمہ تن اللہ تعالیٰ کے حضور متوجہ رہے تو اس کو دل کا کشف حاصل ہوتا ہے، وہ فرشتوں کو دیکھتا ہے انکی گفتگو کو سنتا ارواح انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ پر مطلع ہوتا اوران کا کلام سنتا ہے، جب آپ ﷺ کے غلاموں کا یہ حال ہے کہ وہ ملائکہ کرام کو دیکھتے اوران کی گفتگو کو سنتے اوران سے فوائد کثیرہ حاصل کرتے ہیں، تو نبی کریم ﷺ کیلئے اُمت کو دیکھنا اوران کے اعمال پر حاضر وناظر ہونا کیسے محال اور ناممکن ہے؟

فرشتہ اعمال، اعمال انسانی پر حاضر وناظر ہے، حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ نے نقل فرمایا:

"**ای المدبر لھذہ الامور الذی ھو شھید علی اعمال عبادہ یرفع الیہ جلیلھا و حقیرھا صغیرھا و کبیرھا**" (ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۵۷)

یعنی ان امور کی تدبیر پر مامور فرشتہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے اعمال پر حاضر وناظر ہے، عمل جلیل ہو یا حقیر، صغیر ہو یا کبیر وہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کرکے دیوان اعمال میں جمع کرادیتا ہے،، مزید فرمایا: "**وترفع الاعمال الی دیوانھا سماء الدنیا مسافۃ ما بینھا و بین الارض مسیرۃ خمسمائۃ سنۃ و سمک السمآء خمس مائۃ سنۃ' و مک السماء خمسائۃ سنۃ**"

ترجمہ: بندوں کے اعمال دیوان اعمال میں اُٹھائے جاتے ہیں، اور یہ دیوان یعنی دفتر اعمال آسمان دنیا کے اوپر ہے، زمین اور آسمان کی درمیانی مسافت پانچ سو سال کی ہے، اور آسمان کی درمیانی مسافت بھی پانچ سو سال کی ہے، مجاہد، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے کہ یہ ہزار برس کی مسافت ایک آنکھ جھپکنے کی دیر میں طے کرتا ہے، الفاظ یہ ہیں:

”ولکنہ یقطعھا فی طرفۃ عین ولھذا قال تعالیٰ فی یوم کان مقداوہ

الف سنۃ مما تعدون“ (ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۵۷)

ثابت ہوا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو چشم زدن میں ہزار سال کی مسافت طے کرنیکی قوت دے رکھی ہے، مندرجہ بالا تمام عبارات، تصریحات سے روز روشن کی طرح ثابت اور واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو، حاضر و ناظر ہونیکی طاقت دے رکھی ہے، مخلوق خواہ نبی مرسل ہو یا مقرب فرشتہ اس کیلئے اس صفت کو ثابت کرنا شرک نہیں، رسول ﷺ کی ذات گرامی تو اس سے کہیں ارفع اور اعلیٰ ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”و کذالک للعبد اذا واظب علی الطاعات بلغ المقام الذی یقول اللہ تعالی کنت لہ سمعا و بصر افاذا صار نور جلال اللہ سمعا لہ سمع القریب و البعید و اذا صار ذالک النور بصر الہ رای القریب و البعید و اذا صار ذالک النور یدا لہ قدر علی التصرف فی الصعب و السھل و القریب و البعید“ (کبیر۔ جلد۔ ۲۱۔ ۹۱)

ترجمہ: اسی طرح جب بندہ عبادات اور دیگر نیکیوں پر ہمیشگی کرتا ہے تو وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ”کنت لہ سمعا و بصرا“ فرمایا ہے جب اللہ کے جلال کا نور اسکی سمع ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی آوازوں کو سننے لگ جاتا ہے اور جب یہی نور اس کی بصر ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھنے لگ جاتا ہے، اور جب یہی نور جلال اس کا ہاتھ ہو جاتا ہے تو وہ مشکل اور آسانی میں دور اور قریب تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے، جب اوّلیائے کاملین کی یہ شان ہے تو وہ جو ذات باری تعالیٰ کی ذات و صفات کی مظہر ہے اسکی کیا شان ہوگی؟ جنہوں نے خود ارشاد فرمایا:

”انی اریٰ مالا ترون، و اسمع مالا تسمعون“ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص ۴۵۷)

میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم دیکھ نہیں سکتے، وہ سنتا ہوں جو تم سن نہیں سکتے،،

مؤلف نے کتابچہ کے ص ''۵۵'' پر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہر جا حاضر و ناظر نہ ہونیکے دلائل کے عنوان سے تحریر کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زندگی کے تین دور ہیں۔

پہلا دور : وہ ہے جبکہ ابھی تک آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی روح جسم اقدس میں جلوہ گر نہیں ہوئی تھی، توضیحاً کہا جائے گا اہل سنت و جماعت کا عقیدہ نہیں، بلکہ یہ کہنا، تحریر کرنا عقل و نقل کے خلاف ہے۔

عقل کے خلاف اسطرح ہے کہ حاضر و ناظر ہونیکے لئے روح و جسم کا ہونا ضروری ہے، جب روح ہے ہی نہیں تو حاضر و ناظر کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے عقل و شعور سے دور رہ کر یہ تحریر کیا ہے۔ **دوسرا دور** : جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ظاہر ہو کر غیر آباد دنیا کو آباد کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے وجود مسعود سے کائنات کو مستفیض فرمایا۔

جواب : یہ درست ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ذات، صفات اور منصب نبوت و رسالت سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو مستفیض فرمایا اور اللہ تعالیٰ کیطرف سے بطور انعام اور اکرام ''**وما ارسلنک الا رحمته العالمین**'' کا لقب حاصل کیا اور اسی دور کیلئے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حاضر و ناظر بنا کر بھجیا گیا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : ''**انا ارسلنک شاهدا ومبشرا و نذیرا و داعیا الی اللہ باذنه و سراجا منیرا (۲) ویکون الرسول علیکم شهیدا (۳) وجئنا بک علی هوء لآء شهیدا**''

اور اس عنوان میں احادیث مبارکہ اور اقوال علماء کا ایک قابل قدر ذخیرہ پہلے نقل ہو چکا ہے اسی سے ہی استفادہ کیا جائے۔

تیسرا دور : وہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہو کر عالم برزخ میں قدم رکھا، اس دور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم حاضر اور ناظر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم دنیاوی حیات اور اوصاف ولوازمات

کے ساتھ روضہء اطہر میں زندہ ہیں اور اعمال امت پر حاضر و ناظر ہیں۔ تفصیلی بحث اور دلائل پہلے ذکر ہو چکے ہیں، مؤلف کا دعوٰی غلط اور بے بنیاد ہے، فقہاء کرام کے نزدیک یا حاضر یا ناظر کہنا کفر نہیں یعنی نبی کریم ﷺ کو یا حاضر، یا ناظر کہا جائے تو یہ کفر نہیں کیونکہ صاحب درمختار نے فرمایا: "**یا حاضر یا ناظر لیس بکفر**" (جلد ۴ ص ۲۵۹)

اس پر علامہ ابن عابدین الشامی علیہ الرحمہ نے فرمایا: "**فان الحضور بمعنی العلم شائع**" کیونکہ حضور کا معنیٰ مشہور علم ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"**مایکون من نجویٰ ثلاثة الا ھو رابعھم**"

ترجمہ: نہیں ہوتا تین کا مشہور مگر اللہ کا چوتھا ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تینوں کے مشورے کا علم ہوتا ہے "**والناظر بمعنی الرؤیة**" ناظر دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "**الم یعلم بان اللہ یرٰی فالمعنی یا عالم من یرٰی**" (بزازیہ)

ترجمہ: کیا نہیں جانتا کہ اللہ دیکھتا ہے پس اس کے معنی یہ ہوئے کہ اے عالم اے دیکھنے والے

خلاصہ یہ ہے کہ حاضر کا معنیٰ عالم ہے، اور ناظر کا معنیٰ دیکھنے والا ہے۔

اپنی اُمت کے احوال و واقعات کے آپ ﷺ عالم بھی ہیں، اور دیکھنے والے بھی ہیں دلائل پہلے دیئے جا چکے ہیں، انبیائے سابقین کے حالات و واقعات قرآن نے بیان کئے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن آپ ﷺ کو سکھایا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیائے سابقین کے حالات و واقعات کا علم آپ ﷺ کو دیا، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کیلئے فرمایا: "**ذالک من انباء الغیب و ما کنت لدیھم الایة**" آپ ﷺ اپنے وجود مسعود کے اعتبار سے اس وقت موجود نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان کا علم عطا فرمایا لہذا آپ ﷺ ان حالات و واقعات کے عالم ہوئے، یہ معنیٰ حضور کا ہے، یعنی علمی اعتبار سے آپ تشریف آوری کے

بعد حاضر اور عالم ہیں، اور ناظر اس اعتبار سے ہیں کہ ابتدائے خلق سے لے کر قیام قیامت تک ہر شی ء کا آپ ﷺ کو مشاہدہ اور معائنہ کرایا گیا ہے، جیسا کہ دارمی اور ترمذی میں آپ ﷺ کا یہ فرمان "فعلمت مافی السمٰوٰت والارض فتجلی لی کل شیء" بطور دلیل موجود ہے ، انبیائے سابقین کے زمانہ میں آپ ﷺ کا جسمانی طور پر موجود ہونا محال شرعی ہے، کیونکہ آپ ﷺ خاتم النبین ہیں، جب اللہ نے آپ ﷺ کو انبیائے سابقین کے حالات بتادیئے تو آپ ﷺ ان کیلئے عالم ہیں، بقول علامہ شامی علیہ الرحمہ حضور علم کے معنی میں مشہور ہے تو آپ ﷺ حاضر بھی ہوئے ، حضور اور علم کے درمیان لفظی اور معنوی تعلق ہے۔ لہٰذا آپ حاضر اور ناظر ہیں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا انکار کرنا جہالت ہے،،

مؤلف نے دوسرے دور: میں تحریر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نبی اسرائیل میں (۱) اسری (۲) لنریہ فرما کر آپ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونیکی نفی فرمائی ہے۔

جواباً کہا جائیگا کہ مؤلف کو اہل سنت کا عقیدہ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، اہل سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ ﷺ ساری کائنات کو ملاحظہ فرماتے ہیں، اپنی اُمت کے حالات اور اعمال پر مطلع ہیں، روئے زمین کف دست کیطرح آپ ﷺ کے سامنے ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے خود فرمایا : "ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا"

اور آپ ﷺ جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں، آپ ﷺ اپنے وجود مثالی کے ساتھ متعدد مقامات پر تشریف فرما ہوسکتے ہیں، تفصیل پہلے آچکی ہے دیکھ لی جائے ، دور ثالث کی دلیل جو فتاوٰی عالمگیریہ سے نقل کی ہے اس کا جواب بھی پہلے تفصیل کے ساتھ نقل ہو چکا ہے، اور معتبر فتاوٰی اور جید فقہائے کی عبارات سے ثابت کیا گیا ہے وہ شخص کافر نہیں ہوگا۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۶۳ پر السلام علیک ایھا البنی

کے تحت جوابات کے ضمن میں تحریر کیا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''کہ اگر گویند کہ خطاب حاضر را بود وآنحضرت ﷺ دریں مقام نہ حاضر است پس توجہیہ ایں خطاب چہ باشد جوابش آنست کہ چوں ورود ایں کلمہ دراصل یعنی شب معراج بصیغہء خطاب بود دیگر تغیرش ندادند و برہماں اصل گزاشتند''

ترجمہ: اگر کہیں کہ خطاب تو حاضر کو ہوتا ہے، اور آپ ﷺ اس مقام میں حاضر نہیں، تو اس خطاب کی توجیہ کیا ہوگی؟

جواب اسکا یہ ہے کہ یہ کلمہ دراصل شب معراج میں بصیغہء خطاب وارد ہوا ہے، اور اس کو اسی پر برقرار رکھا گیا،

توضیحاً کہا جاتا ہے: یہی شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ ، کتاب الصلوۃ، باب التشہد اور مدراج النبوت جلد اول باب پنجم ذکر فضائل آنحضرت ﷺ میں نقل

فرماتے ہیں: ''کہ وبعضے عرفاء گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است درذرائر موجودات وافراد ممکنات پس آنحضرت ﷺ درذوات مصلیان موجود وحاضر است پس مصلی رابا ید کہ ازیں معنی آگاہ باشد وازیں شہود غافل نہ بود تا انوار قرب واسرار معرفت منور وفائز گردو''

ترجمہ: بعض عارفین نے کہا ہے کہ التحیات میں یہ خطاب اسلئے ہے کہ حقیقت محمدیہ موجودات کے ذرہ ذرہ میں اور ممکنات کے ہر ہر فرد میں سرایت کئے ہوئے ہے، پس حضور ﷺ نمازیوں کی ذات میں موجود اور حاضر ہیں، نمازی کو چاہیے کہ اس معنی سے آگاہ رہے اور اس شہود سے غافل نہ ہو تا کہ قرب کے نور اور اسرار معرفت سے کامیاب ہو۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ مولف نے اس عبارت سے یہ ثابت کیا ہے کہ شیخ محقق کا عقیدہ رسول ﷺ کے حاضر ہونے کے بارے میں منفی اور انکار پر مبنی ہے جبکہ **شیخ رحمہ اللہ کا عقیدہ** رسول ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے بارے میں مثبت اور اقراری ہے، **بلکہ شیخ محقق نے** اپنی ہر دو کتب، میں صاف تحریر فرمایا ہے۔ موجودات اور ممکنات کے ذرے ذرے میں آپ ﷺ کی حقیقت جلوہ گر اور ہر نمازی کے وجود میں موجود ہے، نمازی کو اپنی ذات میں حاضر و ناظر جان کر **السلام علیک یا ایھا النبی** کہنا چاہیے، تنویر الابصار میں ہے: **"و یقصد بالفاظ التشھد الا نشاء"**

ترجمہ: التحیات کے الفاظ پڑھتے وقت نمازی کا ارادہ شب معراج کا واقعہ بطور حکایت نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ارادہ انشاء ہونا چاہیے، یعنی نمازی کا ارادہ یہ نہیں ہونا چاہیے چونکہ یہ التحیات شب معراج اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے درمیان ہوا تھا میں اسکو قصہ، واقعہ اور حکایت کے طور پر پڑھ رہا ہوں، بلکہ یہ ارادہ کر کے پڑھنا چاہیے کہ یہ واقعہ التحیات ابھی ہو رہا ہے،، اور میں رسول ﷺ کو حاضر اور ناظر جان کر **السلام علیک ایھا النبی** کہہ رہا ہوں۔

درمختار میں ہے **کانہ یحی اللہ تعالیٰ** اپنے نبی کو زندہ کر کے ان پر سلام بھیج رہا ہے اور حضور ﷺ بحالت حیات اپنے آپ اور اپنے دوستوں، اللہ کے نیک بندوں پر سلام فرما رہے ہیں، صاحب درمختار نے فرمایا:

"ظاھرہ ان ضمیر علینا للحاضر لا حکایۃ سلام اللہ تعالی" (ایضا)

علیک میں کاف ضمیر حاضر کیلئے ہے اللہ تعالیٰ کا سلام حکایت نہیں انشاء ہے پھر علینا میں ضمیر جمع متکلم بھی حاضرین کیلئے ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ السلام علیک اللہ کا سلام ہے جو حکایت کیلئے نہیں بلکہ انشاء کیلئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر وقت ملاقات میں سلامتی نازل فرما رہا ہے، حکایت یا واقعہ بیان نہیں فرما رہا،،

بہر حال شیخ محقق عبدالحق دہلوی اور فقہائے کرام کے اقوال سے ثابت ہوا کہ نمازی کو السلام علیک یاایھاالنبی کہنے کے وقت سے رسول ﷺ کی ذات اقدس کو حاضروناظر ماننا پڑیگا

مؤلف : کتابچہ نے ص ۶۴ پر تنبیہ کے عنوان میں تحریر کیا ہے کہ قرآن میں یافرعون مثبورا وارد ہے اس میں یافرعون کا معنی ہے کہ اے فرعون، سب لوگ حرف ندا جو حاضر کیلئے ہے کے ساتھ پڑھتے ہیں، کیا اس سے فرعون کا حاضروناظر ثابت ہوجائے گا؟

توضیحاً کہا جائے گا کہ مولف نے الفاظ قرآنیہ سے معارضہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ کوشش فضول بے بنیاد اور کم علمی کی پیدوار ہے (۱) نمازی السلام علیک ایھاالنبی کہنے سے پہلے ذات رسول ﷺ کو ارادتاً حاضر جان کر کہے گا، اور یہ ارادہ کرے گا کہ میں واقعہ معراج میں سلام کا واقعہ بطور حکایت نہیں پڑھ رہا بلکہ یہ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ سلام وکلام ابھی ہورہا ہے جیسا کہ

درمختار کی عبارت سے واضح ہے۔ اور یافرعون مثبورا کی صورت حکایت کی ہے، مسلمان دن و رات میں کم از کم پانچ مرتبہ السلام علیک ایھاالنبی کہنے کے پابند ہیں جبکہ تلاوت قرآن سنت ہے پھر ذکر فرعون سے شریعت محمدیہ کا کوئی فرض، نفل سنت وابستہ نہیں، اسکو حاضروناظر کرنے، سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جبکہ دوران نماز الفاظ تشہد پڑھنا واجب ہے، بوقت تشہد علمائے اُمت نے حکایت کی بجائے انشاء کا قول کیا اور حکم دیا ہے کہ جو نماز کے ساتھ مختص ہے فرعون کے حاضروناظر جاننے ماننے کی کیا ضرورت اور کیا مجبوری ہے۔

۲) مؤلف کا یہ کہنا کہ حرف ندا (یاء) حاضر کیلئے ہے، غلط ہے بلکہ یاء ندائے قریب، ندائے بعید اور ندائے متوسط کیلئے وضع ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"یاء حرف لا اسم و فعل علی الصحیح و ضع لنداء البعید، و قیل لمطلق النداء او مشترکة بین اقسامه" (روح المعانی۔ جلد اول ص ۱۸۱)

ترجمہ: یاحرف ہے اسم، فعل نہیں یہی صحیح ہے۔

۲) اسکی وضع ندائے بعید کیلئے ہے، یعنی جو غائب اور دور ہو،

۳) یا قریب، بعید اور متوسط کیلئے ہے امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے فرمایا: یاء ندائے بعید کا حرف ہے، یعنی دور کے آدمی کو پکارنے کے واسطے ہے (اتقان) یا موضوع است بروئے ندائے قریب، و بعید و متوسط و زمحشری گفتہ کو موضوع است برائے بعید حقیقی یا حکمی،،

(شرح مائۃ عامل، فوائد رفیعہ)

خلاصہ یہ ہے کہ یافرعون مثبورا ایں بندوں کے لحاظ سے بعید کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے لحاظ سے قریب کیلئے ہے مسلمان بطور حکایت یافرعون مثبورا پڑھتے ہیں، التحیات میں **السلام علیک یاایھا النبی** کہنے سے پہلے نبی کریم ﷺ کی ذات کو حاضر و ناظر جان کر پڑھنے کا فرمایا گیا ہے، لہذا یہاں یاء قریب کیلئے ہے۔

مؤلف: نے جواب نمبر ۲، میں تحریر کیا کہ اگر مقصود انشاء ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ سلام آپ ﷺ تک فرشتے پہنچاتے ہیں اسلئے کلمات خطاب اور نداء سے پڑھا جاتا ہے،،
(ص ۶۴، ۶۵)

توضیحاً کہا جائے گا کہ مؤلف نے علمائے اُمت کے فرمودات پڑھے بغیر یہ کہہ دیا ہے کہ اگر مقصود انشاء ہو تو پھر فرشتے سلام پہنچاتے ہیں، عبدالحق محدث دہلوی کا قول اشعۃ اللمعات اور مدارج النبوت سے صاحب تنویر الابصار کا قول تنویر الابصار سے اور صاحب درمختار کا قول درمختار سے ملا علی قاری کی مرقات، امام غزالی کی احیاء العلوم سے نقل ہو چکا کہ حضور ﷺ کو نمازی اپنے اندر حاضر جان کر سلام عرض کریگا۔ اور بقول شیخ محقق کہ

"پس آنحضرت ﷺ در ذوات مصلیان موجود و حاضر است"

تو پھر فرشتے سلام کیوں پہنچائیں گے اس وقت نمازی براہ راست سلام پیش کرتا ہے فرشتوں کے واسطے کی کیا ضرورت ہے، بوقت تشہد حضور ﷺ کو حاضر وناظر جاننا مخصوص مقام، مخصوص وقت، مخصوص آدمی مخصوص الفاظ کے ذریعے سے ہے، اور یہ اُمور شرعیہ توقیفیہ ہیں، مااورشماء کی سوچ، فکر، اور علمی کاوش سے بلند وبالا ہیں، علمائے اُمت قرآن وحدیث کی گہرائیوں میں اُترے، علوم وفنون کی دنیا کو چھان مارا، ایمان، اعتقاد اور عمل کی بھینٹ چڑھے، تصوف اور روحانیت کی جگہوں کی خاک اُڑائی، روح نماز کی عظمت میں دم بخود ہوئے، اجابت وقبولیت کی فکر میں جاں بلب ہوئے، توحید ورسالت کے سمندر ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہوئے، ہدایت یزدانی سے ہمکنار رہوئے اور ذات نبوی سے قرب میسر آنے کے بعد فرمایا: کہ تشہد کو محض حکایت کے طور پر نہیں بلکہ واقعہ جدیدہ کا انشاء کر کے پڑھا جائے، رہا دوستوں، بھائیوں، اور رشتہ داروں کو بصیغائے خطاب سے خطوط لکھنا، یہ ایک امر عرفی اور عادی ہے جو اُمور شرعیہ کیلئے وجہ استدلال یا موجب حجت نہیں خط لکھنے والا اپنے تصور اور تخیل میں شخص غائب کو حاضر تصور کر کے بذریعہ تحریر اس سے ہم کلام ہو جاتا ہے کیا غائب شخص کو بدوں خطاب خط لکھنے کا کوئی اور بھی طریقہ ہے؟ غائب شخص کو خطاب کیا جا سکتا ہے دیکھئے سورہ بقرہ میں رسول ﷺ کے دور کے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا: اور تقریباً زیادہ تر خطابات اور واقعات انہی کے بیان فرمائے گئے، حالانکہ یہ اس وقت موجود نہ تھے، خلاصہ یہ ہے کہ غائب کو حاضر جیسے الفاظ سے خط لکھنا امر عرفی اور امر عادی ہے رسول ﷺ کو تشہد کے وقت حاضر وناظر جاننا امر شرعی اور تعبدی ہے دونوں کے درمیان کوئی مماثلت نہیں، ”فافہم“

☆☆☆☆☆

مفاتیح الغیب خمس

مؤلف: نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ص نمبر ۲۹ پر نقل کی جو اسطرح سے ہے، **"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال مفاتیح الغیب خمس لا یعلمها الا اللہ و لا یعلم متی یاتی المطر احد الا اللہ و لا تدری نفس بای ارض تموت، و لا یعلم متی تقوم الساعۃ الا اللہ"** (صحیح البخاری جلد ۲، ص ۱۸۶)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مفاتیح الغیب (غیب کے خزانے) پانچ ہیں، جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۔ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا؟

۲۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ارحام میں کیا ہے؟ (نر ہے، مادہ سفید یا سیاہ وغیرہ)

۳۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب آئے گی؟

۴۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کب آئیگی؟

۵۔اور کسی جاندار کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں مرے گا؟

فائدہ کے تحت لکھا کہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانچ علوم کے جاننے میں اللہ تعالیٰ منفرد ہیں۔ اوراس کے سواان چیزوں کا علم اور کسی کو نہیں، نہ کسی برگزیدہ پیغمبر کو اور نہ کسی مقرب فرشتے کو، اور یہ عقیدہ دین میں اتنا ضروری اوراس قدرواضح ہے۔ اور قطعی ہے۔ کہ اس کی محالفت کرنے والا قرآن کا منکر سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ امام زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”من ادعی انہ یعلم شیا من ھذہ الخمس فقد کفر القران العظیم“

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ص ۱۶۱ :ج۷)

توضیحاً کہا جائے گا کہ غیب مصدر ہے اور یہ غابت الشّمس سے ماخوذ ہے کہ جب سورج غروب ہو جائے۔ تو کہا جاتا ہے غابت الشّمس یعنی سورج غروب ہو گیا، اور غیب کا لفظ اس مخفی شیء کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جس پر کوئی قرینہ یا دلیل قائم نہ ہو، اور مخفی شی کو غائب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے غائب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی شیء غائب نہیں ہے، اس پوشیدہ چیز کو مخلوق سے اوجھل اور غیر محسوس ہونے کی وجہ سے شیء غائب کہا جاتا ہے، قرآن حکیم نے بھی ارشاد فرمایا: **”وعندہ مقایتح الغیب الایہ“**

علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتفی من رسول، فالخواص یجوز ان

یعلم الغیب فی قضیۃ او قضایا لا یکفرو

محمل مافی الروضۃ و من ارعی علمہ فی سائر القضایا یکفر و محمل

مافی اصلھا، فالا وجہ ما اقتضاہ کلام النووی من عدم الکفر“

ترجمہ: اللہ ہی غیب کا جاننے والا ہے، وہ اپنے غیب خاص پر عوام الناس میں سے کسی کو مسلط نہیں فرماتا ہاں اپنے پسندیدہ رسولوں میں سے جس کو چاہے اپنے غیب خاص پر مطلع فرماتا ہے

۔یہ نص ہے کہ خواص کیلئے بعض امور غائبہ کا علم رکھنا جائز ہے اور یہ کہنا کہ خواص رسول ﷺ وہ علم غیب جانتے ہیں جو غیب اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے کفر نہیں، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا ہے، کہ خواص یعنی رسول ﷺ کیلئے ان پانچ امور میں سے بعض کا علم ثابت کرنا کفر نہیں ،علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہوئے علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"لعل الحق ان یقال ان علم الغیب المنفی عن عنیرہ جل و علاھو ما کان للشخص لذاته ای بلاو اسطة فی ثبو ته له" (روح المعانی جز، ۲۰:ص ۱۱)

ترجمہ : حق بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے ،عقیدہ رکھا جائے کہ جس غیب کی اللہ کے سوا ،مخلوق سے نفی کی گئی ہے، وہ غیب ہے جو بلاوسطہ ثابت کیا جائے اور اسکی ذات کے اعتبار سے مانا جائے یعنی وہ ذاتی طور پر جانتا ہے، اگر غیر خدا یعنی انبیاء کرام، بالخصوص رسول ﷺ کیلئے جو بھی غیب ثابت کیا جاتا ہے۔ وہ بالواسطہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم غیب کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ اوراس غیب جاننے والے کو منکر قرآن یعنی کافر کہنا غلط ہے۔ بلکہ کافر کہنے والا شاید خود اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے،، امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب قواطع الاسلام میں نقل فرمایا جیسا کہ روح المعانی میں ہے: **"ففی بیان قواطع الاسلام تالیف العلامة ابن حجر بعد الرد علی من أکفر من قیل له أتعلم الغیب فقال نعم"** (روح المعانی)

قواطع الاسلام، جو علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔ اس میں ہے کہ ایک شخص سے پوچھا گیا کہ تم غیب جانتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ہاں میں جانتا ہوں اسکو کافر نہیں کہا جائیگا، ان مفسرین اور محدثین کی تصریحات سے ثابت ہوا کہ غیب خاص جو اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے۔ اس کا رسول ﷺ کیلئے ثابت کرنا کفر یا انکار قرآن نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح اعلان فرما دیا کہ وہ اپنے غیب خاص طور پر عوام الناس کو نہیں بلکہ پسندیدہ رسولوں میں سے جسکو چاہے مطلع

فرماتا ہے،علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قال القسطلانی ذکر رسول ﷺ خمسا و ان کان الغیب لا متناهی لا ن العدد لا ینفی زائداعلیه و لانّ هذه الخمسه هی التی کانوا یدعون علمها، و فی التعلیل الاخیر نظر، و انه یجوز ان یطلع اللہ تعالی بعض اصفیائه علی احدی هذه الخمس و یرزقه عزو جل العلم بذالک فی الجملة و علمها الخاص به جل و علاما کان علی و جه الاحاطة و الشمول لاحوال الکل منها و تفصیله علی و جه الاتم"

ترجمہ: امام ابن حجر قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ غیبوں کی کوئی انتہا نہیں لیکن رسول ﷺ نے صرف پانچ غیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔جن کے متعلق وہ مشرکین سوال کیا کرتے تھے۔امام نے جوآخری وجہ بیان کی ہے، وہ محل نظر ہے۔اس لئے کہ یہ جائز ہے اللہ تعالیٰ اپنے بعض پسندیدہ اشخاص کوان پانچ غیبوں میں سے کسی ایک غیب پر مطلع فرمائے،اورکسی وقت بھی وہ علم اس کوعطافرمادے۔اورجوعلم اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے۔وہ علم ان میں ہرایک کیلئے محیط اورہر ایک کے حالات اورکیفیات کوشامل ہے۔اوراسکی مکمل تفصیل اللہ ہی کومعلوم ہے۔علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "وفی شرح المناوی الکبیر للجامع الصغیر فی الکلام علی حدیث بریدة السابق، خمس لا یعلمهن الا اللہ علی وجه الاحاطة و الشمول کلیا و جزیا فلا ینافیه اطلاع اللہ تعالی بعض خواصه علی المغیبات حتی من هذه الخمس لانها جزیات معدودة و انکار المعتزلة لذالک مکابرة"

(روح المعانی ج، ۲۱،ص ۱۲)

شرح مناوی کبیر میں منقول ہے کہ حدیث بریدہ جس کاذکر پہلے ہوچکا ہے۔کہ پانچ امورکاعلم اللہ کے سواکسی کونہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کاعلم ہرہرکلی اورہرہرجزی کومحیط اوران پرمشتمل ہے۔مفصل ہے۔اگراللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے کویعنی رسول ﷺ کوبعض امور پر

مطلع فرمائے، بلکہ اگر ان پانچ اموریں سے عطا فرمادے تو یہ اس کے منافی نہیں، یہ تو چند غیب ہیں، فرقہ معتزلہ کا انکار کرنا کہ یہ پانچ غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ڈھٹائی اور سینہ زوری ہے، مندرجہ بالا عبارات سے ثابت ہوا۔ کہ اللہ کا علم محیط اور کائنات کی ہر ہر شئے کو شامل ہے۔ اور وہ ذاتی علم ہے، اسی طرح ان پانچ امور کا علم جو ذاتی اور تفصیلی ہے۔ وہ اللہ ہی کیلئے مختص ہے۔ لیکن یہ بھی جائز ہے، ممنوع یا کفر نہیں کہ اللہ ان غیوب خمسہ کا علم یا ان میں سے کسی ایک غیب کا علم اپنے خاص بندوں کو عطا فرمادے، اور شرح مناوی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مطلقاً رسول ﷺ سے ہر قسم کے غیب کی نفی کرنا اہل سنت و جماعت کا عقیدہ نہیں بلکہ فرقہ ضالہ معتزلہ کا ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفاء اور امام قسطلانی نے مواھب اللدنیہ میں رسول ﷺ کے بے شمار اخبار بالغیب کو نقل فرمایا ہے، علامہ محمود رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا

: ”وذکر القسطلانی انہ عزوجل اذاامر بالغیث وسوقہ الی ماشاء من الاماکن علمتہ الملائکۃ المؤکلون بہ ومن شاء سبحانہ من خلقہ عزوجل وکذا اذا ارادتبارک وتعالی خلق شخص فی رحم یعلم سبحانہ الملک المؤکل بالرحم بمایرید جل وعلا کمایدل علیہ مااخرجہ التجادی عن انس بن مالک عن النبیؐ ﷺ قال انّ اللہ تعالی وکلّ بالرحم ملکا یقول یارب نطفۃ، یارب علقۃ یاربّ مضغۃ فاذا اراد اللہ تعالی ان یقضی خلقہ قال أذکر ام انثی، شقی ام سعید فما الرزق والاجل، فیکتب فی بطن امہ فحینئذ یعلم بذالک الملک ومن شاء اللہ تعالی من خلقہ عزوجل‘

(روح المعانی جز، ۲۱، ص ۱۱۲)

ترجمہ: امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ بارش برسانے کا حکم فرماتا ہے۔ مامور فرشتوں کو ان جگہوں کا علم ہوتا ہے کہ کہاں کہاں بارش برسانی ہے۔ جس مخلوق پر اور جس جگہ

برسانی مقصود ہوتی ہے۔فرشتے وہاں بارش برساتے ہیں،اوراسی طرح اللہ تعالیٰ رحم میں جب انسان کو پیدا کرنا چاہتا ہے،تو رحم پر مامور فرشتے کواس کے متعلق بتا دیتا ہے۔وہ فرشتہ کہتا ہے کہ رحم میں نطفہ ہے،اے میرے پروردگار!اب جما ہوا خون ہے، پھر کہتا ہے،اے میرے ربّ!اب بوٹی ہے۔اور جب اللہ تعالیٰ اس کو مکمل پیدا کرنا چاہتا ہے،تو فرشتہ کو بتا دیتا ہے۔مامور فرشتہ عرض کرتا ہے،اے میرے ربّ!یہ مذکر ہوگا یا مونث، بدبخت ہوگا یا نیک بخت ہوگا اس کا رزق کیا ہوگا؟اور یہ کتنی زندگی پائے گا، یہ سب کچھ شکم مادر میں ہی لکھ دیا جاتا ہے۔اس تحریر کے بعد اس مخلوق کی نسبت فرشتے اور باقی لوگوں کا علم ہوتا ہے۔ان تمام امور کے باوجود اوران علوم ملائکہ کے باوجود وہ اس علم غیب جو خاصہء خداوندی ہے۔کہ ساتھ کوئی منافات اور تعارض لازم نہیں آتا کیونکہ امور خمسہ کا علم جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔وہ ذاتی ،تفصیلی اور غیر متناہی ہے۔بارش کے معاملات کا علم اور تخلیق انسانی کے مراحل،نیک و بد ہونے کا علم ،مصدر رزق اور روزی کے ذرائع کا علم،زندگی کا تعین کہ اسکی عمر کتنے سال، کتنے مہینے اور کتنے دن ہوگی کس حال میں فوت ہوگا؟یہ سب اللہ کے بتانے سے ہی معلوم ہیں، گویا یہ جملہ علوم متناہی اور عطائی ہیں اللہ تعالیٰ کے علم ذاتی تفصیلی کے ساتھ ان علوم کا کوئی ٹکراؤ نہیں۔

امام حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **"من ادعی علم شیء من الخمس غیر مستدہ الی رسول ﷺ کان کاذباً فی دعواہ"** (روح المعانی، جز، ۲۱، ص ۱۱۲)

امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری شرح بخاری میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا کہ جس شخص نے رسول ﷺ کا واسطہ چھوڑ کر اپنی طرف سے دعوی کیا کہ وہ ان غیوب خمسہ میں سے بعض اُمور کا عالم ہے۔وہ شخص اپنے دعوی میں جھوٹا ہے۔یعنی اگر کوئی رسول ﷺ کی ذات کو چھوڑ کر، یا آپ کے واسطہ کو بنائے بغیر یہ دعوی کرے تو وہ اس لئے جھوٹا ہے کہ آپ ﷺ کی متابعت اور آپ ﷺ کی تعلیم کے بغیر ان علوم میں سے کسی ایک علم کا حصول

ناممکن ہے۔ان علوم میں سے کسی ایک علم تک رسائی آپ کے وسیلہ سے ہوگی۔علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں : "انّا امر الساعۃ اخفی الامور المذکورۃ وان ما اطلع اللہ تعالی علیہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم من وقت قیامھا فی غایۃ الاجمال وان کان اتم من علم غیرہ من البشر ﷺ وقولہ علیہ الصلوۃ والسلام بعثت انا والساعۃ کھاتین لا یدل علی اکثر من العلم الاجمالی بوقتھا" (روح المعانی جز ۲۱، ص ۱۱۲)

ترجمہ: مذکورہ بالا پانچ امور میں سے امر قیامت زیادہ مخفی ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اجمالی طور پر وقت قیامت پر مطلع فرمایا ہے۔اگرچہ وہ دیگر انسانوں کی نسبت بہت ہی مکمل ہے۔آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ مجھے اور قیامت کو ان دونوں انگلیوں کی طرح باہم پیوست اور جڑواں مبعوث کیا گیا ہے، صرف علم اجمالی پر دلالت کرتا ہے۔علامہ آگے فرماتے ہیں :

"ویجوز ان یکون اللہ تعالی قد اطلع حبیبہ علیہ الصلوۃ والسلام علی وقت قیامھا علی وجہ کامل لا علی وجہ یحاکی علمہ تعالی بہ الا انہ سبحانہ اوجب علیہ ﷺ کتمہ لحکمۃ ویکون ذالک من خواصہ علیہ الصلوۃ والسلام" (روح المعانی ج ۲۱، ص ۱۱۳)

ترجمہ: یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کامل طور پر وقت قیامت پر آپ کو مطلع فرمایا ہو، اس کے باوجود یہ علم، علم باری تعالیٰ کے مساوی نہیں، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کسی حکمت کے تحت اس وقت کو چھپانا واجب کیا ہو اور وقت قیامت کا جاننا آپ ﷺ کا خاصہ ہو، اور جہاں تک اس کا تعلق ہے۔کون کہاں مرے گا؟ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

"قال رسول ﷺ اذا اراد اللہ قبض عبد بارض جعل لہ الیھا حاجۃ فلم ینتہ حتی یقدمھا ثم قرء علیہ وما تدری نفس بایّ ارض تموت۔

ترجمہ : رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کی روح قبض کرنے کا ارادہ فرماتا

ہے۔تو اس جگہ اس کیلئے حاجت پیدا فرماتا ہے۔جس جگہ اس کی روح کو قبض کرنا مقصود ہوتا ہے۔اس شخص کا وہاں پہنچے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”وما تدری نفس بایّ ارض تموت“ کی تلاوت فرمائی، ابن ابی شیبہ نے ملک الموت، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری کا واقعہ نقل فرمایا۔کہ عزرائیل علیہ السلام اس درباری کو گہری نظر سے دیکھنے لگے وہ خوفزدہ ہوا اور پوچھا یہ کون ہیں۔سلیمان علیہ السلام نے فرمایا یہ ملک الموت ہیں۔تو اس نے عرض کیا کہ ہوا کو حکم فرمائیں۔وہ مجھے ہند میں چھوڑ آئے، ہوا نے تعمیل حکم کی، ملک الموت نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کیا کہ گہری نظر سے میرے دیکھنے کا مقصد یہ تھا۔کہ اس کی روح میں نے سرزمین ہند میں قبض کرنی ہے۔اور یہ یہاں بیٹھا ہوا ہے۔(روح المعانی، جز ۲۱، ص ۱۱۳)

مقصد یہ تھا کہ عزرائیل علیہ السلام کو علم ہے۔کہ کون کہاں مرے گا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔کہ ہم مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے، ہم نے چاند دیکھا، میری بینائی تیز تھی۔میں نے پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا۔میرے علاوہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ نے بھی دیکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آسمان میں غور سے دیکھنے لگے۔مگر ان کو نظر نہ آیا۔فرمانے لگے میں تلاش کرتے کرتے تھک گیا ہوں، مجھے ہلال دکھائی نہیں دیا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔میں اپنے بستر پر جو دوران سفر میرے پاس تھا، لیٹا ہوا تھا، پھر عمر ہمیں اہل بدر کے حالات سنانے لگے فرمایا: ”کان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان یرینا مصارع اهل بدر با الامس یقول هذا مصرع فلاں غدا ان شاء اللہ تعالی و هذا مصرع فلاں غدا ان شاء اللہ تعالی

،قال عمر و الذی بعثه بالحق ما اخطاء و الحدود التی حدها

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الحدیث“ (رواہ مسلم، مشکوۃ ص ۵۴۳)

ترجمہ: بے شک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے دن ہمیں وہ جگہیں دکھا دیں،

جہاں جہاں مشرکین قتل ہونگے اوران کی لاشیں گریں گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا کہ قسم ہے اس ذات وحدہ لاشریک کی جس نے آپ کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے کوئی ایک کافر بھی اس جگہ سے ایک انگلی کے برابر بھی آگے پیچھے نہ مرا اور نہ گرا جو جگہ آپ نے بتائی تھی، اس حدیث سے درج ذیل امور ثابت ہوئے۔

۱۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم غیب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب خاص یعنی مفاتیح الغیب خمسہ پر مطلع فرمایا ہوا ہے، کیونکہ جنگ سے ایک دن پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان جگہوں کی نشاندہی فرمائی جہاں جہاں کفار نے مرنا اور گرنا تھا، ماننا پڑیگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ کون کون مرے گا اور کہاں کہاں مر کر گرے گا۔

۲۔کل آنے والے دن میں کیا ہوگا؟ جنگ ہوگی اور فلاں فلاں کفار مارے جائیگے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ھذا مصرع فلاں غدا ان شاء اللہ تعالی، مؤلف کا یہ کلیہ مقرر کرنا کہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا؟ غلط ثابت ہوا، جیسا کہ فائدہ ضمن نمبر ۱، میں لکھا، اس طرح ضمن نمبر ۴، بھی غلط ثابت ہوا کہ کسی جاندار کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں مرے گا؟ تفسیر روح المعانی کی عبارت یعنی تصریح سے ضمن نمبر ۵، بھی غلط ثابت ہوا کہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ قیامت کب آئے گی، امام ابن حجر عسقلانی کی نقل فرمودہ حدیث سے معلوم ہوا کہ بارش برسانے والے مامور فرشتوں کو علم ہے۔ کہ بارش کب اور کہاں ہوگی؟ اس سے مؤلف کا قائم کردہ ضمن نمبر ۳، بھی غلط ثابت ہوا۔امام ابن حجر قسطلانی کی نقل فرمودہ حدیث سے ثابت ہوا کہ رحم پر مامور فرشتہ کو یہ معلوم ہے کہ رحم میں کیا ہے؟ وہ رحم میں موجود اشیاء کی ابتداء اور اسکی انتہاء کا علم رکھتا ہے، نر، مادہ، رزق، عمر، بلکہ اس کی آئیندہ والی زندگی کے جملہ احوال وامور سے واقف اور باخبر ہے۔ باوجود یکہ ابھی وہ شخص شکم مادر کے اندر ہے، اس طرح ضمن نمبر ۲، بھی غلط ثابت ہوا کہ: اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ ارحام میں کیا ہے؟ نر ہے یا مادہ؟ سفید ہے یا

سیاہ وغیرہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صادق ومصدوق نے فرمایا کہ انسانی پیدائش کا سلسلہ یوں ہے کہ چالیس دن تک ماں کے شکم میں مادہ منویہ نطفہ رہتا ہے۔ پھر وہ علق بنتا ہے۔ وہ چالیس دن تک شکم مادر میں رہنے کے بعد مصنغہ بنتا ہے۔ وہ چالیس دن تک شکم مادر میں رہتا ہے۔ ''ثم یبعث الیہ ملکا باربع کلمات فیکتب عملہ واجلہ ورزقہ وشقی او سعید ثم ینفخ فیہ الروح، الحدیث'' (متفق علیہ)

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو چار باتیں بتا کر بھیج دیتا ہے، وہ فرشتہ اس کا عمل، اسکی موت ،اس کا رزق اور یہ کہ وہ نیک بخت ہے یا بدبخت؟ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

یہی علوم خمسہ ہیں جو ایک فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے دیئے اور وہ ان علوم کو زیر کار لایا، اگر یہ علوم صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ کوئی برگزیدہ پیغمبر یا مقرب فرشتہ نہیں جانتا تو اللہ تعالیٰ نے رحم پر مامور اس فرشتے کو یہ علوم کیوں دیئے؟ یہ تو اسی کا خاصہ ہے، معلوم ہوا علوم خمسہ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر جانتا ہے، ذاتی طور پر مالک ہے، مگر اپنے پسندیدہ رسولوں اور مقرب فرشتے کو عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے یہ علوم ذاتی طور پر ہیں، رسولوں اور فرشتوں کیلئے اس کے بتانے سے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''قال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتب مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموت والارض بخمسین الف سنة قال وکان عرشه علی الماء'' (رواہ مسلم، مشکوۃ ص ۱۹)

ترجمہ: رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دیں، لوح محفوظ میں علوم خمسہ بھی ہیں۔ وہ ملائکہ جو لوح محفوظ پر مقرر ہیں انہیں یہ علوم خمسہ حاصل ہیں، امام رازی کی تفسیر، کبیر سے اقتباس اس حوالے سے پہلے نقل ہو چکا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو کتابیں ہاتھوں میں لئے ہوئے مجمع میں تشریف لائے، دائیں ہاتھ میں کتاب کے بارے میں فرمایا کہ

اس میں جنتی لوگوں، اوران کے آباء وقبیلے کے نام ہیں، ان میں کمی، بیشی ہر گز نہیں ہوگی، میرے بائیں ہاتھ والی کتاب ربّ العالمین کی طرف سے ہے، اس میں دوزخی لوگوں، ان کے آباء اور قبیلوں کے نام ہیں، ان میں بھی کوئی کمی، بیشی نہ ہوگی۔ جنتیوں اور دوزخیوں کا کل ٹوٹل لگا دیا گیا ہے۔ الحدیث

(ترمذی، مشکوۃ ص ۲۱)

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے فرمایا:

''الظاهر من الاشارة انها حسيان، وقيل تمثيل''

ترجمہ: 'هذان الكتابان' میں اسم اشارہ سے ظاہر ہے وہ کتابیں حسی طور پر موجود تھیں اور نظر آرہی تھیں، اسلئے صحابہ کرام سے فرمایا 'اتدرون ماهذان الكتابان' کہ اے میرے صحابہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ کون سی ہیں؟ اگر موجود نہ ہوتیں تو آپ اسطرح کیوں پوچھتے؟ یہ اخبار بالغیب نہیں تو اور کیا ہے؟ کل تو کل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کل قیامت کے دن حساب و کتاب وغیرہ کے علاوہ قیامت کے بعد کے حالات کا بھی علم عطا فرمایا۔ مؤلف کا یہ کہنا کسی برگزیدہ پیغمبر کو بھی ان پانچ چیزوں کا علم نہیں غلط ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مقرب فرشتوں کو بھی علم غیب دے رکھا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ کہ جب میت نگیرین کے سوالوں کا صحیح جواب دیتی ہے تو نگیرین کہتے ہیں۔ ''قد كنا نعلم انك تقول هذا'' ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ تو یہ جوابات دے گا، میت کے بولنے سے پہلے ہی اس کے مومن ہونے صحیح جواب دینے اور سعید ہونے کا علم تھا، مذکورہ حدیث ترمذی مشکوۃ ص ۴۵ پر ہے، مؤلف کے علم، سوچ اور فکر پر تعجب ہے کہ: رسول ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں کو میت کے مومن،

کافر، نیک بخت ہونے کا علم ہے، مگر مؤلف کا کہنا ہے برگزیدہ پیغمبر، اور مقرب فرشتے کو علوم

خمسہ میں سے کسی امر کا علم نہیں، غلط ثابت ہوا، مزید۔۔۔شیطان اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ جو بخاری میں تفصیلی طور پر آیا ہے، ابو ہریرہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بیان فرمایا: ''مافعل اسیرک البارحہ'' کے الفاظ اور پھر تکرار واضح کرتا ہے۔ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور شیطان کا مکالمہ اور ہاتھا پائی خود ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اور پھر کل رات دوبارہ آنیکی خبر بھی دیتے رہے جیسا کہ فرمایا: انہ سیعود کہ کل پھر آئیگا۔ یہ کل ہونیوالے واقعہ اور ہونے والے کام کی خبر نہیں؟ کیا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنکھوں دیکھے حال کی طرح شیطان کے جھوٹ بولنے اور پھر دوبارہ آنے کی خبر نہیں دی: یا اباھریرۃ مافعل اسیرک البارحۃ' کے الفاظ منظر کشی پر دلالت نہیں کرتے؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی یہ نہیں فرمایا تھا، کہ وہ مفلس انسان نہیں بلکہ شیطان تھا، یہ حدیث بخاری مشکوۃ ص ۱۸۵، پر ہے، مزید حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال یوم خیبر لاعطین ھذہ الرایۃ غدا رجلا یفتح اللہ علی یدیہ یحب اللہ و رسولہ ویحبہ اللہ و رسولہ الحدیث'' (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر فرمایا میں یہ جھنڈا کل اس شخص کو دونگا جس کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا، وہ شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس سے محبت کرتے ہیں، حدیث پاک میں غدا کا لفظ، اور پھر ''یفتح اللہ علی یدیہ'' کا جملہ واضح مگر غور طلب ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے والے دن کے متعلق فرمایا، کہ اس کل والے دن جھنڈا میں دونگا اور ہر صورت دونگا لاعطّین، صیغہ واحد متکلم مؤکد بلام تاکید اور نون ثقیلہ، اس پر گواہ ہیں جو علم، اعتماد، اور یقین محکم کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور یفتح اللہ علی یدیہ کا جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہود و مسلمانوں کی جنگ ہوگی علی رضی اللہ عنہ قلعہ خیبر کا مین گیٹ اکیلے اپنے ہاتھ سے اکھاڑ پھینکیں گے

اسلامی فوج قلعہ کے اندر داخل ہوگی اور اس پر قبضہ کرے گی اس قلعہ پر اسلامی پرچم لہرائے گا ،اور اس ساری کارگزاری اور فتح کا سہرا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر ہوگا۔ کیا یہ کل کیا ہوگا؟ کی خبر اور تفصیل نہیں ،مولف کا یہ کہنا کہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا؟ گزشتہ تمام احادیث ،شراح حدیث کے اقوال اور توضیحات کے بالکل مغائر اور منافی ہونے کی بناء پر مردود اور باطل ہے یہ عقیدہ اہل سنت و جماعت کا نہیں بلکہ معتزلہ کا ہے۔جیسا کہ ہم پہلے ”روح المعانی جزء۔۲۱،ص ۱۱۲“ سے نقل کر چکے ہیں۔اُمور خمسہ، اُمور غیبیہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا علم ان اُمور خمسہ کی بابت ذاتی تفصیلی اور غیر محدود ہے۔اس کے مقابل انبیاء، اوّلیاء کا علم عطائی اور محدود ہے، لیکن یہ کہنا کہ ان اُمور خمسہ، یا ان میں سے کسی ایک کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو دیا ہی نہیں غلط ہے۔ بلکہ آیات قرآنیہ، اور احادیث نبویہ اور اقوال علماء کے منافی ہے احادیث مبارکہ کا ایک قابل قدر حصہ پہلے نقل ہو چکا ہے۔اب صرف چند آیات قرآنیہ کو نقل کرنے پر قناعت کی جاتی ہے۔

آیت نمبر:۱ ”**وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء**“ (پ،:۴۔آل عمران ۱۷۹)

ترجمہ: اور نہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسکو چاہے اس کا انتخاب کرلیتا ہے اس آیہء مقدسہ کی تفسیر میں امام رازی نے فرمایا:

”فان سنۃ اللہ جاریۃ بانہ لا یطلع عوام الناس علی غیبہ بل لا سبیل لکم الی معرفۃ ذالک الامتیاز“

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ وہ اپنے غیب پر عوام الناس کو مطلع نہیں فرماتا، بلکہ تمہارے پاس ایسی کوئی چیز ہی نہیں کہ تم یہ کہہ سکو کہ فلاں منافق ہے،فلاں مومن ہے، یا فلاں جنتی ہے۔اور فلاں جہنمی۔آگے فرمایا:

اما معرفۃ ذالک علی سبیل الاطلاع من الغیب فھو من خواص الانبیاء فلذا قال ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشآء ای ولکن اللہ یصطفی من رسلہ من یشآء یخصھم باعلامھم ان ھذا مومن ھذا منافق (کبیر ج، ۹ ص، ۱۱۱)

ترجمہ: غیب پر مطلع کرنے کے ذریعے مومن اور منافق کی پہچان انبیاءؑ کا خاصہ ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کا انتخاب فرماتا ہے، اسکو غیب پر مطلع فرماتا ہے، یہ کہنا کہ یہ مومن ہے اور یہ منافق ہے صرف انبیاءؑ کیلئے مختص ہے۔ امام موصوف کی تفسیر سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ اپنے پسندیدہ رسول کو غیب پر مطلع فرماتا ہے۔

۲۔ وہ پسندیدہ رسول لوگوں کے دلوں میں پوشیدہ ایمان اور کفر کی کیفیت کو جانتا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ پیغمبر غیب پر مطلع ہونے کے باعث بندوں کے انجام تک کو جانتا ہے ،یعنی اس رسول خاص اور پیغمبر خاص کو علم ہوتا ہے۔ کہ فلاں شخص جنتی ہے، اور فلاں جہنمی ہے ، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بندہ کے اعمال، عقیدہ، معمولات زندگی، جنت یا دوزخ میں اس کے ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس خاص رسول کو علم غیب کی اسقدر فراوانی عطا فرمائے اور پھر خود ہی اس کے غیب دان ہونے اور کئے جانے کا اعلان کرے تو اس کے مقابل اگر ایک عام آدمی لکھتا اور کہتا پھرے کہ نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم خواہ برگزیدہ ہی کیوں نہ ہو غیب نہیں جانتا، آیہ کریمہ کا انکار نہیں؟ نبی خاص کو بندہ کے جنتی یا دوزخی ہونے کا علم ہوتا ہے، اس پر حدیث شاہد عدل ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم غزوہ حنین کے موقعہ پر رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہمرائیوں میں ایک شخص ایسا تھا، جو مسلمان ہونے کا دعوٰی کرتا تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا یہ جہنمی ہے۔ حالانکہ وہ بہت جرأت مندی اور بہادری سے لڑ رہا تھا، صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم وہ بہت سخت لڑائی کرر ہا ہے

آپ ﷺ نے اسکو جہنمی فرمایا ہے، دوران لڑائی وہ زخموں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور
خود کو مار کر خودکشی کر لی، مسلمان مجاہدین دوڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں آئے، اور عرض گزار ہوئے :

"یارسول ﷺ صدق اللہ حدثیک قد افتحر فلان و قتل نفسه فقال رسول اللہ ﷺ اللہ اکبر الحدیث" (رواہ البخاری، مشکوٰۃ ص ۵۳۴)

ترجمہ : یارسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے آپ کے فرمان کو سچا کر دکھایا ہے اس نے سینے میں تیر مار کر خودکشی کر لی ہے یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر فرمایا۔ یہی مفہوم اور مصداق آیہء مقدسہ **"ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب و لکن یجتبی من رسلہ من یشاء"** کا ہے نیز یہ حدیث اس کی دلیل اور مبنی استدلال تصور ہوگی کہ اگر نبی کریم ﷺ غیب دان نہ ہوتے اس شخص کے جنتی نہ ہونے کا علم نہ رکھتے تو دیکھتے ہی کیسے فرماتے کہ یہ جہنمی ہے جبکہ اس نے قتال میں ابھی حصہ ہی نہیں لیا تھا تعجب ہے کہ منکرین علم غیب کی نظریں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ پر نہیں پڑتیں۔

امام رازی نے تو ظاہری اور باطنی حالات سے لے کر دخول جنت تک کا علم غیب نبی ﷺ کیلئے ثابت کیا ہے، **"کما افاد فی تفسیرہ"**

مؤلف نے اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول

ص ۳۰ پر نقل کیا جو اس طرح سے ہے۔: **"و من حدثک انه یعلم ما فی غد قد کذب ثم قرات و ما تدری نفس ما ذا تکسب غدا"** (صحیح البخاری ص ۷۳۰۔ ج۔ ۲)

ترجمہ: اور جس نے آپ کے سامنے یہ کہا کہ آپ ﷺ کل کی بات جانتے ہیں، اس نے جھوٹ کہا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی (جسکا ترجمہ یہ ہے) اور کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ وہ کل

کیا کرے گا، مؤلف نے اس حدیث کو بار بار پڑھنے کی دعوت دی ہے۔ عقل و دانش سے کام لیتے ہوئے انصاف سے فیصلہ کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ ہم نے حدیث پڑھی ہے، اگرچہ بار، بار پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جہاں تک فیصلہ کرنے کا تعلق ہے۔ تو فیصلہ کیلئے فریقین کو سماعت کرنا ضروری ہوتا ہے۔

فیصلہ ملاحظہ ہو: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو یہ ارشاد فرمایا کہ:

''فلا تقضی الاول حتیٰ تسمع کلام الاخر فانہ احری ان یتبین لک القضاء''

(ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ، مشکوۃ ص ۳۲۵)

ترجمہ: پہلے آدمی کے کہنے بیان کرنے پر فیصلہ صادر نہ کرنا جب تک اس کے مقابل فریق ثانی کو سماعت نہ کرلے، یہ لازمی ہے ایسا کرنے سے معاملے کا فیصلہ نکھر کر تیرے سامنے آئے گا، مولف نے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے موقف کے ثبوت میں دلیل کے طور نقل کی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا بھی علم نہیں کل کیا ہوگا؟ اب ضروری ہوگیا ہے کہ اہل سنت و جماعت کی دلیل اور ثبوت کو دیکھا جائے؟

باہمی تقابل کے بعد فیصلہ کیا جائے، اہل سنت و جماعت کا موقف یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ

نے آنے والے کل بلکہ بعد کل اور اس کے بعد قیامت تک اور قیامت گزرنے کے بعد کے حالات کا علم دیا ہوا ہے، غزوہ بدر خیبر کے متعلق اور شیطان کے کل پھر آنے کی احادیث پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔ ان میں لفظ غد ابڑی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، ان احادیث میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کل ہونے والے حالات اور معاملات کی خبر دی اور وہ حالات اور معاملات اسی طرح ظہور پذیر ہوئے جسطرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائے تھے، کل اور کل کے بعد

کے حالات بھی بتائے، ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے ایک ڈراونے خواب کا ذکر کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن کر فرمایا: "رائت خیرا تلد فاطمة غلاما یکون فی حجرک فولدت فاطمه الحسین" (مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

تو نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے، فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا، وہ تیری گود میں پرورش پائے گا، ام الفضل رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کے ہاں امام حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے،

مؤلف کا ضمن ص ۲ میں یہ تحریر کرنا کہ اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ ارحام میں کیا ہے؟ غلط ثابت ہوا۔ بلکہ اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "مافی الارحام" کا علم دیا ہوا ہے۔ حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ کی بلند پہاڑی پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا: "ھل ترون ماارٰی قالو الا قال فانی لارٰی الفتن تقع خلال بیو تکم کوقع المطر (متفق علیه)

ترجمہ: جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم بھی دیکھ رہے ہو، صحابہ نے عرض کیا نہیں یارسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،توآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بے شک میں یقینی طور پر تمھارے گھروں کے درمیان بارش کی طرح فتنوں کو گرتا ہوا دیکھ رہا ہوں، یعنی مستقل میں رونما ہونے والے فتنے اور فساد دیکھ رہا ہوں۔ یہ "ماذا تکسب غدا" ہے۔ آینوالے اوقات آپ نے بچشم سر ملاحظہ کئے اور ان کی نسبت اپنے صحابہ کو بتایا حضرت حذیفہ سے مروی ہے۔ کہ قیامت تک یعنی دنیا کے ختم ہونے تک جتنے فتنے بھی اور فساد فی الدین کے بانی اور قائد ہونگے ان کی تعداد تین سو سے زائد بتائی "الا قد سماہ لنا یا سمه و اسمه ابیه و اسمه قبیلة" (رواہ ابو داود، مشکوۃ باب الفتن ۴۶۳)

مگر ہر قائد فتنہ کا نام، اس کے خاندان اور قبیلہ کا نام بھی بتایا۔

یہ حدیث "ماذا کتسب غدا" کے علم کی دلیل نہیں؟ ذی شعور انسان تو قرآن و حدیث سے

ثابت شدہ ''ماذاتکسب غداً'' کا علم رسول ﷺ کیلئے ماننا بلکہ اپنے لئے جز وایمان سمجھتا ہے، حیوانات تسلیم کرتے ہیں کی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے رسول ﷺ کو کل آنے والے دن کا علم دے رکھا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ:

''فقال رجل تا اللہ ان رایت کالیوم زئب یتکلم فقال اعجب من ھذا رجل فی النخلات بین الحرتین یخبر کم بما مضیٰ وما کائن بعد کم''

ترجمہ: شکاری آدمی نے کہا میں نے آج کی طرح کبھی نہیں دیکھا کہ بھیڑیا باتیں کرتا ہے، بھیڑیا بول پڑا کہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک مرد رسول ﷺ دو میدانوں کے درمیان نخلستان یعنی مدینہ میں ہے اور تم کو گزشتہ اور آئندہ کی خبریں دے رہا ہے۔

(مشکوٰۃ باب المعجزات ص ۵۴۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کا آخر حصہ یوں ہے:

''انی لاعرف اسماءھم واسماء آبائھم والوان خیولھم ھم خیر فوارس او من خیر فوارس علی ظھر الارض یومئذ''

(رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الملاحم فصل اوّل ص ۴۶۷)

ترجمہ: دجال سے جہاد کی تیاری کرنے والوں کے، ان کے باپ دادوں کے نام ان کے گھوڑوں کے رنگ پہچانتا ہوں، وہ روئے زمین پر اس وقت بہترین شہسوار ہونگے۔

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے فرمایا:۔

''فیہ مع کونہ من المعجزات ولالۃ علی ان علمہ علیہ محیط بالکلیات والجزئیات من الکائنات وغیرھا''

ترجمہ: اس حدیث میں معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی دلالت ہے کہ حضور ﷺ کا علم کلی اور جزی واقعات کو گھیرے ہوئے ہے، قیامت سے پہلے دجال کی آمد کے موقعہ پر جو

مسلمان اس

سے جہاد کریں گے، آپ ﷺ نے ان کے باپ دادا کے نام گھوڑوں کے رنگ تک بتا دیئے ۔اورساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ اس وقت میں وہ پوری روئے زمین کے مایہ نازشہ سوار ہونگے، کیا یہ آنے والے اور قرب قیامت ہونے والے حالات وواقعات کا علم نہیں، بالکل ہے اور یقینا ہے۔فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ان کی ذاتی رائے ہے، انہوں نے آیہ مقدسہ سے استنباط کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے،مگراس کے مقابل بے شمار احادیث کل کا علم ہونے پر موجود ہیں۔جن میں سے بطوراختصار چندایک احادیث کو پیش کرنیکی سعادت ہم نے بھی حاصل کی ہے۔مدینہ منورہ میں سورج گرہن ہوا، اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**مامن شیء کنت لم اداہ الا و قدرائیتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ و النار**''(بخاری،۱،ص،۳۱)

میں نے اس سے قبل جو جو چیز نہیں دیکھی تھی وہ اس جگہ میں نے دیکھ لی ہے، یہاں تک کہ دوزخ اور جنت کو بھی دیکھ لیا ہے،

اسی عنوان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے: ''**لقدرایت فی مقامی ھذا کل شیء وعدتہ**''(الحدیث: بخاری، ق،ص،۱۶۱)

جن جن چیزوں کے دئیے جانے یا دکھائے جانے کا مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا وہ کل میں نے اس مقام پر دیکھ لی ہیں،،

یہ علم کلی، تفصیلی اور حضوری ہے جو آپ کو دیا گیا ہے،(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

حضور ﷺ کی واضح اور تفصیلی احادیث کے مقابل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان مرجوح ہے، نیز اگر اسکو مرجوح نہ مانا جائے ،تو قرآنی آیات اور کافی احادیث کے ساتھ تعارض اور تصادم لازم آئیگا جو ممنوع ہے،مؤلف نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ص ۲۹ پر جو

حدیث نقل کی ہے، اس کا پہلا جواب یہ ہے۔ غیب بذات خود کوئی نہیں جانتا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے خاص رسول ان کو جانتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک طرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف ان کے والد گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور ان کے رفیق حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دیگر راویوں کے نبی اور رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہیں ان بلند قدر صحابہ اور رسول کائنات کے مقابل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول مرجوح ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نزول وحی سے ایک سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے ہجرت کے وقت ان کی عمر چودہ برس تھی اس لئے نزول وحی کے بعد رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا مکہ میں عرصہ اقامت تیرہ برس ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ دربار رسالت میں ان کی حاضری یقینی ہے، چودہ سال کی عمر شعور اور سمجھ بوجھ کی عمر ہے، ہر صحابی رضی اللہ عنہ اور اس کے اہل خانہ نزول وحی کے اثرات اور فرمودات نبویہ کے محفوظ کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ تمام صحابہ کے گھروں میں درس قرآنیہ، اور تبلیغات نبویہ کے اُجالے ہیں۔ غزوہ بدر ۲ھ میں ہوا۔ اور غزوہ خیبر ۷ھ میں ہوا دو غزوات کے وقت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک اُبھرے ہوئے جوان تھے، میدان بدر میں مشرکین کے مرنے اور گرنے کی نشاندہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ہوئی، وہی راوی ہیں، غزوہ خیبر کے وقت ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ موجود تھے، خود عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ان دو معرکہ اور غزوات میں فتح کی پیش گوئیاں انہوں نے خود یا والد کی زبانی نہ سنی ہونگی؟

یقیناً سنی ہونگی، سننے اور جاننے کے باوجود یہ کہنا کہ علوم خمسہ اللہ ہی جانتا ہے چہ معنی دارد؟ ماننا پڑے گا کہ آپ کی مراد اس سے یہ ہے کہ ان اُمور خمسہ کو اللہ کے بتائے بغیر کوئی نہیں جانتا؟

مؤلف نے امام زجاج کا قول ص ۳۰، پر نقل کیا جس کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

"من ادعی انہ یعلم شیأً من ہذہ الخمس فقد کفر بالقرآن العظیم"

ترجمہ: جس نے دعوٰی کیا کی وہ ان امور خمسہ میں سے کسی ایک کو جانتا ہے تو اس نے قرآن کا انکار کیا۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ قول زجاج کو علم غیب کی نفی پر بطور دلیل پیش کرنا غلط ہے۔علوم خمسہ کی نفی میں اسکا کوئی عمل دخل نہیں۔امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تفسیر اتقان میں فرماتے ہیں کہ:من اسم ہے، کبھی موصولہ ہوا کرتا ہے۔ جیسے

:''لہ من فی السمٰوٰت والارض، ومن عندہ لایستکبرون''

اور کبھی شرطیہ بھی ہوتا ہے:من یعمل سوءً یجزی بہ، نکرہ موصوفہ بھی ہے جیسے ُومن الناس من یقول،غرضیکہ جس بھی معنی کیلئے آئے اس میں عموم پایا جاتا ہے،اور عموم ابہام کو مستلزم ہوتا ہے پورے قرآن میں نبی ﷺ کو عام افراد انسانی میں رکھا گیا،نہ آپ کی شان،قدرومنزلت اور بارگاہ رسالت کو صیغہ ابہام میں بیان فرمایا گیا۔تفصیل کی گنجائش نہیں،پھر قول زجاج کا تعلق اس شخص عام سے ہے جو مدعی علوم خمسہ ہو کہ وہ علوم خمسہ جانتا ہے،

نمبر:۲ آپ معصوم ہیں،مفسر قرآن ہیں آپ ﷺ سے ایسی کلام کا صدور،اور ایسی تفسیر وتاویل کا ورود جس سے منشائے قرآن کا انکار لازم آتا ہو یا اسکی بو اور تصور تک ممکن ہو محال شرعی،محال عادی اور محال عقلی ہے۔

نمبر:۳رسول ﷺ نے کبھی بھی،اور کسی بھی مقام پر علم غیب جاننے کا دعوٰی نہیں فرمایا لاتعداد اُمور غیبیہ کی خبر دی مگر غیب دان ہونے کا دعوٰی نہیں فرمایا۔

نمبر:۴اس سے مراد عام شخص کا دعوٰی علم ہے۔جسطرح من ادعی کے الفاظ عموم معنی اور ابہام پر دلالت کرتے ہیں۔

نمبر:۵امام زجاج کا قول عقیدہ اہل سنت وجماعت کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے وہ اس طرح کہ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اُمور خمسہ کیلئے رسول ﷺ کو

مختص فرمایا، خود قرآن نے اس کا اعلان بھی فرمایا ہے:

"ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب و لکن یجتبی من رسلہ من یشاء"

جس سے بھی ثابت ہوا کہ علوم غیبیہ صرف خاص رسولوں کو دیئے گئے عوام الناس کو نہیں دیئے جاتے اگر کوئی عام آدمی علم غیب کے جاننے کا دعوٰی کرے تو قرآن کی اس نصّ قطعی کا انکار کرتا ہے جس میں صاف بتایا گیا ہے خاص رسول کے علاوہ کوئی شخص علم غیب نہیں جانتا۔

بخاری میں ہے کہ رسول ﷺ ایک نکاح میں تشریف لے گئے، جہاں انصار کی کچھ بچیاں دف بجا کر جنگ بدر کے مقتولین کے مرثیے کے گیت گانے لگیں،

ان میں سے کسی نے یہ مصرع پڑھا : **★وفینا نبی یعلم ما فی غدا★**

ترجمہ: ہم میں ایسے نبی ہیں جو کل کی بات کو جانتے ہیں۔ فرمایا: یہی گاؤ جو پہلے گا رہی تھیں الفاظ مبارکہ یہ تھے، ''**دعی ھذہ و قولی بالذی کنت تقولین**'

'(**مشکوٰۃ باب اعلان النکاح فصل اول ص ۲۷۱**)،

آپ کے الفاظ واضح ہیں آپ ﷺ نے غصہ کیا نہ کہا کہ ایسا کہنا انکار قرآن کو مستلزم ہے۔ بلکہ صرف اتنا فرمایا کہ اس مصرع کو چھوڑ دو، اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری نے فرمایا! **اس کی دو وجھیں ھیں، (۱)"لکراھۃ نسبۃ علم الغیب الیہ لانہ لا یعلم الغیب الا اللہ و انما یعلم الرسول ﷺ من الغیب ما اعلمہ (۲) اولکراھۃ ان یذکر فی اثناء ضرب الدف و اثناء مرثیۃ القتلیٰ لعلو منصبہ عن ذالک''** منع اس لئے فرمایا کہ اس مصرع میں آپ ﷺ کی طرف علم غیب کی نسبت کی گئی، کیونکہ غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور آپ ﷺ وہی غیب جانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتایا۔ یا آپ ﷺ کا مقام اور درجہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔

ملا علی قاری کی اس تشریح سے معلوم ہوا کی حضور ﷺ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنا کفر و شرک

نہیں اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ آپ ﷺ کیلئے ذاتی علم غیب مانا جائے یا ذاتی طور پر علم غیب کی آپ ﷺ کی طرف نسبت کی جائے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے آپ ﷺ علم غیب جانتے ہیں۔ تو یہ ممنوع یا کفر نہیں۔

نمبر: ۴ امام زجاج کے قول کا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ جو شخص یہ دعوی کرے کہ ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر آپ ﷺ غیب جانتے ہیں۔ وہ قرآن کا منکر ہے،۔ کیونکہ قرآن کا فرمان ہے۔ کہ کوئی شخص خواہ پیغمبر یا رسول ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر غیب نہیں جانتا، وھو المراد۔

مزید غیب کی خبر کا دیا جانا اور پھر غیب کی خبر کا مخلوق کو بتانا ماہیت نبوت کو لازم ہے، کیونکہ نبیؐ مشتق ہے اور کسی امر پر مشتق کا حکم لگانا مشتق کے مصدر کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی مشتق کا معنی مصدری اس حکم کی علت ہوتا ہے جیسے سارق کی علت سرقہ اور زانی کی علت زنا ہے سارق وہی ہے جو وصف سرقہ سے متصف ہے زانی وہی ہے جس میں زنا کی صفت ہے، اسی طرح نبی وہی ہے جو وصف علم غیب سے متصف ہے نبی کا علم غیب سے متصف ہونا اور مخلوق کو غیب کی خبر دینا قضیہ مشروطہ دائمہ ہے رسول اللہ ﷺ نبی ماننا اور علم غیب کی کلاً جزئاً اور حادثاً اور اعطائاً نفی کرنا انکار رسالت اور انکار قرآن ہے،،

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۲۳، پر ایک واقعہ نقل کیا جس کا خلاصہ یہ ہے مسجد نبوی کا خادم یا خادمہ کا انتقال ہوا صحابہ نے اسکی موت کو معمولی امر سمجھا اور رسول ﷺ کو بتائے بغیر دفن کر دیا، اس کے مسجد کا کام کاج نہ کرنے پر صحابہ سے پوچھا کہ خادم یا خادمہ مسجد کہاں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ فوت ہو گیا ہے ہم نے اسکو دفن بھی کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے حکم دیا کہ: **دلونی علی قبرہ**' مجھے اسکی قبر بتاؤ، قبر بتائی گئی اور آپ ﷺ نے قبر پر اسکی نماز جنازہ پڑھی، فائدہ کے عنوان میں لکھا کہ اس واقعہ سے ثابت

ہوا کہ آپ ﷺ کو کلی علم غیب نہ تھا، ورنہ خادم مسجد اور اسکی قبر آپ ﷺ سے پوشیدہ نہ ہوتے ، یہ بھی ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کا بھی علم غیب کلی کا عقیدہ نہیں تھا، ورنہ دریافت کرنے پر کہتے آپ ﷺ تو خود عالم الغیب ہیں۔ خادم کی موت کی خبر رکھتے ہیں، ہماری اطلاع کی کیا ضرورت تھی؟ اور ہر قبر میں آپ ﷺ خود بنفس نفیس تشریف لے جاتے ہیں، تو وہاں سے بھی آپ ﷺ کو پتہ چلا ہوگا کہ اس قبر میں تو ہماری مسجد کا خادم ہے۔ لیکن کسی ایک صحابی نے بھی یہ نہیں کہا ،جس سے معلوم ہو کہ صحابہ آپ ﷺ کو کلی طور پر عالم الغیب نہیں سمجھتے تھے،

توضیحاً کہا جاتا ہے: پوچھنا لاعلمی کی دلیل نہیں، اللہ تعالیٰ نے ''**ماتلک بیمینک یموسیٰ**''،علم ہونے کے باوجود پوچھا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور شیطان کے واقعہ میں رسول ﷺ نے واقعہ کا تفصیلی علم ہونے کے باوجود ابو ہریرہ سے ان کے بتانے سے پہلے پوچھا'' **فاصبحت فقال الرسول ﷺ یا اباھریرۃ مافعل اسیرک البارحۃ، قلت الحدیث** کے الفاظ صریحاً دلالت کرر ہے ہیں کہ صبح جوں ہی ابو ہریرہ آئے تو رسول ﷺ نے رات کو پیش آنے والے واقعہ کی نسبت پہلے پوچھا، اور ابو ہریرہ نے بعد میں بتایا۔ واقعہ افک میں منافقین کے چرچے کے بعد آپ ﷺ مسجد نبوی کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنائ کے بعد فرمایا :۔'' **فو اللہ ماعلمت علیٰ اھلی الا خیرا**''، قسم کھا کر فرمایا میری محبوبہ رفیقہ حیات میں کوئی ایسی بات نہیں، اس کا ہر قدم ہر نظر، ہر سانس اور ہر حرکت کا مجھے علم ہے وہ خیر اور بھلائی کی ایک چلتی پھرتی تصویر ہے۔ لیکن اس کے باوجود خادمہ سے ان کی نجی اور گھریلو زندگی کے متعلق آپ ﷺ نے پوچھا، دیکھیے بخاری، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ بھی فرمایا:۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں قیدی ہو کر آئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ آپ فدیہ دیں انہوں نے مفلسی اور تنگدستی کا اظہار کیا، مگر آپ ﷺ نے اپنی چچی کے پاس جو سونا اور دیگر مال اور اسباب کی تفصیل بتائی اور جہاں جہاں اسکو محفوظ کیا گیا تھا وہ بھی بتایا، علم

ہونے کے باوجود پھر بھی پوچھا آپ ﷺ کے علم کو دیکھ اور سنکر حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے، دیکھے شفاء شریف،

آپ ﷺ کے پوچھنے میں چند حکمتیں تھیں۔

نمبر: ۲ مسجد کی صفائی ستھرائی کرنا، مسجد سے دل لگانا، مسجد کی طرف آنا ایمان کامل کی علامت ہے

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کی: "قال رسول ﷺ اذا رأیتم الرجل یتعاھد المسجد فاشھدو الہ بالایمان فان اللہ یقول انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر" (رواہ الترمذی، مشکوۃ باب المساجد)

ترجمہ: جب تم ایسے شخص کو دیکھو جو مسجد کی خدمت کرتا ہو، اور اس کے تعمیری کاموں میں لگا رہتا ہو، تم اسکے مومن کامل ہونے کی شہادت دو، چونکہ وہ خادم یا خادمہ مومن کامل تھا، تھی۔ صحابہ نے معمولی انسان سمجھ کر بغیر بتائے دفن کر دیا، رسول ﷺ نے اس کی نسبت پوچھ کر اور "دلونی علی قبرہ" فرما کر یہ فرمایا کہ مسجد کا خادم مومن کامل ہے جو قابل احترام اور لائق تعظیم ہے۔ اسکو معمولی انسان سمجھنا غلط ہے۔ اور یہ پوچھنا صحابہ کی تعلیم اور تربیت کیلئے تھا، صحابہ نے قبر کی نشاندہی کی، اسکی قبر پر آپ ﷺ نے نماز پڑھی اس میں بھی دو حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

نمبر: ۱ رسول ﷺ پر مومن کی نماز پڑھنا فرض تھی۔ ملا علی قاری نقل فرماتے ہیں کہ امام سیوطی کی "انموزج اللبیب" میں میں نے پڑھا ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ پاک کے زمانہ میں لوگوں سے نماز جنازہ کی فرضیت اس وقت ساقط ہوتی جب آپ ﷺ نماز جنازہ پڑھتے آگے فرمایا: "فیئول الی ان صلوۃ الجنازۃ فی حقہ فرض عین وفی حق غیرہ فرض کفایۃ"

(مرقاۃ، ج ۴، ص ۵)

ترجمہ: اسکا نتیجہ یہ ہے کہ نماز جنازہ کی فرضیت اس وقت تک ساقط نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ باقی

تھی اس لئے خود پڑھی آپ ﷺ کے پڑھنے سے سب کے ذمہ سے فرض ساقطہ ہو گیا۔

نمبر ۲: جس قبرستان میں خادم یا خادمہ کو دفن کیا گیا تھا اسکی قبروں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: "ثم قال ان هذه القبور مملوئة ظلمة علی اهلها و ان الله سینورها لهم بصلوتی علیهم (متفق علیه)

ترجمہ: یہ قبورا پنے مدفونوں پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں، (یعنی ان قبروں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اور مردے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے) اللہ تعالیٰ اس قبر پر میری نماز کی بدولت پورے قبرستان اور مردوں کو روشن اور منور کر دے گا۔ بلکہ روشن و منور کر دیا ہے، مقصود ان مردوں کی بخشش اور ان قبور کی روشنی اور نورانیت تھی اس لئے فرمایا کہ قبر بتاؤ؟ قبر پر جانے اور نماز پڑھنے کا فائدہ بھی خود ہی بتایا۔ سوال یہ ہے کہ جو نظر اور نور رسالت پورے قبرستان کی قبروں کے اندر دیکھ سکتا ہے۔ بتا سکتا ہے وہ قبر کو نہیں دیکھ سکتا، قبور کا تاریکی سے معمور ہونا عالم برزخ کی بات ہے، عالم دنیا سے اوجھل اور مخفی ہے۔ جب اوجھل اور مخفی شیء دیکھ لی اور بیان کی تو جو ہے ہی ظاہر اور قریب، اس کا دیکھنا اور جاننا کیوں محال ہے؟ صحابہ کی شان، مقام، علم، اور عشق اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں، اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ نہیں کہ آپ عالم الغیب ہیں عالم الغیب والشہادۃ وہی ذات ہے جو وحدہ لاشریک ہے، اسطرح اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ بھی نہیں کی آپ ﷺ ہر مومن کی قبر میں بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں۔ یہ ایک الزام ہے، بہتان طرازی ہے، اور اس سے مقصد اہل سنت و جماعت کو بدنام کرنا ہے۔

احمد ممتاز نے کتابچہ کے ص ۳۳، پر ستر قاریوں کے شہید کئے جانے کا واقعہ لکھا جو کہ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ شروع میں قبیلہ (رعل) ذکوان اور بنی لحیان کے کچھ لوگ (ایک سازش کے تحت) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور یہ ظاہر کیا کہ مسلمان ہو چکے ہیں آپ ﷺ ہمیں امداد کیلئے کچھ آدمی مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے ان کی باتوں پر اعتماد

فرمایا اور انہیں مخلص مومن سمجھ کر انصار میں سے ستر آدمی ان کی مدد کیلئے ان کے ہمراہ فرمائے، سارے کے سارے قرآن کے قاری اور نہایت ہی متقی تھے۔ چنانچہ جب وہ منافقین صحابہ کی اس جماعت کو ساتھ لے کر مقام بئر معونہ پر پہنچے تو دھوکا کیا اور سب کو شہید کر ڈالا۔۔۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ اسی واقعہ کی نسبت علامہ ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاھور نے اپنی کتاب سیرت المصطفیٰ ﷺ جلد دوم ص ۲۶۷، پر اسطرح تحریر کیا کہ عامر بن مالک ابو برّاء آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ہدیہ پیش کیا لیکن آپ ﷺ نے قبول نہیں فرمایا، ابو برّائؓ کو اسلام کی دعوت دی لیکن ابو برّاء نے نہ تو اسلام قبول کیا اور نہ ردّ کیا، معلوم ہوا کہ اس نے رسول ﷺ کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار نہیں کیا تھا، اکیلا آیا تھا اور کسی قبیلے کا کوئی آدمی اسکے ہمراہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ یہ کہا کہ اگر آپ ﷺ اپنے چند اصحاب اہل نجد کی طرف بھیجیں تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں گے آپ ﷺ نے فرمایا مجھ کو اہل نجد سے اندیشہ اور خطرہ ہے مقام غور ہے یہ اظہار اطمینان ہے یا اس کی منافقت کی غمازی ہے ہدیہ قبول نہ کرنا، اہل نجد کی طرف سے برملا ابو برّاء کے سامنے اندیشہ اور خطرہ کا بتانا، اظہار اعتماد ہے؟ یا اہل نجد کی خباثتوں، شرارتوں، اور ان کی بدنیتی اور اسلام دشمنی کا اعلان ہے؟ ابو برّائؓ نے کہا میں ضامن ہوں، ایک شخص سے ضمانت لینا اہل نجد کیلئے اعتماد، اور اطمینان کا اظہار نہیں، بلکہ اندیشہ اور خطرہ کا اظہار کرنا اہل نجد کے دلوں میں اسلام دشمنی کی بھڑکتی آگ کی تشریح اور بیان ہے، ابو برّائؓ نے اپنی ضمانت پیش کی یہ ساری کیفیت اس بات کی غماز ہے کہ آپ ﷺ کو ان ستر اصحاب پر شہادت کے سائے منڈلاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ معاملہ دعوت اسلام اور تبلیغ ایمان کا تھا، اسی مشن کی تکمیل اور تشہیر کیلئے آپ ﷺ کو معبوث فرمایا گیا تھا۔ ضمانت لے کر ان ستر احباب کو ابو برّاء کے ہمراہ روانہ فرمایا اور ابو برّاء کے بھتیجے عامر بن طفیل جو عامر قبیلے کا سردار تھا، کے نام حرام بن ملحان کو

خط دیا تھا، بئر معونہ کے مقام پر عامر بن طفیل نے حرام بن ملحان کو شہید کرادیا، اوران کی زبان سے اللہ اکبر فزت ورب الکعبه کے الفاظ نکلے اللہ اکبر رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ اسی معرکہ میں حضرت ابوبکر صدیق کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ بھی شہید ہوئے ان کا جنازہ آسمان پر اٹھایا گیا، عامر بن طفیل نے پوچھا وہ کون مسلمان شہید ہوا میں نے دیکھا کہ وہ زمین اور آسمان کے درمیان اٹھایا گیا۔ بلکہ آسمان نیچے رہ گیا جبار بن سلمیٰ نے عامر بن فہیرہ کو شہید کیا تھا، ان کے آخری الفاظ یہ تھے فزت و اللہ، خدا کی قسم میں مراد کو پہنچ گیا، جبار بن سلمیٰ نے ضحاک سے پوچھا اس جملہ کا کیا مقصد ہے؟ اور مراد کو کیسے پہنچے؟ ضحاک نے فرمایا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ شہادت کے بعد میں نے جنت کو پالیا ہے، یہ سن کر جبار بن سلمیٰ بھی مسلمان ہو گئے اس واقعہ نے شہدوں کا مقام، مرتبہ اور اللہ کے ہاں ان کی مقبولیت کو واضح کیا ان اصحاب کے مقدر میں روز ازل سے شہادت لکھی جا چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے روانگی سے قبل اہل نجد کیطرف سے خطرے اور اندیشے کا اظہار فرمایا تھا، عربوں میں ضمانت کا بہت بڑا احترام کیا جاتا اور ہر ممکن اسکی پاسداری کی جاتی تھی۔ اس لئے آپ ﷺ نے ضمانت لینے پر بادل نخواستہ روانہ فرمایا۔ شہدائؓ نے اللہ کی بارگاہ میں التجاء کی کہ ہمارے نبی ﷺ کو ہماری شہادت کی خبر پہنچا اور یہ بتا کر ہم اللہ کو جانتے ہیں وہ ہم سے راضی ہے اور ہم اس سے راضی ہیں۔ جبریل نے رسول ﷺ کو خبر دی آپ نے فرط غم میں قنوت نازلہ پڑھنا شروع کی جو ایک مہینہ تک جاری رہی، اس قنوت نازلہ کے پڑھنے پر ثابت ہوا کہ مصیبت اور پریشانی کے وقت اس کا پڑھنا ضروری ہے اس سے آنے والی آفات وبلیات سے محفوظ اور ماسبق کی تسکین میسر آتی ہے، رسول ﷺ تبلیغ اسلام کیلئے بڑے بڑے معرکوں میں صحابہ کو ہمراہ لیکر گئے جنگ کی تربیت اور ترغیب بھی دی اور شہادت کے فضائل بھی بتائے، صحابہ نے دوڑ دوڑ کر جام شہادت نوش کیا ان کی شہادت سے شان شہداء کا پتہ چلا، یہ

روانگی دین اسلام کی تبلیغ کیلئے تھی آپ ﷺ کے لیے صحابہ کو روکنا، روانہ نہ فرمانا کیسے ممکن تھا؟ مؤلف کا یہ کہنا کی آپ اگر عالم الغیب ہوتے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ان کی سازش میں نہ آتے، غلط ہے آپ ﷺ سازش میں نہیں آئے، آپ ﷺ نے خطرہ اور اندیشہ کا پہلے ذکر فرما کر پورے واقعہ کو اجمالاً اور مبہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ پھر عالم الغیب ذات وحدہ لاشریک ہے آپ ﷺ عالم الغیب نہیں صرف مطلع بر غیب ہیں اور وہ بھی اسقدر جتنا اللہ نے آپ ﷺ کو دیا ہے۔ حاضر و ناظر ہونے کی بحث میں اس کی تفصیل آچکی ہے،،

(علامہ کاندھوی نے یہ واقعہ الخصائص الکبری اور زرقانی، بخاری سے نقل فرمایا ہے۔)

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں ہے۔: ''وماتدری ماذاتکسب غدا سے استشہاد کیا گیا ہے، تدری کا مادہ درایۃ ہے، اور درایہ کا معنی، حیلہ سازی سے جاننا ہے، (المنجد) آیہ کریمہ میں حیلہ سازی سے کسی چیز کو جاننے کی نفی کی گئی ہے، یعنی کوئی شخص اپنے حیلہ، اپنی سوچ اور اپنی فکر کے ذریعے نہیں جان سکتا کہ کل کیا کریگا؟ اللہ تعالیٰ کے بتانے اور اس سے جاننے کی نفی نہیں۔ قول عائشہ رضی اللہ عنہا کا سہارا لیکر مولف نے جو کہا وہ انکی اپنی سوچ ہے،،

انبیائے کرام کیلئے ''علم مافی غدا اور ماذاتکسب غدا

قرآن حکیم نے قصہ یوسف علیہ السلام بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا انہوں نے تعبیر **مافی الغد** بتائی جو پوری ہوئی، برادران یوسف علیہ السلام نے بھیڑئیے کے کھانے کی حیلہ سازی کی، یعقوب علیہ السلام نے مطلع ہونے کے باعث رد فرمادی اور یوسف علیہ السلام کو بادشاہت کی بشارت دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آل یعقوب پر اپنے انعامات مکمل فرمائے گا، چناچہ یوسف علیہ السلام کو نبوت اور بادشاہت عطا فرمائی اور باقی

برادران کی نسل میں سلسلہ نبوت جاری فرمایا، بنیامین کو جب یوسف علیہ السلام نے اپنے پاس روک لیا۔ برادران یوسف علیہ السلام نے چوری کرنے اور اسکی وجہ سے روک لینے کا عذر پیش کیا ۔تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جلدی دونوں کو مجھ سے ملائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص والد کی خدمت میں بھیجی، اور فرمایا ان کے چہرے پر ڈالو۔یر تد بصیرا، بینائی کولوٹا دیگی، یہ اخبار مافی الغد، اور ماذاتکسب غدا نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قوم کے روبرو یہ اعلان فرمایا میں خدا کا بیٹا نہیں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ نے الہامی کتاب دیکر نوازا ہے۔ پھر اپنے علم مافی الغد اور ماذا یکسب غدا کا اعلان فرمایا۔غور کیجیے کہاں گہوارہ بچپن اور کہاں عمر نبوّت اور رسالت۔۔۔

غزوہ حنین کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اطلاع دی گئی کہ کفار نے بہت سارا سامان جنگ، مال ومویشی اور دیگر ساز وسامان جمع کر رکھا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن کر تبسم فرمایا :اور ارشاد فرمایا کہ کل انشاءؔ اللہ یہ سب کچھ مال غنیمت ہوگا۔اور ہمارے ہاتھ آئیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا فرمایا تھا۔کیا علمیہ واقعات جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں، مافی الغد اور ماذاتکسب غدا نہیں؟

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۳۴ سے لیکر ص ۴۳ تک واقعہ افک وبہتان بڑی

تفصیل سے لکھا واقعہ کو طوالت کی وجہ سے زیر قلم نہیں لایا جارہا۔البتہ ص ۴۳ پر فائدہ کے تحت جو کچھ لکھا اس کا جواب ضمن وار دینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور امہات المومینین رضوان اللہ علیہن میں سے کوئی بھی عالم الغیب نہ تھا۔ ورنہ یہ واقعہ پیش نہ آتا۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن ،صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو

درکنار، اہل سنت و جماعت رسول ﷺ کو غیب دان مانتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے مگر عالم الغیب نہیں مانتے یہ صفت فقط، اللہ وحدہ لاشریک کی ہے، جیسا کہ خود ارشاد باری تعالیٰ ہے **عالم الغیب و الشھادۃ**۔ زوجہ محبوبہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا یہ عجیب علم غیب کلی اور ما کان و مایکون ہے۔

جواباً کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو علم غیب کلی اور وما کان و مایکون کا علم دیا ہے۔ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ لیکن اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار حکمتیں تھیں، کسی صحابی رضی اللہ عنہ یا ولی بشمول پیران پیر کیلئے اہل سنت و جماعت یہ نہیں کہتے کہ وہ عالم الغیب ہیں، ''فافہم''

مؤلف نے الزام تراشی سے کام لیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ عالم الغیب ہوتے تو کہہ دیتے کہ اصل واقعہ تو یوں ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے تحقیق کا مشورہ کیوں دیتے؟ یا یوں کہتے کہ یارسول ﷺ آپ تو عالم الغیب ہیں آپ ﷺ کو سب کچھ پہلے معلوم ہے تو ہم سے مشورہ کا کیا مطلب؟

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ پہلے کہہ دیا گیا ہے کہ عالم الغیب صرف خداوند تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ کوئی مخلوق نبی، رسول یا فرشتہ عالم الغیب نہیں، عالم الغیب اللہ تعالیٰ کی صفت خاص ہے ازلی، ابدی دائمی اور سرمدی ہے۔ مخلوق کیلئے اس صفت کو ثابت کرنا محال شرعی ہے۔ واقعہ افک

و بہتان کے ضمن میں اہل سنت و جماعت سے اس عقیدہ کی توقع رکھنا مولف کی بھول اور خوش فہمی اور الزام تراشی ہے، جہاں تک رسول ﷺ کا ان سے یا کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ سے مشاورت کا تعلق ہے تعلیم اُمت کیلئے ہے، قرآن حکیم نے معاملات کی یکسوئی کیلئے آپ ﷺ کو صحابہ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے، رسول ﷺ نے ہمیشہ اپنے صحابہ سے مشورہ کیا

،اور صحابہ کرام مشورہ دیا کرتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ جو بکل شی علیم ہے، نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے فرشتوں سے مشورہ فرمایا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "**واذ قال ربک للملکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ**" اللہ تعالیٰ جب **بکل شی علیم** ہے تو اسکو فرشتوں سے مشورہ کرنیکی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کے رسول جب حامل وحی ہیں ان کو صحابہ سے مشورہ کرنیکی کیا احتیاج تھی؟ مگر اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے مشورہ کرنا اور نبی کریم ﷺ کا صحابہ سے مشورہ کرنا تعلیم اُمت اور تعلیم انسانیت کیلئے تھا، اس کیلئے روح المعانی اور بیضاوی دیکھیے، چونکہ یہ نبی ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے گھر کا معاملہ تھا اگر فوراً برات اور پاکدامنی کا اظہار اور اعلان کر دیا جاتا تو منافق لوگ پھر یہ کہتے پھرتے کہ نبی ﷺ کی ذات اور گھر کا معاملہ تھا۔ اس لئے صحابہ سے عفت اور طہارت کی شہادت دلوا کر نعوذ باللہ واقعہ کو چھپا اور دبا دیا گیا ہے، کیا صحابہ کو **الطیبات للطیبین** کا اصول اور حکم معلوم نہ تھا، حضرت عائشہ سے بڑھکر کون سی خاتون اس دور میں طیب اور طاہر ہو سکتی ہے، صحابہ کو علم تھا کہ ذات رسول ﷺ اور اہلیہ رسول کا معاملہ ہے، جو تہذیب، تعظیم، تکریم اور احتیاط کا تقاضا کرتا ہے، پھر صحابہ کو یہ بھی یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ ان کی زوجہ محترمہ کو پریشانی اور دکھ نہیں پہنچا بلکہ تمام مومنین کے دل فگار ہوئے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ضرور اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہ کی پاکدامنی پر آیات براۃ نازل فرمائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو ڈانٹ پلائی:

"ولولا اذ سمعتموہ قلتم مایکون لنا ان نتکلم ھذا سبحانک ھذا بھتان عظیم"

ترجمہ: اور تم نے یہ خبر سنتے ہی یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لئے ایسی بات کا زبان پر لانا ہی زیبا نہیں تم کو کہہ دینا چاہیے تھا۔ کہ سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے۔ اگر رسول ﷺ خود فرما دیتے کہ میری اہلیہ اس الزام سے پاک صاف، اور بری ہے۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ کو وہ دائمی عزت، شہرت اور عفت حاصل نہ ہوتی، جو اللہ تعالیٰ کی آیات برات سے حاصل ہوئی، قیامت

تک پوری دنیا میں شب وروز ان آیات کو پڑھا جائیگا۔ اور لاکھوں اور کروڑوں زبانوں سے حضرت عائشہ کی پاکدامنی کے نغمے گونجتے رہیں گے۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ یوسف پر زلیخا نے تہمت لگائی ان کی پاکدامنی کی گواہی ایک شیر خوار بچے نے دی، مگر جب رسول ﷺ کی زوجہ محترمہ پر تہمت لگی تو ان کی پاکدامنی کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے دی۔ اور یہ گواہی جزو قرآن بن گئی، یہ انعام یزدانی اور وحی آسمانی سب کچھ آنحضرت ﷺ کی وجہ سے تھا۔ علامہ محمد ادریس کاندھلوی دیوبندی نے حافظ ابن قیم کے حوالے سے تحریر فرمایا کہ یہ قصہ من جانب اللہ ابتلاء اور امتحان تھا مقصد یہ تھا کہ مومنین، مخلصین کا ایمان اور اخلاص واضح اور منکشف ہو جائے، تو مومنین، صادقین، کے ایمان اور استطاعت میں اور منافقین کے نفاق اور شقاوت میں اضافہ اور زیادتی ہو، نیز یہ امر واضح ہو کہ کون شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اہل خانہ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے اور کون سوئے ظن یعنی آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ بدگمانی حقیقت میں اللہ کے ساتھ بدگمانی ہے، (سیرت المصطفیٰ ص ۳۰۳ ج۔۲)

نزول وحی میں جو ایک ماہ کی تاخیر ہوئی اس میں حکمت یہ تھی کہ عائشہ کے مقام عبودیت کی تکمیل ہو جائے اور جب مظلومانہ گریہ وزاری عاجزانہ بے تابی اور اضطراری اور بارگاہ ذوالجلال میں، انکساری حد کمال کو پہنچ جائے اور خدا کے سوا کسی سے کوئی اُمید باقی نہ رہے۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ حسن ظن اور حسن عقیدت رکھنے والوں کے دل وحی الٰہی کے انتظار میں تڑپنے اور دھڑکنے لگیں اس وقت اللہ تعالیٰ باران وحی سے ان کے مردہ دلوں کو حیات نو بخشے، صدیقہ بنت صدیق کو برات وعفت کا گرانمایہ اعزاز بخشا جائے، بالفرض اگر صحابہ کرام کو اس واقعہ افک کی حقیقت کے بارے علم غیب ہوتا تو ایسے واقعہ میں پھر بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ ہوتے، اس لئے کہ یہ رسول ﷺ کی ذات، اور ان کی محبوبہ رفیقہ حیات کی عفت، عظمت اور طہارت کا معاملہ تھا، ذرا سی لب کشائی بھی دولت ایمان سے محروم کر دیتی، رسول ﷺ کی

ذات، اور انکے گھر کا معاملہ ہونیکی وجہ سے صحابہ کا خاموش رہنا لازمی اور ضروری تھا۔ حضرت عائشہ کی خادمہ بریرہ سے تسلی بخش جواب سن کر آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور کھلے بندوں اعلان فرمایا: "فو اللہ ما علمت علی اہلی الا خیرا"

ترجمہ: خدا کی قسم میں نے اپنے اہل (زوجہ) سے سوائے نیکی اور پاکدامنی کے کچھ نہیں دیکھا، اگر اس واقعہ کی نسبت کہ یہ بہتان ہے، علم غیب نہ ہوتا تو اللہ ذوالجلال کی قسم کھا کر اہلیہ محبوبہ کی پاکدامنی اور نیک چلنی کا اعلان کیوں فرماتے؟ واقعہ افک و بہتان کی تردید اور تکذیب قرآن نے بیان فرمائی، آپ ﷺ کے زمانہ پاک سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے پڑھاتے آرہے ہیں، جلیل القدر مفسرین، اور محدثین نے نور علم، اور ضیائے ایمان کے اجالے میں اس واقعہ کو عقابی نگاہوں سے دیکھا، نظم قرآن سے اُبھرنے والی تعبیری اور تفسیری لہروں میں غوطہ زن ہوئے تو انہیں واقعہ افک کی ہر ہر کڑی، اور اس بہتان عظیم کے ایک ایک لفظ سے عظمت عائشہ کے فوارے پھوٹتے نظر آئے، عفت عائشہ اور تعظیم رسول ﷺ کا سمندر ناپید کنار نظر آیا، مگر حیرت ہے مؤلف پر کہ اسکو براءت عائشہ میں دس آیتیں دیکھ کر کمال مصطفٰے ﷺ کی بجائے نقص مصطفٰی نظر آیا کہ آپ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے۔ نیز انبیاء اور اولیاء ہمہ اوقات ایک حال پر نہیں رہتے، ملا علی قاری نقل فرماتے ہیں: "والحاصل ان احوال الانبیاء والاولیاء مختلفۃ وھذا لم یری یعقوب ولدہ یوسف فی البئر مع قربھا الی بلدہ ووجد ریح قمیص یوسف من حین فصلت من مصر" (مرقات، ۲۷۰، ج، ۲)

ترجمہ: انبیاءؑ اور اولیاءؒ پر مختلف احوال طاری ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو اپنے ہی شہر کنعان کے کنویں میں ڈالا ہوا نہ دیکھ سکے، لیکن ایک وقت آیا کہ قافلہ حضرت یوسف کا کرتہ لے کر ملک مصر سے روانہ ہوا تو اسکی خوشبو آپ نے کنعان میں محسوس کی شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی : چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

ترجمہ: کہ آپ نے حضرت یوسف کے کرتے کی خوشبو مصر سے تو پالی، مگر جب کنعان میں کنویں میں تھے تو آپ معلوم نہ کر سکے اس کا جواب:

بگفت احوال ما برق جہاں است : دمے پیدا و دیگر دم نہاں است

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم : گہے بر پشت پائے خود نہ بینم،

ترجمہ: فرمایا ہمارا حال بجلی کی تڑپ کی طرح ہے کبھی ظاہر اور کبھی چھپا ہوا۔ کبھی علم کی بلندیوں پر براجماں ہو کر دور دور تک دیکھ لیتے ہیں اور کبھی پرواز اتنی پست ہوتی ہے کہ اپنے پاؤں کی پشت کو بھی نہیں دیکھ پاتے اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ کو نسیان کی مرض سے محفوظ رکھتا ہے، غفلت اور لاپرواہی سے دور رکھتا ہے، زیادہ سے زیادہ ذہول ہو سکتا ہے، غفلت اور لاپرواہی جہالت کا نام ہے انبیاءؑ اس سے معصوم ہیں، نسیان کسی چیز کے حافظہ سے نکل جانے کا نام ہے، یہ بھی مستلزم جہالت ہے اللہ کے نبی ﷺ اس سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر علم ہو، غفلت اور لاپروائی نہ ہو، حافظہ ہو مگر توجہ نہ رہے تو یہ ذہول کہلاتا ہے، انبیاءؑ کی توجہ جب کسی امر کی طرف مبذول نہ رہے تو شیءِ مخفی کا علم نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ملا علی نے اسکی تشریح فرمائی اور بطور دلیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا واقعہ نقل فرمایا۔ اس تشریح کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اللہ کے محبوب موتہ کے مقام پر ہونے والی جنگ کا منظر دیکھ کر بیان فرما رہے ہیں۔ حضرت جعفر،

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو شہید ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جھنڈے کی تبدیلی کی کیفیت ملاحظہ فرما رہے ہیں، مگر اپنے ہی ساتھ قافلہ میں موجود اپنی رفیقہ حیات عائشہ صدیقہ کے پیچھے رہ جانے کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ مسجد نبوی کے منبر سے سات آسمانوں سے پار حوض کوثر کا مشاہدہ فرما رہے ہیں۔ قیامت کے دن حوض کوثر پر صحابہ کا ملاقات کرنا، اور حوض کوثر سے جام بھر بھر کر ان کو

پلاناتونظر آرہا ہے،مگرقریب ترین جگہ پر حضرت عائشہ صدیقہ کا پیچھے رہ جانا نظر نہیں آیا اگر کیفیت کی تبدیلی نہ ہوتی حالات مختلف نہ ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ کو دیکھ لیتے اور صحابہ کو بتاتے۔ پھر اگر اسمیں حکمت ہائے خداوندی نہ ہوتیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر آئے ہیں تو یہ واقعہ ہی کیوں پیش آتا۔مولف پر عداوت رسول کے تغلب اور تسلط نے نہ حکمت کو سمجھنے دیا اور نہ آیات برأت کو دیکھنے اور پڑھنے کا موقعہ دیا،،

مؤلف نے اپنی تالیف کے اوراق کوزیادہ کرنے کیلئے واقعہ افک وبہتان کوتوپوری شرح اور بسط سے لکھامگراس کا نچوڑ کیا نکالا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام حضرت علی رضی اللہ عنہ، ازواج مطہرات عالم الغیب نہیں،مگر یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔کہ اس کوکس نے کہا کہ اہل سنت و جماعت ان نفوس قدسیہ کوعالم الغیب مانتے ہیں؟ یاانہوں نے اہل سنت وجماعت کی کس تحریر میں لکھادیکھا ہے خود ہی ایک اُصول وضع کرنا جسکی شریعت نے اجازت نہیں دی اور خود ہی دوسرے کے خلاف پیش کرنا کہاں کی عقل ودانش اور کہاں کاانصاف اور ایمان ہے۔علمائے اُمت کو واقعہ اُفک وبہتان سے عظمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شان عائشہ صدیقہ کی ایک نئی راہ ملی،آیات برات سے ذات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مقام عائشہ کے خفیہ گوشے جلوہ گر ہوئے،شان رسالت اور آن عائشہ صدیقہ اوج کمال کی سرحدوں کو پار کرگئی،مگر کیا کہیں مؤلف کتابچہ کے مبلغ علم کو جسے آیا ت قرآنیہ احادیث نبویہ اور تشریحات علماء کے بپھرے سمندر میں کمال مصطفیٰ اور جمال عائشہ صدیقہ کاایک قطرہ بھی نظر نہ آیا۔نظر آیا تو یہی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوعلم غیب نہ تھا،علم غیب کی نسبت آیات احادیث،تشریحات کاایک ذخیرہ پہلے آچکا ہے،مزید بحث بعد میں آرہی ہے۔حضرت یعقوب کوعلم تھا کہ یوسف کنعان میں ہے۔خود قرآن بتارہا ہے کہ یعقوب نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:**”واعلم من اللہ مالا تعلمون“**

اللہ تعالیٰ نے مجھے ان چیزوں کاعلم دیا ہوا ہے۔جن کا تمہیں علم نہیں۔

برادران یوسف نے بھیڑئیے کے خون سے یوسف کی قمیض کو رنگیں کیا اور حضرت یعقوب کو ثبوت میں پیش کی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ یہ دیکھ کہ آپ نے فرمایا:

"بل سولت لکم انفسکم امرا"

یہ تمھاری اپنی چالبازی اور حیلہ سازی ہے۔ یوسف کو بھیڑئیے نے نہیں کھایا، اگر واقعہ افک و بہتان میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم نہ ہوتا، حضرت عائشہ کی بے گناہی کی تفصیل زیر نظر نہ ہوتی، حضرت عائشہ کی پاکدامنی اور عفت پر نور رسالت ضیاء بار نہ ہوتا، اور منافقین کے خبث باطن پر مطلع نہ ہوتے، اور تین کس صحابہ کے مومن کامل ہونے اور منافقین کی بہتان طرازی میں آجانے کا علم اور خبر نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہ پر حد قذف کیوں جاری فرماتے، اگر عبداللہ بن ابی کے نفاق کا علم نہ ہوتا تو اس پر بھی حد قذف جاری فرماتے، حد قذف معیار شہادت پر جاری فرمائی، علم ہونے کے باوجود تحقیق اس لئے کروائی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ حد قذف کا اجراء بدوں تحقیق اور بدوں شہادت نہیں ہوا۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۴۶، پر پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی رحمہ اللہ علیہ کا فتویٰ کے عنوان سے ان کا قول نقل کیا جو اسطرح سے ہے: **"من یعتقد ان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعلم الغیب فھو کافر لانّ علم الغیب صفة مختصة باالله"**

ترجمہ: جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب جانتے تھے تو وہ کافر ہے کیونکہ علم غیب ایک ایسی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ توضیحاً کہا جائیگا کہ آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اقوال علماء پہلے نقل ہو چکے ہیں کہ اللہ کے بتانے اور عطا فرمانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب جانتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے شمار امور غیبیہ کی خبریں بھی دی ہیں لہذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے علم غیب ماننے والا کافر نہیں، اس پر مفسرین کے اقوال پہلے آچکے ہیں۔ :۱۲ گر

پیران پیر کی اس عبارت کو صحیح سمجھا جائے اور اسکی توجیہ نہ کی جائے تو آیات و احادیث، اقوال علماء کے ساتھ تعارض اور تناقض لازم آئیگا ایسی صورت میں نصوص قطعیہ اور جمہور علماء اور مفسرین کے مقابل شخص واحد کا قول قابل توجہ نہ ہوگا، آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور علمائے اُمت کے متفقہ قول پر عمل کیا جائیگا، کیونکہ علماء نے آپ ﷺ کیلئے غیب کا علم ثابت کرنے والے شخص کو کافر نہیں کہا، بلکہ یہاں تک فرمایا ہے، کہ اگر کوئی شخص یہ دعوٰی کرے کہ وہ غیب جانتا ہے اس کو بھی کافر نہیں کہا جائیگا کیونکہ "**یومنون بالغیب**" کے تحت ہر مومن کا امور غیبیہ جنت، دوزخ، فرشتے وغیرہ، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پیران پیر کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ رسول ﷺ کل مقدورات باری تعالیٰ کا علم ذاتی اور شخصی طور پر رکھتے ہیں۔ وہ کافر ہے کیونکہ مقدورات باری تعالیٰ غیر متنائی بالفعل ہیں اور رسول ﷺ کا علم متناہی اور عطائی ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ الغیب معرف بالام، اور لفظ غیب مصدر ہے، مصدر پر الف ولام کے داخلہ سے معنی جنسی پیدا ہوتا ہے، جنس سے مراد حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے، عبارت مذکورہ بالا کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ غیب کی حقیقت اور ماہیت کا علم رسول ﷺ جانتے ہیں۔ اور بدوں تعلیم خداوندی جانتے ہیں وہ کافر ہے۔ یہ اہل سنت وجماعت کے عقیدہ کے مطابق ہے، مخالف نہیں، چنانچہ اسی عنوان میں ملاعلی قاری نے فرمایا: "**فان للغیب مبادی ولواحق فمبادیہ لا یطلع علیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل واما اللواحق مااظہرہ علی بعض احبائہ لوحۃ عملہ، وخرج ذالک عن الغیب المطلق وصار غیباً اضافیا**"

ترجمہ: غیب کیلئے دو چیزیں ہیں۔ (۱) مبادی (۲) لواحق، غیب کے مبادی، یعنی اسکی حقیقت تفصیل اور مائیت اس پر کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل مطلع نہیں ہوسکتا، اور غیب کے جو لواحقات ہیں۔ یہ ایسے امور ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو مطلع فرماتا ہے، غیب

کی یہ قسم الغیب المطلق جو خاصہ خدا تعالیٰ ہے۔اس سے خارج ہے،اوراس کا نام غیب اضافی ہے،معلوم ہوا کہ جو غیب اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے وہ الغیب المطلق ہے،اورمخلوق کو جو علم غیب حاصل ہے وہ غیب اضافی ہے، پیران پیر کے قول میں جو لفظ آیا ہے وہ غیب معرف بالام ہے اس سے مراد الغیب المطلق ہے،اس کے بارئے میں اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم الغیب المطلق جانتے ہیں تو وہ بلاشبہ کافر ہے۔ملاعلی قاری آگے فرماتے ہیں:

”و ذالک اذاتنور الروح القدسیۃ و ازداد نوریتھا دو و اشراقھا بالاعراض عن ظلمۃ عالم الحس و تخلیۃ مراءۃ القلب عن صدور الطبیعتۃ و المواظیۃ علی العلم و العمل و فیضان الانوار الالھیۃ حتی یقوی النوّر و ینبسط فی فضاء قلبہ فتغکس فیہ النقوش المرتسمہ فی اللوّح المحفوظ و یطلع علی المغیبات و یتصرف فی اجسام العالم السفلی بل یتجد حینئذ الفیاض الا قدس بمعرفتہ التی ھی اشرف العطایا فکیف بغیرھا‘‘ (مرقات ج، ا ص ۶۲)

ترجمہ: بندے کو غیب اضافی کیسے حاصل ہوتا ہے، وہ اسطرح کہ جب روح مقدسہ نورانی ہو جائے۔دنیا کی طلب کے اندھیرے سے اعراض اور طبیعت کی کدورتوں سے شیشہ دل کو روشن کرے اپنے علم،عمل کی پوری طرح پیروی کرے،تو اس پر انوار الٰہیہ کا فیضان ہوتا ہے۔یہاں تک کہ یہی نور قوی اور اسکے پورے دل پر چھا جاتا ہے، پھر اس کے دل کی دنیا نور سے معمور ہو جاتی ہے،لوح محفوظ میں جو نقوش یعنی مخلوقات کی تقادیر ہیں اس نورانی دل میں منعکس یعنی اتر آتی ہیں،اور یہ بندہ اُمور غیبیہ پر مطلع ہوتا ہے،اور کائنات ارضی میں تصرف بھی کرتا ہے، بلکہ اس وقت تو اللہ رب العزت کے انوار و تجلیات بھی دیکھتا ہے،باقی سب کچھ تو رہا در کنار۔

یعنی جب بندہ اپنے علم اور عمل پر کاربند ہو تو نور ربانی اس کے دل پر جلوہ گر ہوتا ہے۔دنیا سے منہ موڑ کہ ذات وحدہٗ ولاشریک کی طرف متوجہ ہوتا ہے،عرفانی مدارج کو طے کرتا ہوا، محبت الٰہی

میں غرق ہو جاتا ہے، اللہ اپنے بندے کے ذوق محبت اور شوق دیدار کو دیکھ کر اسقدر مہربان ہوتا ہے کہ اس پر انوار الٰہیہ، اور تجلیات یزدانیہ کی برسات ہونے لگتی ہے پھر وہ غیب بھی جانتا ہے اور زمینی اجسام میں تصرف کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے، ملا علی قاری نے نقل فرمایا کہ:

"اشتھر عن العرفاء من الاخبار الغیبیة کما قال الشیخ الکبیر ابو عبداللہ فی معتقدہ و نعتقد ان العبد فینقل فی الاحوال حتی یصیر الی نعوت الروحانیة فیعلم الغیب وتطوی له الارض ویمشی علی المآء ویغیب عن الابصار"

(مرقات ج، ۱، ص ۶۲)

ترجمہ: عارفین کے نزدیک غیب کی بات بتانا مشہور ہے، جسطرح شیخ کبیر ابوعبداللہ نے اپنی کتاب 'معتقد' میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ جب بندۂ خدا روحانیت کی صفت سے متصف ہو جائے تو وہ غیب جانتا ہے زمین اس کیلئے سکڑ جاتی ہے وہ پانی پر چلتا اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، ان گذارشات سے ثابت ہوا کہ اللہ کا بندہ جو ولایتِ کاملہ کے درجہ پر فائز ہو، وہ غیب جانتا کائنات میں تصرف کرتا، پانی پر چلتا، آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انوار الٰہیہ کا مشاہدہ بھی کرتا ہے، جب علمائے عارفین کا یہ عقیدہ ہے تو پیران پیر اس بندۂ مومن کو کافر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ان کا فتوی صرف اس شخص کیلئے ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب کے مبادی یعنی الغیب المطلق جانتے ہیں **بحمد اللہ** اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ نہیں مؤلف نے کتابچہ کے ص ۷۴ پر عبارات فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے نام سے اس بات پر عنوان قائم کیا ہے کہ جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیب دان سمجھ لے وہ کافر ہے کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب نہیں جانتے تھے۔ مؤلف نے فتاوٰی خانیہ سے درج ذیل عبارت بھی نقل کی ہے:

(۱) "قال فی الخانیه رجل تزوج امراة بغیر شهود فقال الرجل للمراة خدا را

و پیغمبر را گواہ کردیم قالوا یکون کفر الا نہ اعتقد ان رسول ﷺ یعلم الغیب وھو ما کان یعلم الغیب حین کان فی الاحیاء فکیف بعد الموت۔

ترجمہ: امام حسن بن منصور قاضی خان حنفی رحمہ للہ فرماتے ہیں ایک آدمی نے ایک عورت سے گواہوں کے بغیر نکاح کیا اور اس سے کہا کہ میں نے خدا اور رسول ﷺ کو گواہ بنایا فقہائے کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کفر ہوگا کیونکہ اس نے رسول ﷺ کو غیب دان سمجھ لیا حالانکہ جب آپ ﷺ زندوں میں تھے۔اس وقت غیب نہیں جانتے تھے،تو موت کے بعد کس طرح غیب جاننے لگے، **(۲)''قال فی خلاصۃ رجل تزوج ولم یحضر شاھدا'**

(فقال خدائے را ورسول خدائے را گواہ کردم وفرشتگان را گواہ کردم

'یکفر فی الفتاوٰی لانہ اعتقد ان رسول ﷺ والملک عالم بالغیب (خلاصۃ الفتاوٰی)

ترجمہ:۔ایک آدمی نے نکاح کیا اور گواہ کو نہ بلوایا اور کہا کہ میں نے خدا اور رسول ﷺ کو اور فرشتوں کو گواہ بنایا تو وہ کافر ہوجائے گا کیونکہ اس صورت میں اس نے حضرت محمد ﷺ کو اور فرشتوں کو عالم الغیب سمجھا۔

(۳)''قال فی البزازنعہ تزوج بلا شھود قال خدائے را ورسول ﷺ خدا را و فرشتگاں را گواہ کردم یکفر لانہ اعتقد ان رسول ﷺ الملک یعلمان الغیب ،و نیز دربزازیہ است وعن ھذا قال علمائنا من قال ان ارواح المشائخ حاضرۃ تعلم تکفر''

ترجمہ: کسی آدمی نے بغیر گواہوں کے نکاح کیا اور کہا کہ خدا،رسول خدا،اور فرشتوں کو میں نے گواہ کیا تو کافر ہوجائیگا،کیونکہ اس نے یہ اعتقاد کیا کہ حضرت محمد ﷺ اور فرشتوں کو غیب دان سمجھ لیا اسی وجہ سے ہمارے علماء نے فرمایا کہ جس نے کہا کہ بزرگوں کی روحیں حاضر و ناظر ہیں وہ کافر ہے۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ: حنفی فقہاء کے فتاوٰ ی ،مؤلف کے نامزد کردہ فتاوٰ ی میں ہی محدود اور محصور نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں ان فتاوی پر انحصار کر کے کفر کا فتوی صادر کرنا غلط اور غیر مناسب ہے، فتاوٰ ی درمختار میں ہے

"تزوج یشھادۃ اللّٰہ ورسولہ ﷺ لم یجز ،بل قیل یکفر"

ترجمہ:۔ایک شخص نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر نکاح کیا تو نکاح جائز نہیں ۔"قیل یکفر" کہا گیا ہے کہ وہ کافر ہو جائے گا، اس سے دو قول ثابت ہوئے (۱) جائز نہیں (۲) اس نے کفر کیا، قیل یکفر کے تحت علامہ ابن عابدین شامی نے نقل فرمایا:

"لانہ اعتقد ان رسول ﷺ عالم الغیب ،قال فی التاتر خانیہ"

ترجمہ: تاتارخانیہ میں ہے کہ اس کے کافر ہونیکی وجہ یہ ہے کہ اس نے رسول ﷺ کو غیب دان

سمجھ لیا ہے،

علامہ شامی نے نقل فرمایا:

"وفی الحجۃ ذکر فی الملتقط انہ لا یکفر لان الاشیاء تعرض علی روح النبی ﷺ ،وان الرسل یعرفون بعض الغیب ،قال تعالیٰ عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضیٰ من رسول ﷺ"

ترجمہ: فتاوٰ ی الحجت میں ہے کہ فتاوٰ ی ملتقط میں مذکور ہے کہ وہ شخص کافر نہیں ہوگا، اس لئے کہ اشیاء رسول ﷺ کی روح مقدسہ پر پیش کی جاتی ہیں ۔

۲۔اسلئے بھی کافر نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب خاص پر کسی کو بھی مطلع نہیں فرماتا، ہاں اپنے پسندیدہ رسولوں میں سے جسکو چاہے اپنے غیب خاص پر مطلع فرماتا ہے ۔یعنی درمحتار حجتہ الفتاوی الملتقط ،اور ردالمختار سے ثابت ہوا کہ وہ

شخص کافرنہیں ہوگا کافر نہ ہونے کی دووجہیں ہیں جوابھی بیان ہوئی ہیں (۱) روح مقدسہ پر اشیائے کائنات کا پیش ہونا (۲) غیب خاص پر مطلع فرمایا جانا علامہ ابن عابدین الشامی نے اس شخص کے کافر نہ ہونیکی وجہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”بل ذکر وافی کتب العقائدان من جملة کرامات الاولیاء الاطلاع علی بعض المغیبات وردوا علی المعتزلة المستدلین بھٰذاالاٰیة علی نفیھا بان المراد الاظھار بلاواسطة، والمرار من الرسول الملک ای لایظھر علی غیبه بلاواسطة الا الملک، امّا النبی والاولیاء فیظھرھم علیه بواسطة الملک اوغیرہ“

(ردالمختار جلد ۳ص ۶۷)

ترجمہ: بلکہ علماء نے عقائد کی کتابوں میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ اؤلیاء کی جملہ کرامات میں سے ایک کرامت غیب پر مطلع ہونا ہے، علمائے علم الکلام نے اس آیہء مقدسہ سے فرقہ معتزلہ کا رد بھی کیا ہے، جواؤلیاء اور نبی کریم ﷺ سے علم غیب کی نفی کرتے ہیں، اوراظہارعلی الغیب سے مراد یہ ہے کہ اپنے پسندیدہ رسول کوبغیر واسطہ علم غیب پر مطلع فرماتا ہے، اورآیہء کریمہ میں الا من ارتضی من رسول میں رسول سے مراد، فرشتہ ہے، آیت کامعنی یہ ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ فرشتے کوبغیر واسطہ علم غیب پر مطلع فرماتا اور نبی اوراؤلیاء کوفرشتے کے ذریعے مطلع برغیب فرماتا ہے، علامہ شامی کی اس توضیح سے ثابت ہوا کہ رسول ﷺ کے بارے میں کہ وہ غیب جانتے ہیں عقیدہ رکھنے والا شخص کافر نہیں۔

(۲) ایسے شخص کوکافر کہنا صحیح نہیں کیونکہ صاحب درمختار نے صرف اتنا کہا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کا نکاح جائز نہیں یہ نہیں کہا کہ وہ کافر ہے۔

(۳) جن فقہائے نے کفر کا قول کیا ہے ’قیل‘ کے لفظ سے ذکر کرکے ان کے قول کوضعیف قراردیا ہے

(۴) انبیاء اور اوّلیاء سے علم غیب کی نفی کرنا کہ غیب نہیں جانتے معتزلہ کا عقیدہ ہے، اہل سنت وجماعت کا نہیں۔

(۵) فرشتہ کو علم غیب پر بلا واسطہ مطلع فرماتا ہے اور انبیاء اوّلیاء کو فرشتے کی وساطت سے مطلع فرماتا ہے، لہٰذا فقہاء کی اختلافی عبارات اور آراء کو حتمی اور اجتماعی فتوٰی کے طور پر پیش کرنا غلط ہے۔

(٦) علامہ ابن عابدین الشامی نے فرمایا:

"وامّا ماوقع من بعض الخواص کاالانبیاء والاولیاء بالوحی او الھام مخصوص باعلام من اللہ تعالیٰ فلیس ممانحن فیه" (ردالمختار۔ج۔۴۔ص ۲۴۳)

ترجمہ : بعض خواص جو غیب کی خبریں دیتے ہیں جیسے انبیاء کرام اور اوّلیاء عظام یہ وحی اور الہام ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بتانا ہے اللہ انہیں وحی اور الہام کے ذریعے بتاتا ہے، یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے موضوع کیا ہے کہ کن کن باتوں کی وجہ سے آدمی مرتد ہوتا ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ انبیاء اور اوّلیاء وحی اور الہام کے ذریعے غیب کا علم رکھتے ہیں کفر نہیں، ارتداد نہیں،

(۷) یہی علامہ شامی فرماتے ہیں:

"وحاصله انّ دعوٰی علم الغیب معارضة لنصّ القرآن فیکفر بها الاّ اذا اسند ذالک صریحا او دلالة الی سبب من اللہ تعالیٰ کوحی او لھام"

(ردالمختار جلد ۴، ص ۲۴۳، باب المرتدین)

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دعوٰی علم غیب نصّ قرآنی کے خلاف ہے، لہٰذا ایسے شخص کی تکفیر کی جائیگی، ہاں اگر اس نے دعوٰی علم غیب کی نسبت صراحتہً یا دلالتہ ایسے سبب کی طرف کی جس کا

تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے جیسے وحی یا الہام تو اس کو کافر نہیں کہا جائیگا یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے انبیاء اور الہام کے ذریعے اوٗلیاء کو علم غیب دیتا ہے اور وہ علم غیب جانتے ہیں تو یہ کفر نہ ہوگا۔ ثابت ہوا کہ جن فقہاء نے رسول ﷺ کیلئے علم غیب ماننے اور ثابت کرنے والے شخص کو کافر کہا ہے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر وہ بلاسبب، بدوں وحی، اللہ کے بتانے کے بغیر دعوٰی علم غیب کرے تو پھر کافر ہوگا، کیونکہ ایسی صورت میں نصّ قرآنی کی مخالفت لازم آئیگی اور وہ کفر ہے۔ درمختار میں ہے ”**اذا کان فی المسئلة وجوہ توجب الکفر واحد یمنعہ فعلی المفتی المیل لمایمنعہ**“

ترجمہ: اگر ایک مسئلہ میں ایسی کئی وجوہ ہوں جو کفر ثابت کرتی ہوں، مگر صرف ایک وجہ ایسی ہو ،جو حکم کفر یعنی فتوٰی کفر سے روکتی ہو مفتی پر لازم ہے وہ اس ایک وجہ پر عمل کرتے ہوئے فتوٰی کفر سے رک جائے۔ امام خیر الدین الرملی نے فرمایا:

”**اقول ولو کانت الروایۃ لغیر اھل مذھبنا ویدل علی ذالک اشتراط کون مایوجب الکفر مجمعا علیہ**“ (ردالمختار، جلد ۴، ص ۲۳۰ باب المرتد)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ اگر وہ ضعیف روایت ہمارے مذہب والوں کی نہ ہو تب بھی اس شخص کو کافر قرار نہیں دیا جائیگا جس سے اس شخص پر کفر کا فتوٰی لگ سکتا ہے۔ وہ وجہ ایسی ہو جس پر تمام آئمہ اور فقہاء کا اجماع ہو۔ فتاوٰی خانیہ، خلاصہ الفتاوٰی یزازیہ، مجموعہ، انفتاوٰی میں اس شخص کے کافر ہونیکی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ اجماعی نہیں دیگر جلیل القدر آئمہ اور فقہاء نے اس کو رد کر دیا ہے، دوسرا یہ کہ اس وجہ کے مقابل نصّ قرآنی موجود ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے نقل فرمایا: ”**عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الاّ من ارتضی من رسول**“

فتاوٰی خانیہ وغیرہ میں نبی ﷺ کیلئے علم غیب ثابت کرنے والے شخص پر کفر کا فتوٰی دینا فقہائے کرام کے جمہوری اصول کے خلاف ہے۔ لہذا مردود اور مرجوح ہے خلاصۂ بحث

یہ ہے کہ وہ شخص اس وقت کافر ہوگا جب وہ یہ دعویٰ کرے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر ذاتی طور پر علم غیب جانتے ہیں☆ و اللہ الحمد ☆

مؤلف نے کتابچہ کے ص، ۴۹ پر لکھا کہ خلیفہ منصور نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا تو اس سے اپنی بقیہ عمر کے بارے میں سوال کیا کہ میری عمر کتنی باقی ہے؟ تو فرشتے نے پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا اور غائب ہو گیا، منصور نے تعبیر دانوں کے سامنے اپنا خواب بیان کیا ان میں حضرت امام اعظم امام ابوحنیفہ بھی تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حضرت امام ابوحنیفہ نے فرمایا: "ھو اشارۃ الی ھذہ العلوم الخمسۃ لا یعلمھا الا اللہ"

ترجمہ: وہ ان غیوب کی طرف اشارہ ہے۔جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا،

مؤلف نے لکھا جو لوگ حنفی ہونے کے دعویدار ہیں ان کیلئے امام اعظم کا فیصلہ کافی ہونا چاہئیے ،ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر غلط عقیدہ سے توبہ کرنا چاہیئے''

توضیحاً کہا جائے گا: مؤلف بڑے دور کی کوڑی لائے ہیں۔انہیں نبی کریم ﷺ کے علم غیب سے اتنی چڑھے کہ انہیں خلیفہ منصور کا خواب بھی یاد آ گیا، اور اس سے بھی رسول ﷺ سے علم غیب کی نفی پر استدلال کیا اور تفسیر مدارک کا حوالہ دیا، مؤلف کو علم ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے اور خواب منصور نے دیکھا منصور نعوذ باللہ نبی یا رسول نہیں ایک عام آدمی ہے، پیغمبر اور رسول کے علاوہ ہر شخص کا خواب کوئی حیثیت اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس سے دین متین کا حکم ثابت ہوتا ہے نہ حذف، بندے کا خواب دین متین کی تشریحی اور تشریعی حیثیت میں معاون ہے، نہ مددگار جب اسکی کوئی حقیقت اور حیثیت ہے ہی نہیں تو اس کا سہارا لینا ایسا ہی ہے جیسے ریت کے گروندوں پر محل تعمیر کرنا، عام بندوں کے خواب تو اضغاث احلام ہیں، ہاں انبیاء کرام کے خواب وحی کی صورت ہوتے ہیں۔جو قابل اعتماد اور سچے ہوتے ہیں اور انبیائے کرام کیلئے ان پر چلنا بھی لازمی ہوتا ہے، جیسے حضرت یوسف اور حضرت ابراہیم، اور نبی کریم ﷺ کے خواب

،لیکن مؤلف نے تفسیر مدارک کو قابل استدلال سمجھا اور اس میں منصور کے خواب کا پڑھا اور پھر استدلال کیا، مؤلف کے اس طرز عمل سے ہمیں موقعہ ملا ہے کہ ہم بھی علوم خمسہ کے بارے میں تفسیر مدارک سے کچھ نقل کریں۔ مدارک نے آیہء کریمہ ”یسئلونک عن الساعة ایان مرسھا فیم انت ذکرھا“ کے تحت تحریر فرمایا: ”و کان رسول اللہ علیہ السلام لم یزل یذکر الساعة ویُسئل عنھا حتی نزلت فھو تعجب من کثرة ذکرھا“

ترجمہ: رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کا بہت ہی ذکر فرمایا کرتے تھے اور اس کے بارے میں سوال کئے جاتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت اتری پس یہ آیت تعجب ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیادہ ذکر قیامت فرمانے پر، اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر ذکر قیامت فرماتے ہیں۔

پھر تحریر فرمایا: ”او فیما انکار بسوالھم عنھا ای فیما ھذا السوال ثم قال انت من ذکراھا و انت آخر الانبیاء علامة من علاماتھا فلا معنیٰ لسوالھم عنھا“

ترجمہ: کفار کے سوال کا انکار ہے یعنی یہ سوال کس شمار میں ہے، پھر ارشاد ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں، اور قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہیں۔ اب ان کا قیامت کے بارے میں پوچھنے کا کوئی مقصد ہی نہیں، اب اس آیت کا معنیٰ ہوا کہ قیامت کے بارے میں ان کا پوچھنا فضول اور بے معنی ہے

آگے فرمایا: ”قیل فیما انت من ذکراھا متصل بالسوال، ای یسئلونک عن الساعة ایان مرسھا ویقولون این انت من ذکراھا ثم استأنف فقال الی ربک“ یہ بھی کہا گیا ہے فیما انت سوال سے متصل ہے، یعنی کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے ہیں قیامت کا قیام کب ہوگا؟ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم کہاں سے آیا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا سلسلہ کلام شروع فرمایا، الیٰ ربک ایسی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوا کہ کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

پوچھا کہ قیامت کا علم آپ ﷺ کو کہاں سے آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے تو یہ آیہء کریمہ علم قیامت کا ثبوت اور دلیل ہے۔ پھر فرمایا:

"انما انت منذر من یخشھا ای لم تبعث لتعلمھم بوقت الساعة انما انت الایہ"

ترجمہ: آپ ﷺ اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ کفار کو وقت قیامت کی خبر دیں، اب آیت کا معنی یہ ہوا کہ کفار کا یہ کہنا کہ اگر آپ ﷺ وقت قیامت کی خبر دیں تو نبی ہیں، اگر خبر نہیں دیں گے تو نبی نہیں یہ محض ایک بے ہودگی ہے اس لئے قیامت کے وقت کی خبر دینا نبوت کے فرائض میں سے نہیں، نبی ﷺ کا فرض منصبی احکام خداوندی کی تبلیغ ہے۔ ان مذکورہ بالا صاحب مدارک کی تفسیری عبارات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو قیامت کے قیام کا علم دیا ہے اور آپ ﷺ وقت قیامت کو جانتے ہیں اگر مولف کو مدارک میں منقول منصور کے خواب پر پورا یقین اور ایمان ہے تو قرآنی آیات پر بھی ایمان اور یقین ہونا چاہئیے۔ اگر مولف نے خواب پر اسلئے یقین کیا اور ایمان لائے۔ کہ تفسیر مدارک میں ہے تو پھر ان کو ان تفاسیر پر بھی یقین اور ایمان لانا ہوگا کیونکہ یہ بھی مدارک میں ہیں۔ مولف کیلئے یہاں یہ محاورہ بہت ہی موزوں نظر آیا۔ **"فر من المطر و وقف تحت المیزاب"** ترجمہ: بارش سے بھاگے اور پرنالے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

تفسیر مدارک سے رسول ﷺ سے علم قیامت کی نفی پر خواب منصور پیش کیا، مگر اسی تفسیر مدارک سے وقت قیامت کا علم ہونیکی تصدیق فراہم ہوئی۔ **"ذالک من فضل اللہ لا من حیلتی و انی اعد علی فضولا"**

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۵۰ پر اشکال قائم کیا جس کے ضمن میں یہ تحریر کیا کہ

جب ابراہیم نے خواب میں دیکھا کہ اپنے فرزند کو ذبح کر رہا ہوں اور پھر اس کو حکم خداوندی سمجھ کر چھری لیکر اپنے جگر پارے کو اوندھے منہ لٹایا اور پھر چھری چلانا شروع کیا اور ثابت کر دکھایا

کہ لاڈلے بیٹے کا گلا کٹ سکتا ہے،لیکن فرمان الٰہی میں پس وپیش نہیں ہوسکتی۔اس واقعہ سے متعلق یہ اشکال ہے کہ جس وقت ابراھیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے لے جارہے تھے ،تو ان کو یہ معلوم تھا یانہیں میں چھری چلاوں گالیکن بیٹے کا گلا نہیں کٹے گا۔بلکہ جنت سے دنبہ آ کر ذبح ہوگا اگر کوئی کہے کہ یہ علم نہیں تھا۔تو پھر خلیل اللہ علیہ السلام کی قربانی اور واقعہ کی عظمت تو اپنی جگہ برقرار رہی البتہ اس سے علم غیب کا خودساختہ عقیدہ پاش پاش ہوجائیگا کیوں کہ آجکل کے عاشق تو اؤلیاء اور تمام انبیاء کو عالم الغیب سمجھتے ہیں۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ برس تھی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حلیم بیٹے کی بشارت دی تھی، اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں جن کی عمر بوقت ذبح تیرہ برس تھی،مؤلف کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہ چھری چلاتے وقت یا منیٰ میں لے جاتے وقت جنت سے دنبہ آنے اور ذبح ہونے کا علم تھا اشکال وارد کرنا غلط ہے۔کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی امر کی اطاعت کرنا تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھا تھا،خواب میں صرف ذبح کرنا ہی تھا،ذبح کے بعد اسماعیل علیہ السلام کا قربان ہونا یا نہ ہونا دنبے کا جنت سے آنا اور ذبح ہونا کارہائے خواب کا حصہ نہیں تا کہ اسکو زیر غور اور ملحوظ خاطر رکھا جاتا،امام رازی فرماتے ہیں:

”انہ علیہ السلام قال لولدہ انی اری فی المنام انی اذبحک فقال الولد افعل ماتؤمر وھذا یدل انہ علیہ السلام کان ماموراً بمقدمات الذبح لا بنفس الذبح ۔ثم انہ اتی بمقدمات الذبح فادھا فی الوجود فحینئذ یکون قد امر بشی و قد اتی بہ“ (کبیر جز،۲۷ ص ۱۵۵)

ترجمہ: ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام سے مشورہ کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں، اسماعیل نے جواب دیا کہ جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے

،وہ آپ کردیں،امام فرماتے ہیں یہ کلام دلالت کرتی ہے کہ آپ کو ذبح یعنی جان سے ختم کرنے کا نہیں بلکہ ذبح کے مقدمات بجالانے کا حکم دیا گیا تھا،اور یہ مقدمات آپ بجالائے ،مثلاً اسماعیل کو زمین پر لٹانا،ان کے حلق پر چھری رکھنا،چلانا،اوران کے روبعمل لانے کیلئے پختہ اور مصمم ارادے کا کرنا،یہ جملہ اُمور معرض وجود میں آئے،امام الامر الثانی کے تحت فرماتے ہیں :۔

"الذبح عبارة عن قطع الحلقوم فلعل ابراهيم عليه السلام قطع الحلقوم الا انه كلما قطع جزا اعاد الله التاليف اليه فلهذا اسبب لم يحصل الموت"

(کبیر جز ۲۷، ص ۱۵۵)

ترجمہ: ذبح حلقوم کے کاٹنے کا نام ہے شاید ابراہیم کاٹتے جارہے ہوں اور اللہ تعالیٰ اسی لمحے اسکو درست فرماتا رہا ہو اور موت نہ آنے کا سبب بھی یہی ہو،امام کی تفسیر سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا گلا کاٹا مگر اسی آن اللہ نے درست فرمادیا۔اس عمل کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا"ونادیناہ ان یاابراھیم قدصدقت الرویا"ہم نے آواز دی اے ابراہیم علیہ السلام!تو نے خواب سچا کردکھایا"وفدیناہ بذبح عظیم،،یہ اللہ تعالیٰ کا اپنی طرف سے ایک انعام تھا۔جو اسماعیل علیہ السلام کی جگہ دنبہ کی صورت میں جنت سے لاکر ذبح کروایا گیا۔ان آیات سے یہ روزروشن کیطرح عیاں ہے۔کہ خلیل اللہ کا عمل،علم،فکرونظر اس چیز پر محدود اور مرکوز تھی۔جو آپ نے خواب میں دیکھی تھی۔خواب میں صرف اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا دیکھا تھا،دنبہ کا فدیہ بننا اور ذبح ہونا اس خواب کا حصہ ہی نہیں تو اس کا علم کیوں ہوتا ؟مؤلف کا یہ کہنا کہ عاشق اوٓلیاء اور تمام انبیاء کو عالم الغیب سمجھتے ہیں یہ کذب واختراع ہے اہل سنت وجماعت کا اس سے کوئی تعلق نہیں متعدد بار پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ کوئی مخلوق عالم الغیب نہیں،عالم الغیب اللہ وحدہ لاشریک ہے،مزید اہل سنت وجماعت تمام انبیاء کیلئے علم غیب کا

عقیدہ نہیں رکھتے، اپنے نبی ﷺ کیلئے اللہ تعالیٰ کے علم غیب بتانے اور دینے سے غیب دان ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

مزید۔۔۔۔اس واقعہ سے اسماعیل کے حقیقتاً ذبح ہونے، موت واقع ہونے، دنبہ کے آنے اور ذبح ہونے کا معاملہ نہ تھا۔ تاکہ ادھر بھی دھیان دیتے، خیال فرماتے اور توجہ دیتے بلکہ مقصد صرف ان کی اطاعت کاملہ اور محبت صادقہ کا اظہار تھا، امام رازی نے فرمایا:

"**وظهر منه كمال الطاعة وظهر من ولده كمال الطاعة والانقياد لاجرم قال له قد صدقت الرؤيا يعنى حصل المقصود من تلك الرؤيا**" (کبیر، ایضا)

اس فعل ذبح سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے اطاعت کاملہ کا ظہور ہوا اور اس پر ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ بے شک تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا اس خواب سے مقصد پورا ہو گیا یعنی باپ کی لازوال اطاعت، با کمال فرمانبرداری، اور بے مثال محبت و عشق الٰہی معرض وجود میں آیا۔ ایک محب صادق اور عاشق جاں نثار کی ساری تگ و دو کا مقصد محبوب کی توجہ، نظر کرم کا حصول ہوتا ہے نہ کہ مال و دولت کا حصول؟ خلیل اللہ اور ذبیح اللہ کی قربانی اور جان نثاری کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ نہ کہ دنبے کا آنا اور ذبح ہونا، بالفرض اگر ابراہیم کو علم تھا کہ دنبہ آئے گا تو اس سے کونسی ملی بھگت اور فراڈ ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور ابراہیم کی شان میں یہ گستاخانہ کلمات تحریر کرتے وقت مؤلف کے علم و دانش اور ایمان پر لرزہ طاری نہیں ہوا، خمیر انسانی نے جھرجھری نہیں لی، اگر مان لیا جائے تو کون سی قیامت آئیگی کیا انبیاء کو اللہ تعالیٰ علم نہیں دیتا؟ واقعات کی گہرائی اور تفاصیل سے بہرہ مند نہیں فرماتا، کیا ابراہیم خلیل اللہ نبی نہیں؟ جن کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: "**كذالك ترى ابراهيم ملكوت السمٰوت والارض الاٰيه**" خواب ابراہیم اور اس پر عمل داری کے تناظر میں دنبے کا علم ہو کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا، مؤلف نے علامہ بننے کیلئے اشکال کی سرخی قائم کی ہے،

مؤلف ہمت کر کے بھی کوئی ایک آیت پیش نہیں کر سکتے جس میں صریحاً فرمایا گیا ہو کہ انبیاء کو علم نہیں دیا جاتا۔

اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ "**یؤمنون بالغیب**" کے تحت اشیائے غاکّہ جنت دوزخ کا علم مؤلف کو ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ بھی کافر ہوئے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے سوا غیب کوئی نہیں جانتا، نہ عطائی نہ ذاتی، جزی نہ کلی اور جو یہ کہے کہ انبیاء بالخصوص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب جانتے ہیں وہ کافر ہے اس پر آئمہ اور فقہاء کے فتاوٰی بھی نقل کئے ہیں، اور اگر "**یؤمنون بالغیب**" کے تحت ان اشیاء کا علم نہیں تو "**یومنون بالغیب**" پر عمل نہ ہوا یہ بھی کفر ہے کیونکہ یہ انکار قرآن ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ اشیاء غاکّہ نہیں یہ بھی کفر ہے "**فما جوابکم ھو جوابنا**"

امام رازی نے سوال جواب کی صورت میں یہ لکھا کہ ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں ہم، کہ غیب جانتے ہیں کیونکہ ان اشیائے غاکّہ پر دلیل شرعی موجود ہے۔ دلیل شرعی کی موجودگی میں بھی ان اُمور غاکّہ کا علم رکھنے والا شخص نعوذ باللہ کافر ہے تو پھر دنیا اسلام میں کون مومن رہے گا؟ مؤلف اور ان کے ہمنوا بھی اس طوفان بدتمیزی میں آجائیں گے۔ "**تفکر و تدبر**"

قرآن حکیم اور احادیث میں جو اُمور خمسہ کے علم کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ان کا کلی علم ہے جزی نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا کلی تفصیلی علم نہیں بلکہ جزی علم اپنے پسندیدہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا

فرمایا ہے، چنانچہ ملا علی قاری نقل فرماتے ہیں:

"**فان قلت قد اخبر الانبیاء بشیء کثیر من ذالک فکیف الحصر, قلت الحصر باعتبار کلیاتھا دون جزئیاتھا قال تعالی فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول بناء علی اتصال الاستثناء الذی ھو الاصل**" (مرقاۃ، ج ص ٦٥)

ترجمہ: اگر آپ یہ سوال کریں کہ انبیاء اور اولیاء نے بے شمار اُمور غاکّہ کی خبریں دی ہیں تو یہ

حصر کیسے صحیح ہوگا کہ ان اُمورِ خمسہ کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ حصر کلیات کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ان پانچ اُمور کا کلی اور تفصیلی علم اللہ کے بغیر کوئی نہیں جانتا، اور ان کی جزئیات کا علم انبیاء اور اوّلیاء کو حاصل ہے اور اسکی دلیل یہ آئیہ مقدسہ ہے، **"فلایظهر علی غیبه احدا الا من ارتضی من رسول"**

آیہء کریمہ میں استثناء متصل ہے، منقطع نہیں کہ "من رسول" کو خارج سمجھا جائے،

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ رسول ﷺ کے علاوہ وہ کسی کو بھی اپنے غیب خاص پر مطلع نہیں فرماتا، اور آیہء مقدسہ میں "الا من ارتضی من رسول، مستثنیٰ متصل ہے، اور یہی اصل ہے،

امام قرطبی کا قول نقل فرمایا: "**وقال القرطبی من ادعی علم شیء منها غیر مستند الیه علیه الصلوة والسلام کان کاذبا فی دعواه**" (مرقاۃ ج ۱، ص ۶۵)

ترجمہ: امام قرطبی نے فرمایا کہ جو شخص ان پانچ اُمور میں سے کسی علم کا دعوٰی کرے اور اس علم کی نسبت رسول ﷺ کی طرف نہ کرے وہ دعوٰی میں جھوٹا ہے۔ ملا علی قاری کی توضیح سے ثابت ہوا کہ ان پانچ امور کا علم کلی اور تفصیلی طور پر اللہ ہی جانتا ہے، انبیاء اور اوّلیاء کو اللہ تعالیٰ نے ان کی جزئیات کا علم دیا ہوا ہے، اور امام قرطبی نے فرمایا کہ ان جزئیات کا علم بھی نبی ﷺ کے وسیلہ سے ہی عطا کیا گیا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ دیگر انبیاء اور اوّلیاء کو تو رسول ﷺ کے وسیلہ سے علم غیب دیا جائے اور خود رسول ﷺ کو نہ دیا جائے۔ ملا علی قاری نے نقل فرمایا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وماتدری نفس ماذاتکسب غدا، وماتدری نفس بایّ ارض تموت"

اس میں تدری کا لفظ آیا ہے، جو درایۃ سے ماخوذ ہے اور درایۃ کا معنی بیان فرماتے ہوئے نقل فرمایا "**لانّ الدّرایۃ اکتساب علم الشیء بحیلۃ**"

ترجمہ: حیلہ سازی اور عقل ودانش کے بل بوتے کسی شی کا علم حاصل کرنا درایۃ کہلاتا ہے اب آیت کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے حیلے، عقلی کاوش سے ان پانچ چیزوں کا علم حاصل نہیں کر

سکتا، اللہ تعالیٰ ہی ان کا علم عطا فرماتا ہے، اور وہ بھی اپنے خاص رسول کو، نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کوئی پسندیدہ رسول نہیں لہٰذا آیہء کریمہ کے تحت رسول اللہ ﷺ کو ان امور خمسہ کا علم اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمایا ہے۔ امام رازی علیہ الرحمہ نے اسی آیت کے تحت فرمایا:

"ای وقت وقوع القیامۃ من الغیب الّذی لا یظہرہ اللہ لاحد"

ترجمہ: غیبہ سے مراد قیامت کے قائم ہونے کا وقت ہے اور یہ وہ غیب ہے جس پر اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مطلع نہیں فرماتا "علی غیبہ" پر فرمایا لفظ مفرد مضاف "فیکفی فی العمل بہ حملہ علی غیب واحد اما العموم فلیس فی اللفظ دلالۃ علیہ"

ترجمہ: غیب کا لفظ مفرد اور مضاف ہے؟ "ہ" ضمیر کی طرف اور قاعدہ مضاف کے عمل میں اسکو ایک غیب پر حمل کیا جائیگا اور وہ غیب خاص یعنی قیامت کے قائم ہونے کا وقت خاص ہے

، آگے فرمایا: "فان قیل اذا حملتم ذالک علی القیامۃ فکیف قال الا من ارتضیٰ من رسول ﷺ مع انہ لا یظہر ھذا الغیب لاحد من رسلہ قلنا بل یظہرہ عند القرب من اقامۃ القیامۃ، وکیف لا وقد قال یوم تشقق السمآء بالغمام ونزل الملائکۃ تنزیلا"

ترجمہ: اگر یہ کہا جائے کہ "غیبہ" میں غیب سے مراد وقت قیام قیامت مراد لینا غلط ہے کیونکہ ایسی صورت میں لازم آئیگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص رسول کو اس غیب خاص پر مطلع فرمائے، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے کسی کو بھی اس پر مطلع نہیں

فرمایا، ہم کہیں گے کہ قرب قیامت کو اللہ تعالیٰ وقت قیام قیامت کا علم ظاہر فرمائے گا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول خاص کو اس کا علم عطا نہ فرمائے، اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائیگا اور فرشتے لگا تار اُتارے جائیں گے، پھر فرمایا:

"لا شک ان الملائکة یعلمون فی ذالک الوقت قیام القیامة، و ایضًا یحتمل ان یکون هذا الاستثناء منقطعا، کانه قال عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه المخصوص و هو قیام القیامة احدا ثم قال بعده لکن من ارتضی من رسول" (کبیر۔جز، ۳۰ص ۱۶۸)

ترجمہ: بے شک یقینا فرشتے اس وقت قیام کا وقت جان لیں گے،

۲۔اس میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "الا من ارتضیٰ الایه، مستثنیٰ منقطع ہو۔ایسی صورت میں ترتیب آیت یوں ہوگی۔

"عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه المخصوص (و هو قیام القیامة) احدًا"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اپنے غیب مخصوص یعنی وقت قیام قیامت پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا۔ پھر اسکے بعد فرمایا لیکن اپنے پسندیدہ رسول ﷺ کو غیب خاص یعنی وقت قیام قیامت پر مطلع فرماتا ہے ،امام رازی کی مندرجہ بالا تفسیر سے معلوم اور ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص غیب یعنی قیامت کے قائم ہونے کے مخصوص وقت پر اپنے پسندیدہ رسول ﷺ کو مطلع فرمایا ہوا ہے اور وہ پسندیدہ رسول ﷺ کی ذات گرامی ہے بلکہ امام رازی نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ قرب قیامت کا علم اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی عطا فرمائے گا لہذا بلا دھڑک یہ کہنا کہ رسول ﷺ کو وقت قیام قیامت کا علم نہیں غلط ہے آیات قرآنیہ، احادیث، اور علمائے اُمت کی تصریحات اور تشریحات کے خلاف ہے، امام رازی فرماتے ہیں: **"و اعلم انه لا بد من القطع بانه لیس مراد الله من هذه الایة ان لا یطلع احدا علی شیء من المغیبات الا الرسل**

ترجمہ: یہاں اس بات کا جاننا اور یقین کرنا بہت ضروری ہے کہ آیہء کریمہ کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ رسول کے علاوہ اور کسی شخص کو اُمور غا کہ پر مطلع نہیں فرماتا:

"انہ ثبت بالا خبار القریبۃ من التواتر ان شقا وسطحا کانا کاھنین یخبر ان بظھور نبیا محمد ﷺ قبل زمان ظھورہ و کانا فی العرب مشھورین بھٰذا النوع من العلم، حتی رجع الیھما کسرٰی فی تعرف اخبار رسولنا محمد ﷺ فثبت ان اللہ تعالیٰ قد یطلع غیر الرسل علی شیء من الغیب"

ترجمہ: بلکہ یہ بات اخبار متواترہ کے قریب ترین احادیث سے ثابت ہے کہ عرب میں دو کاہن مشہور تھے ایک کا نام شقی اور دوسرے کا نام سطیح تھا یہ دونوں ہمارے نبی ﷺ کے ظہور کی خبریں دیا کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ کا ظہور نہ ہوا تھا، وہ اُمور غا کہ کا علم رکھنے میں مشہور تھے، ہمارے رسول ﷺ کے حالات معلوم کرنے کیلئے کِسریٰ نے بھی ان سے رجوع کیا پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کے علاوہ بھی لوگوں کو علم غیب دیتا ہے۔ پھر فرمایا:

"انّ جمیع ارباب الملل و الادیان مطبقون علی صحۃ علم التعبیر و انّ المعبر قد یخیر عن وقوع الوقائع فی المستقل، ویکون صادقا فیہ"

ترجمہ: تمام ادیان اور مذاہب کے پیروکاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تعبیر کا ایک علم ہے ،اور خواب کی تعبیر بتانے والا شخص مستقبل میں ہونے والے واقعات کی پیشگی خبر دیتا ہے اور اسکی خبر سچ ثابت ہوتی ہے۔ پھر فرمایا:

"ان الکاھنۃ البغدادیۃ الّتی نفلھا السلطان سنجرین ملک شاہ من بغداد الی خراسان وساء لھا عن احوال الاٰیتہ فی المستقبل فذکرت اشیاء ثم انھا وقعت علی وفق کلامھا" (کبیر، جز، ۳۰ ص ۱۴۹)

ترجمہ: سلطان سنجرین ملک شاہ والیء بغداد نے، بغداد کے کاہنوں کو بغداد سے خراسان

منتقل کیا اور ان سے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی نسبت پوچھا انہوں نے بتایا، پھر وہ حالات و واقعات اسی طرح رونما ہوئے جس طرح انہوں نے بتایا تھا۔

امام رازی کی اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ جو لوگ نجوم اور خواب کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی غیب کا علم عطا فرماتا ہے۔ اور وہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں۔ نجوم اور تعبیر کا علم رکھنے والے کو تو اللہ اُمور غیبیہ کا علم دیتا ہے۔ مگر جس کو قرآن کی تعلیم خود دے اور فرمائے کہ ''**علمک مالم تکن**'' جن جن چیزوں کا آپ ﷺ کو علم نہ تھا وہ ہم نے آپ ﷺ کو تعلیم کردی ہیں، قرآن کیا ہے ''**تبیانا لکل شیء تفصیل الکتب لا ریب فیه و لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین کل صغیر و کبیر مستطر**،، جب ان صفات کا حامل قرآن اللہ نے خود اپنے رسول ﷺ کو سکھایا، خدا نے ہر ہر چیز کی تعلیم دینے میں کوئی کمی اور کوئی کسر نہ چھوڑی، اور مصطفیٰ ﷺ نے علم لینے اور سیکھنے میں کوئی کوتاہی کی نہ کسر چھوڑی تو پھر ان کے متعلق یہ کہنا کہ جو ان کیلئے علم غیب کا عقیدہ رکھے وہ نعوذ باللہ کافر ہے، ایسا کہنا، لکھنا کس قدر ظلم زیادتی، جہالت اور دین سے دوری ہے۔

مؤلف کتابچہ نے ص ۶۵ پر مسئلہ استعانت اور پکار کا عنوان قائم کیا

اور اس کے تحت سرخی جمائی کہ یونس علیہ السلام نے بھی مچھلی کے پیٹ میں مختار کائنات کو پکارا تھا، آیہء کریمہ بھی نقل کی:

''فنادٰی فی الظلمٰت ان لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین، فاستجبنا له و نجینه من الغم و کذالک ننجی المؤمنین'' (الانبیاء)

ترجمہ: پس پکارا حضرت یونس علیہ السلام نے اندھیروں میں یہ کہ تیرے بغیر کوئی بچانے والا نہیں ہے، تیری ذات پاک ہے، بلا شبہ میں تھا اپنے خیال میں زیادتی کرنے والوں سے پس ہم نے دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اسطرح ہم ایمانداروں کو نجات دیا کرتے

ہیں،

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ ہر مومن موحد کا عقیدہ ہے کہ ہر حال اور ہر کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، دنیاوی ہو یا اخروی میں اللہ ہی کو پکارنا اور اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور وہی معاون اور مددگار ہے، مؤلف نے حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ نقل کیا درست ہے، اس پر ایمان لانا شرائط ایمان سے ہے ،سوال یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے،اور مچھلی سمندر میں تھی،مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا، پانی کی موجوں کا اندھیرا، پھر مچھلی ان کو لئے پھرتی اندھیروں پر اندھیرا ہے، اسباب عادی اور اسباب ظاہری منقطع ہو چکے ہیں مچھلی نے اپنے پیٹ میں بحکم خداوندی رکھا ہوا ہے ۔وہ ناراض ہو کر چلے گئے تھے، ایسی مشکل ترین کیفیت اور جان لیوا لمحات، اور غیر معلوم مدت اور انجانے حال اور بے سروسامانی کے عالم، اور مچھلی کے تاریک شکم میں اللہ تعالیٰ کو نہ پکارتے تو کیا کرتے؟ کیونکہ یہ تو وہ صورت حال ہے جس سے اللہ ہی باہر نکال سکتا ہے اور یہ صورت حال اللہ ہی کے دست قدرت میں تھی، اور جس وجہ سے پیدا ہوئی تھی اس کا تعلق بھی فقط حضرت یونس علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تھا، اس لئے رہائی کیلئے ذات باری تعالیٰ کو ہی پکارا بالفرض اگر مخلوق انسانی کو پکارتے تو وہ کیا مدد کرتی؟ بلکہ اگر کوئی مقرب فرشتہ بھی ان کی مدد کیلئے آتا یا بھیج دیا جاتا اور وہ نصرت واعانت کی پیشکش کر دیتا تو بھی آپ علیہ السلام قبول نہ کرتے، کیونکہ انبیائے کرام ذات وحدہٗ لاشریک کے مراقبہ، اور صفات خداوندی کے مشاہدہ میں مستغرق ہوتے ہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کا مقام تو ارفع واعلیٰ ہے، عارفین کے دل میں اللہ وحدہ لاشریک کی ذات وصفات کے علاوہ کسی دوسری چیز کے تصور اور ارادہ کا گزر تک نہیں ہوتا، ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے عارف باللہ ابن الفارض کا یہ شعر اسی عنوان میں نقل فرمایا ہے: ”ولو خطرت لی فی سواک ارادۃ۔علی خاطری سھوا حکمت یر دتی“

(شرح فقہ اکبر ص ۲۹)

اے اللہ! اگر میرے دل میں تیری ذات کے علاوہ کسی اور کے ارادے اور تصور کا گزر ہو جائے تو میں اپنے آپ کو مرتد ہو جانے کا حکم دیتا ہوں۔ ہر مشکل، ہر مصیبت، ہر پریشانی میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا، اسی کو پکارنا ایمانیات سے ہے، مسلمہ امر کو اعتراض اور معارضہ کی صورت میں نقل کرنا جہالت ہے،،

مؤلف نے حضور ﷺ کا اپنا عمل؛ عنوان قائم کیا، اور حدیث بطور دلیل نقل کی:

”عن ابی طلحة رضی اللہ عنہ قال کنّا مع رسول ﷺ فی غزاة فلقی العدوّ فسمعته یقول یا مالک یوم الدین ایاک نعبدو ایاک نستعین، قال فلقدر ائت الرجال تصدع تضر بها الملائکة من بین یدیها و من خلفها“

(تفسیر ادر منثور ص ۱۴ ج، ۱ کتابچہ ص ۲۲)

ترجمہ: حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ ایک جنگ میں تھے آپ ﷺ کے سامنے دشمن آ گیا، پس میں نے آپ ﷺ کو سنا فرما رہے تھے، اے مالک یوم الدین ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، پس میں نے لوگوں کو دیکھا بھاگ رہے تھے اور فرشتے ان کو آگے پیچھے سے مار رہے تھے۔

فائدہ کے ضمن میں تحریر کیا کہ دشمن کے مقابلہ میں آپ ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ کو مدد کیلئے پکارا ،مگر

آجکل کا رسمی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوروں کو پکارنے پر زور دے رہا ہے“

(قول' پہلے نقل ہو چکا ہے کہ انبیائے کرام کا یقین، ایمان، تعلق باللہ اور توکل علی اللہ اس قدر پختہ اور اس قدر لازوال ہوتا ہے کہ انسانی شعور، اور علم و دانش کو اس تک رسائی ممکن ہی نہیں ہوتی، بلکہ مقرب فرشتے بھی وہاں مجسمہ حیرت بن جاتے ہیں امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”لما قید نمرو د رجلیه و یدیه و رماه فی النار جاء جبریل علیه السلام و قال له هل لک

من حاجة فقال اما الیک فلا، فقال سله، فقال حسبی من سوالی علمه بحالی، بل ریما ازید علی الخلیل فی هذا الباب، و ذالک لانه قید رجلاہ و یداہ لاغیر و اما انا فقیدت رجلی فلا اسیر و یدی فلا احر کهما و عینی فلا انظر بهما و اذنی فلا اسمع، و لسانی فلا اتکلم و کان الخلیل مشرفا علی نار نمرود" (گبیر۔ج۔ا۔ص ۶۵۴)

ترجمہ: جب نمرود نے حضرت خلیل علیہ السلام کے ہاتھ، پاؤں باندھ کر انہیں آگ میں پھینکا تو جبرئیل علیہ السلام آپ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ میرے متعلق کوئی حاجت ہو تو بتائیے، تو جواب دیا کہ آپ علیہ السلام تک میری کوئی حاجت نہیں، جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اپنے بچاؤ کی درخواست کریں فرمایا، اللہ تعالیٰ میرے لئے، میری درخواست اور میرے حال کیلئے کافی ہے، بلکہ حضرت خلیل علیہ السلام نے اس سے زیادہ معنی خیز کلام فرمایا۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں کو اسی اللہ تعالیٰ نے باندھا ہے کسی اور نے نہیں، اب میں نے اپنے دونوں پاؤں کو چلنے سے باندھ دیا ہے، اب پاؤں سے نہیں چلوں گا، ہاتھ بندھ گئے ہیں ان کو حرکت تک نہ دونگا، آنکھوں کو بند کر دیا ہے ان سے اب نہیں دیکھونگا، میں نے اپنے کان بند کر دیئے ہیں، ان سے اب نہیں سنوں گا اور زبان بندی ہوگئی ہے، اب میں اس زبان سے بات بھی نہیں کرونگا، اور یہ وہ موقعہ تھا۔ جبکہ خلیل علیہ السلام آگ پر جھکائے گئے تھے، یہ ایمان ابراہیم علیہ السلام کا اظہار تھا، جو کسی دوسرے فرد کیلئے ممکن نہیں۔

حدیث ابوطلحہ رضی اللہ عنہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت جنگ میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیج کر اعانت فرمائی،، سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی مدد کے بغیر بھی مسلمانوں کو آپکی دعا کے توسل سے فتح اور کامیابی عطا فرما سکتا تھا، لیکن فرشتے بھیجے جنہوں نے باقاعدہ قتال و جدال کیا اور کفار کو میدان جنگ سے بھگایا؟ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جس قسم کا موقعہ

ہو اور جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو اللہ تعالیٰ اسی قسم کی اعانت اور مدد فرماتا ہے، چونکہ فتح اور شکست کا سبب لڑائی اور افرادی قوت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے افرادی قوت سے اعانت فرمائی، یہ اعانت تحت الاسباب ہے، ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ اپنے تحفظ اور بچاؤ کیلئے اللہ سے دست سوال دراز نہ کیا تھا اسلئے "**یا نار کونی برداً و سلاما علی ابراھیم**" کی صورت میں ملنے والی امداد اور اعانت مافوق الاسباب تھی، حدیث ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہوا کہ موقعہ کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ سے اعانت فرمانے کی درخواست کرنی چاہیے، جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے **جیش العسرۃ** کے موقعہ پر سامان جنگ جمع کرانے اور پورا کرنے کیلئے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اعانت کا حکم فرمایا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ معہ ساز و سامان دینے کا اعلان فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اعانت کا حکم دیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو سو اونٹ پھر جب تیسری مرتبہ اعلان فرمایا تو عرض کیا جہاد فی سبیل اللہ کیلئے تین سو اونٹ معہ ساز و سامان دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر تشریف فرما ہو کر اعلان فرمایا کہ اس کے بعد اگر عثمان رضی اللہ عنہ کوئی خطا بھی کر بیٹھے تو یہ نیکیاں اسکو کفایت کریں گی جہاد کی تیاری میں تین سو اونٹ معہ ساز و سامان دینا۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار اور اعانت پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا لبیک کہنا یہ اعانت تحت الاسباب ہے اللہ اسباب کے ذریعے مدد فرماتا اور خود اعانت کے اسباب مہیا کرتا ہے اسی **جیش العسرۃ** میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار بھی مالی امداد کے طور پر پیش کئے تھے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بئر رومہ کے علاوہ تمام کنوؤں کا پانی کھارہ اور کڑوا تھا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

"**من یشتری بئر رومہ**" کہ مسلمان اس سے ٹھنڈا میٹھا پانی پئیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وہ کنواں خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا، یہ مدینہ کے مسلمانوں کیلئے اعانت تھی۔ جس کو بجا لانے کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "**من یشتری بئر رومہ**" کے ذریعے اعلان اور حکم فرمایا تھا، عبداللہ

بن عتیک رضی اللہ عنہ کی پنڈلی آپ کے ہاتھ پھرنے سے درست ہوسکتی ہے۔غزوہ خندق کے موقعہ پر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں لعاب دہن ڈالنے سے ایک ہزار کا لشکر شکم سیر ہوسکتا ہے۔اور کھانا ذرہ بھر کم نہیں ہوتا حدیبیہ کے موقعہ پر اگر انگلیوں سے پانی کے فوارے پھوٹ سکتے ہیں ۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دُکھتی آنکھیں لعاب دہن لگانے سے درست اور بینا ہوسکتی ہیں تو مدینہ کے کھاری پانی آپکے ہاتھوں کی برکات، معجزات، اور لعاب دہن سے شیریں اور میٹھے نہیں ہوسکتے تھے۔مگر آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ''تعاونو اعلی البر و التقوی'' پر عمل کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہی نہیں، بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو اسکی تفسیر سمجھائی۔

کنواں خریدنے پر آپنے یہ بھی اعلان فرمایا کہ اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسکو اس کا صلہ جنت میں بہتر عطا فرمائے گا، مسجد نبوی میں جب توسیع کا معاملہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے پھر اعلان فرمایا! ''من یشتری بقعہ ال فلان'' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وہ ٹکڑا خریدا اور مسجد کی توسیع میں مالی معاونت فرمائی، ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر کی پوری پونجی اور کل کائنات کا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آدھا مال واسباب کا بارگاہ رسالت میں پیش کرنا اسی اعانت اور استعانت کی شاہ سرخیاں ہیں جو قیامت تک چمکتی اور دمکتی رہیں گی + جنگ بدر کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے عجزہ وانکساری کی کیفیت میں کبھی سجدہ ریز ہوکر دست دعا دراز فرما کر اللہ تعالیٰ سے استعانت کی اور پرچم اسلام کی سربلندی کیلئے فرزندان اسلام کی ثابت قدمی ،ہمت اور دلیری کیلئے دعائیں کیں اللہ تعالیٰ نے التجاؤں، دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا اور فرشتوں کی فوج اتاری، جو شکل انسانی اور لباس انسانی میں برسر پیکار رہوئے، سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممد کم بالف من الملائکة مردفین"

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو، جب تم اللہ سے فریاد کر رہے تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمھاری دعا

قبول کی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے تمھاری مدد کرونگا، جو یکے بعد دیگرے آنے والے ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار، پھر پانچ ہزار فرشتوں کو مسلمانوں کی امداد کیلئے اتارا جن کے عمامے زرد، سیاہ اور سفید رنگ کے تھے، بخاری اور مسلم کی حدیث کے مطابق جنگ احد میں جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام سفید کپڑوں میں آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ دائیں اور بائیں قتال کرنے لگے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے گریہ وزاری کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور مادی وسائل اور ذرائع کے ذریعے مدد فرمائی، اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو چشم زدن میں کفار و مشرکین کو نیست و نابود کر دیتا یا ان ہی مٹھی بھر فرزندان اسلام سے کفار و مشرکین کے چھکے چھڑا دیتا مگر فرشتوں کو انسانوں کی صورت میں بھیج کر مجاہدین کی مدد کر کے یہ واضح کر دیا کہ دنیا عالم اسباب ہے، یہاں اسباب کے ذریعے دی جانی اور ملنے والی مدد درحقیقت اللہ ہی کی مدد ہے۔ کیونکہ سلسلہ اسباب و ذرائع اسی کا پیدا کردہ ہے، اور اسی ذات باری تعالیٰ سے ہی فیض اور قوت یافتہ ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لان ذالک الغیر لا یمکنہ اعانتی الا اذا اعنتہ علی تلک الاعانۃ" (اکبیر، ج ۱، ص ۲۵)

ترجمہ: دوسرا کوئی بھی ہو اس وقت تک مدد نہیں کر سکتا جب تک اللہ کی مدد اس کے شامل حال نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل مبارک سے ثابت ہوا کہ دنیاوی معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے تابع اسباب اعانت کی درخواست کی ہے، اور باقی معاملات، جو تابع اسباب نہیں بلکہ براہ راست اللہ کی مرضی اور اس کی قدرت کے تابع ہیں ان کیلئے بدوں ذریعہ اور بدوں سبب اللہ تعالیٰ سے امداد کی درخواست کی ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ دعا کرنا کہ اے اللہ! میرے دل، میرے دائیں، میرے بائیں، میرے اوپر، میرے نیچے، میرے آگے، میرے پیچھے، میری زبان، میرے گوشت، میرے خون کو نور علی نور کر دے۔ (بخاری، مسلم) بارش کیلئے دعا فرمانا، اُمت کی بخشش کیلئے دعا کرنا وغیرہ ان کے علاوہ وہ بھی بے شمار اُمور ہیں

،جن میں آپ ﷺ نے براہ راست بغیر کسی سبب کے اللہ تعالیٰ سے مدد کی التجاء کی ہے ،مختصر یہ کہ دنیا عالم اسباب ہے جس کی ہر چیز ایک ذریعہ، ایک سبب اور ایک وسیلہ سے وابستہ ہے، سب لوگ اللہ ہی سے مانگتے ہیں اور وہی اپنی مدد پہنچانے کیلئے اسباب پیدا کرتا ہے اور اسباب کا تخلیق کرنا اور ان کو رو بعمل لانا اللہ کی مدد ہے اور یہی مفہوم ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' کا ہے ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' کا یہ معنی کرنے والوں کہ بس اللہ ہی سے ، مانگو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگو، اس کے علاوہ کسی سے مدد نہ مانگو، کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے، ان سے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا وہ معاملات لے کر تھانہ، کچہری، عدالتوں میں نہیں جاتے ان جگھوں پر بیٹھنے اور داد رسی کرنے والے غیر اللہ نہیں، اگر ہیں اور یقینا ہیں تو یہ شرک نہیں؟ ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' کے منافی نہیں؟ اگر ہے تو پھر ان جگھوں کے چکر لگانے اور ان میں موجود مخلوق سے مدد طلب کرنے کا مقصد؟ کیا یہ ساری تگ و دو مشرکانہ نہیں ؟ اگر ہے تو پھر اس پر عمل داری کیوں؟ اگر نہیں اور یقینا نہیں تو ماننا پڑیگا کہ ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' کا معنی اور مفہوم جو یار لوگ کرتے ہیں وہ نہیں، اللہ کے علاوہ مخلوق سے مدد مانگنا شرک کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: ''انماو لیکم اللہ و رسو له و الذین امنو الایة'' (مائدہ، آیت ۵۵) ترجمہ: بیشک تمہارے معاون اور مددگار اللہ تعالیٰ ،اس کا رسول ﷺ اور مومنین ہیں، امام رازی نے فرمایا:

''ان المراد عامة المو منین فو الذین امنو ا'' سے مراد عام مومنین ہیں، پھر فرمایا: ''فنزلت هذه الاٰية فی حق کل المو منین''

ترجمہ: پھر آیہء کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مومنین کو اؤلیاء بنانے پر راضی ہیں۔ (کبیر جز، ۱۲ ص ۲۵)

پھر فرمایا: ''لم لا یجوز ان یکون المراد من لفظ الو لی فی هذا الاية النا صر و المحب

’’(کبیر، ج، ۱۲ ص ۲۷)

ترجمہ: یعنی آیہء کریمہ میں ولی سے مراد، الناصر، اور المحب ہے۔یعنی تمہارے مددگار اور تم سے محبت کرنے والے اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسول ﷺ اور تمام مومنین ہیں۔ پھر فرمایا :

’’لاشک انہ خطاب مع الامۃ‘‘(کبیر جز ۱۲ ص ۲۹)

یہ خطاب ساری اُمت کو ہے،، خلاصہ یہ ہے کہ آئیہ میں و الذین امنو ا سے مراد ساری امت ہے جو قیامت تک ایک دوسرے کی معاون اور مددگار ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوق سے مدد مانگنا شرک ہوتا اور ’’ایاک نعبدو ایاک نستعین ‘‘ کی نقیض ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حرف حصر کے ساتھ یہ کیوں ارشاد فرمایا کہ رسول ﷺ اور مومنین تمہارے معاون اور مددگار ہیں؟ تم ان سے مدد مانگو اور ان سے دوستی کرو، ثابت ہوا مومنین سے تحت الاسباب مدد مانگنا شرک نہیں، منشائے خداوندی ہے، انبیائے کرام کی اعانت کا مقصد مخلوق کے ظاہر اور باطن میں تصرف کرنا ہے، ان کی ارواح کو نور توحید اور نور رسالت سے جلاء اور ضیاء بخشنا ہے ،امام رازی نے فرمایا: ’’ثالثھا الانبیاء وھم الذین اعطاھم اللہ تعالیٰ من العلوم و المعارف ما

لاجلہ بھا یقدرون علی التصرف فی بواطن الخلق و اروا احھم و اعطاھم من القدرۃ و المکنۃ مالاجلہ یقدرون علی التصرف فی ظواھر الخلق‘‘

(کبیر۔ج۔۱۳، ص ۶۸، ۶۷)

ترجمہ: تیسرے ان میں انبیاء ہیں، یہ وہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علوم اور معارف اس قدر دئیے ہیں جن سے وہ مخلوق کی اندرونی حالت اور ان کی ارواح پر تصرف کرتے ہیں، اور ان کو اس قدر، قدرت اور طاقت دی ہے جس سے مخلوق کے ظاہر پر تصرف کرتے ہیں،‘‘

گویا انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے علوم اور معارف عطا فرمائے ہیں جن کی بدولت وہ مخلوق کی

باطنی اور روحانی مدد فرماتے ہیں، اور ایسی قوت اور قدرت دی ہے کہ وہ مخلوق کی ظاہری مدد فرماتے ہیں "فاذا اصاب احدکم حرجة بارض فلاة فلیناد، اعینوا عباد اللہ یرحمکم اللہ" (کبیر، ج ۲، ص ۱۶۳)

ترجمہ: جب تم میں سے کسی آدمی کو بیابان جنگل میں مشکل پیش آئے جہاں کوئی آدمی کوئی بستی نہ ہو تو وہاں وہ پکارے اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا، معلوم ہوا بے بسی، بے کسی، مجبوری، معذوری کے وقت مخلوق خدا کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا شرک نہیں، شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"و اما الاستمداد باهل القبور فی غیر البنی ﷺ او الانبیاء علیهم السلام فقد انکره، کثیر من الفقهآء و اثبته المشائخ الصوفیة قدس اللہ اسرارهم و بعض الفقهاء رحمهم اللہ تعالیٰ و ذالک امر مقدر عند اهل الکشف و الکمال منهم و لا شک فی ذالک عندهم حتی ان کثیرا منهم حصل لهم الغیوض من الارواح و تسمی هذه الطائفة اویسیة فی اصطلاحهم، قال الامام الشافعی قبر موسی الکاظم تریاق مجرب لاجابة الدعاء قال حجة الاسلام محمد الغزالی من یستمد فی حیاته یستمد بعد مماته" (حاشیہ مشکوۃ ۱۵۴)

ترجمہ: نبی ﷺ اور دیگر انبیاء کے علاوہ اہل قبور سے مدد طلب کرنے میں اختلاف ہے۔ اکثر فقہاء نے انکار کیا ہے، اور مشائخ صوفیاء نے اثبات کیا ہے قدس اسرار ھم اور بعض فقہاء نے بھی اثبات کا قول کیا ہے، اہل کشف اور روحانی کمال رکھنے والے افراد کے نزدیک ایک ثابت شدہ امر ہے ان کے نزدیک اہل قبور سے استمداد کرنا شک سے بالاتر ہے کیونکہ بہت سے اہل کشف اور کمال باطن رکھنے والے لوگوں کو ارواح سے فیض ہوا ہے۔ اور یہ لوگ مشائخ اویسیہ کے نام سے مشہور ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ امام موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کا

مزار اجابت دعا کیلئے مجرب تریاق ہے۔ امام حجتہ الاسلام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ زندگی میں جس شخص سے استمداد ہوسکتی ہے بعد از وفات بھی اس سے مدد مانگی جاسکتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ اوّلیاء، صلحاء اور انبیاء کرام سے مدد مانگنا جائز بلکہ ایک امر حقیقی اور ثابت شدہ امر ہے، اور اہل کشف اور باطنی کمال کے حامل افراد نے اوّلیاء، صلحاء اور انبیاء کی ارواح سے روحانی فیض حاصل کیا ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ''**ولذا قیل اذا تحیرتم فی الامور فاستعینو باھل القبور**'' (مرقات، ج،۴ص ۱۱۴)

جب معاملات کے حل میں حیران اور پریشان ہوتو اہل قبور سے مدد مانگو،، مندرجہ بالا عبارات سے ثابت ہوا کہ مشکل اور پریشانی کے وقت مومنین اوّلیاء اور صلحاء کو پکارنا اور ان سے مدد مانگنا جائز، امر مشروع ہے شرک نہیں۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ٦٦ پر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب وعقیدہ

کے نام سے ایک عنوان قائم کیا اور پھر ایک شخص کا واقعہ لکھا جو قبروں پر ان سے کلام کرتا اور کہتا کہ تمہیں علم ہے کہ میں کئی ماہ سے تمھارے پاس آرہا ہوں، امام صاحب نے فرمایا کیا انہوں نے تجھے کوئی جواب دیا ہے؟ اس نے کہا نہیں، پس حضرت امام صاحب نے فرمایا تیرے لئے تباہی ہے اور تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ کس طرح تو بات کررہا ہے ایسے احباب کے ساتھ جو جواب کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ کسی چیز کے مالک ہیں۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ اگر واقعی یہ قول امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا ہے تو اس پر تبصرہ کرنے سے قبل اہل قبور کی سماعت، اور قوت جواب، اور زائر کی شناخت پر ایک حدیث نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، حافظ ابن کثیر الدمشقی نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل کی ہے اور

یہ بھی فرمایا ہے کہ "والصحیح عند العلمآء روایة عبداللہ بن عمر لمالھا من الشواھد علی صحتھا من وجوہ کثیرة"

ترجمہ: علمائے محدثین کے نزدیک اہل قبور کی سماعت، جواب سلام، اور زائر کی شناخت میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ یہ حدیث سب روایات سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ بے شمار وجوہات اور دلائل کی بنیاد پر یہ صحیح ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔

"مامن احد یمر بقبر اخیہ المسلم کان یعرفہ فی الدنیا فیسلم علیہ الا رد اللہ علیہ روحہ حتی یرد علیہ السلام"

ترجمہ: جو شخص بھی اپنے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے جسکو وہ دنیا میں جانتا تھا، پھر اسکو سلام دے مگر اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اس مسلمان میت کے جسم میں لوٹا دیتا ہے، یہاں تک وہ اسکو سلام کا جواب دیتا ہے" (ابن کثیر جلد ۳ ص ۴۳۸)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: "وثبت عنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لامتہ اذا سلموا علی اھل القبور ان یسلموا علیھم سلام من یخاطبونہ فیقول المسلم السلام علیکم دار قوم مومنین، وھذا خطاب لمن یسمع ویعقل ولولا ھذا الخطاب لکانوا بمنزلة خطاب المعدوم والجمار" (ابن کثیر، جلد ۳ ص ۴۳۸)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُمت کیلئے یہ طریقہ ثابت ہے کہ جب وہ اہل قبور کو سلام کہیں تو اسطرح سلام دیں جسطرح وہ مخاطب شخص کو سلام دیتے ہیں، سلام کہتے وقت مسلمان کہے اے دار آخرت یعنی برزخ میں رہنے والے مومنین کی قوم تم پر سلامتی نازل ہو، یہ خطاب ایسے شخص کیلئے ہے جو سنتا اور جانتا بوجھتا ہے، اگر اسطرح کا خطاب نہ ہوتا تو پھر ان کو معدوم اور پتھروں جیسے مخاطب کیا جاتا، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو اہل قبور سے مخاطب ہونے کا جو طریقہ اور الفاظ ارشاد فرمائے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل قبور سلام سنتے اور سلام دینے

والے کو جانتے پہچانتے ہی نہیں بلکہ سلام کا جواب بھی دیتے ہیں، حافظ مرحوم مردوں کے برزخ میں زندہ موجود ہونے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ کا قول بھی نقل فرماتے ہیں: "**قال تعرض اعمال الاحیاء علی الموتیٰ فاذا راءو احسنا فرحوا و ستبشروا و ان راءوا اسوء قالوا اللھم راجع بہ**" (ابن کثیر جلد۳ ص ۴۳۹)

ترجمہ: زندوں کے اعمال مردوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، جب وہ اعمال صالحہ دیکھتے ہیں، خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں، اور جب برے اعمال دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں، یا اللہ یہ اسی کو واپس کر، یعنی اس کے منہ پر مار، حافظ مرحوم رحمہ اللہ قول فیصل کے طور پر فرماتے ہیں: "**فھذا السلام و الخطاب و النداء الموجو دیسمع و یخاطب و یعقل و یر دو ان لم یسمع المسلم الردو اللہ اعلم**" (ابن کثیر، ج، ۳ص ۴۳۹)

ترجمہ: السلام علیکم کے الفاظ، کم ضمیر سے مردوں کو مخاطب کرنا، یا اھل القبور سے نداء کرنا ثابت کرتا ہے کہ قبر میں مدفون شخص موجود ہے، جو سلام کو سنتا، اور جواب دیتا ہے، وہ جانتا پہچانتا ہے، اور سلام کا جواب بھی دیتا ہے اگرچہ سلام دینے والا، مردے کا جواب سننے کی طاقت نہیں رکھتا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے ثابت ہوا کہ مردے قبر میں موجود، سلام کہنے والے کا سلام سنتے، سلام کا جواب دیتے، سلام کہنے والے کو پہچانتے اور شناخت کرتے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں اپنے حجرہ جس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محو استراحت ہیں جب داخل ہوتی تو ایک آدھ کپڑا اوڑھے ہوتی۔ اور یہ سوچتی کہ حجرہ میں ایک میرے شوہر نامدار اور دوسرے میرے والد ہیں۔ لیکن جب عمر دفن ہوئے تو "**ما دخلتہ الا و انا مشدو دۃ علی ثیابی حیاء من عمر رواہ احمد**" (مشکوٰۃ ص ۱۵۴)

ترجمہ : میں باپردہ ہونے کے بغیر کبھی داخل نہیں ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حیاء کی وجہ سے

ثابت ہوا کہ حضرت عائشہ صدیقہ کا عقیدہ تھا کہ آپ ﷺ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیاوی زندگی کی طرح روضہ انور کے اندر بھی دیکھتے، سنتے اور سلام پیش کرنے والے کو

جانتے پہچانتے ہیں، چنانچہ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے حیاء من ابن عمر رضی اللہ عنہ کے تحت فرمایا: ''اوضح دلیل علی حیوٰۃ المیت، وعلی انہ ینبغی احترام المیت عند زیارتہ مہما امکن، لاسیما الصالحون بان یکون فی غایۃ الحیاء والتارب بظاہرہ وباطنہ فان للصالحین مددا ظاہرا ابالغ الزوارہم''

(اشعۃ اللمعات حاشیہ مشکوٰۃ ص ۵۴)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان حیاء ابن عمر رضی اللہ عنہ کا میت کے قبر میں زندہ ہونیکی بڑی واضح دلیل ہے (۲) یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ جب اہل قبور کی زیارت کیلئے جاؤ تو جہاں تک ممکن ہو سکے ظاہری اور باطنی لحاظ سے ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھا جائے، خاص کر جب صالحین کے مزارات پر جاؤ،، کیونکہ صالحین زیارت کیلئے آنے والے لوگوں کی ظاہری اور باطنی ہر دو لحاظ سے بھرپور امداد فرماتے ہیں، ملا علی قاری نے فرمایا: ''وقد ورد ان الموتیٰ یعلمون احوال الاحیاء وما نزل بھم من شدۃ ورخاء وورد انھم یفیتحزون بالزیارات ویأ لمون بانقطاعھا'' (مرقات، ج، ۴ ص ۷ ۹)

ترجمہ: کہ حدیث میں آیا ہے کہ مردے زندہ لوگوں کے حالات کا علم رکھتے ہیں۔ اور جو بھی سختی یا سہولت نازل ہوتی ہے مردوں کو اس کا علم ہوتا ہے یہ بھی حدیث میں آیا ہے، مردوں کے پاس جانے پر وہ فخر کرتے ہیں، اور نہ جانے سے رنجیدہ ہوتے ہیں ملا علی قاری نے نقل فرمایا

: ''وقد اخرج ابن ابی شیبۃ عن ابن مسعود قال اذی المومن فی موتہ کاذاہ فی حیاتہ' (مرقات۔ جلد۔ ۴۔ ۷۹)

ترجمہ: ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تخریج کی ہے کہ مومن کو بعداز وفات اذیت دینا ایسا ہی ہے جیسا اسکی زندگی میں اذیت پہنچانا، مندرجہ بالا احادیث اوران کی تشریحات سے ثابت ہوتا ہے، کہ مردے قبر میں زندہ ہوتے ہیں، آنے والے کو جانتے پہچانتے اوراس کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔

مؤلف نے کتاب الغرائب سے جوواقعہ نقل کیا ہے اوراس کو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ قرار دیا ہے۔اسکی صحت محل نظر ہے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب اور عقیدہ وہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک ہے، اگر امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ مذہب ہوتا تو ملاعلی قاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی مردہ کی حیات اوراس کی شناخت، اوررد سلام کو احادیث سے کیوں ثابت کرتے؟

یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ حضرات حنفی ہونے کے باوجود امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کریں۔ملاعلی قاری نے نقل فرمایا کہ عراقی خاتون کا اکلوتا بیٹا فوت ہو گیا تھا وہ ہر وقت اس کے غم میں نڈھال رہتی،

بالخصوص عید کے موقعہ پر وہ بہت گریہ اور واویلہ کرتی ایک دفعہ کسی کام کی غرض سے اسکو دوسرے شہر جانا پڑا، وہیں اسکو عید کا تہوار آ گیا، وہ اس شہر کے قبرستان میں چلی گئی وہاں گریہ اور واویلا شروع کر دیا، بڑھیا بے ہوش ہوگئی، بے ہوشگی کے دوران، اس قبرستان میں مدفون مسلمانوں کی ارواح کا اجتماع ہوا۔اور یہ طے پایا کہ اس کا بیٹا یہاں مدفون نہیں، اس نے بلاوجہ نوحہ، اور واویلا کر کے ہمیں اذیت دی ہے، عالم بے ہوشگی میں ارواح نے اسکو مارپیٹ کی ، بڑھیا درد اور گھبراہٹ کی وجہ سے بیدار ہوئی۔

"فلما استیقفت وجدت الم ذالک الضرب" (مرقات، ج،۴ ص ۹۷)

ترجمہ: جب وہ بڑھیا بیدار ہوئی تو اس نے ضربات مارنے کی تکلیف اپنے بدن میں موجود

پائی، ملا علی قاری نے اس واقعہ کے نقل کرنے سے پہلے فرمایا، وقدرونیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے، اور مشہور ہے، ورنہ ملا علی قاری ہرگز نقل نہ فرماتے،،

ان شواہد کے بعد کتاب الغرائب میں منقول حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ واقعہ اور قول دلیل طلب اور محتاج ثبوت ہے پھر احادیث وآثار کے مقابلہ اور موازنہ کی صورت میں مرجوح ہے، بالفرض اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو مؤلف کے عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہے،، کیونکہ اسکے آخری الفاظ یہ ہیں، ایسے اجسام کے ساتھ جو جواب کی طاقت نہیں رکھتے، معلوم ہوا امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ میت کیلئے قبر میں جسم کو نی جو دنیا میں تھا۔ اسکی بقاء اور موجودگی کے قائل ہیں، جب دنیاوی جسم موجود اور باقی ہے، حدیث کے مطابق زندگی بھی موجود ہے۔ زائر کو جانتا، پہچانتا، اور سلام کا جواب بھی دیتا ہے، تو یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کا جواب نہ دنیا چہ معنی دارد؟ مزید حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ زندہ لوگ جسطرح کا سلام سننے، اور جواب دینے کے عادی ہیں۔ مردے اس طرح، اس نوع، اور اس کیفیت پر مبنی سلام کا جواب دینے کی طاقت اور اہلیت نہیں رکھتے، جیسا کہ علامہ السید محمود آلوسی نے فرمایا:

،، وما اخرجه العقیلی من انهم ویسمعون السلام ولا یستطیعون رده محمول علی نفی استطاعة الرد علی الوجه المعهود الذی یسمعه الاحیاء‘‘

ترجمہ: امام عقیلی نے جو یہ روایت کیا کہ مردے سلام سنتے ہیں۔ اور اس کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے، اس کا مقصد یہ ہے کہ زندہ لوگوں کے نزدیک جو جواب مقرر ہے، اس قسم کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا: **،، وقیل رد السلام وعدمه مما یختلف باختلاف الاشخاص فرب شحض یقدره اللہ تعالیٰ علی الرد ولا یثاب علیه لانقطاع العمل وشخص آخر لا یقدره عزوجل،،**

ترجمہ: سلام کا جواب دینا یا نہ دینا یہ مردوں کے اختلاف پر موقوف ہے، کیونکہ بہت سے

لوگوں کو اللہ تعالیٰ جواب دینے کی طاقت عطا فرماتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو یہ طاقت نہیں دیجاتی، جو سلام کا جواب دے سکیں، اس کا ثواب اسکو نہیں ملتا کیونکہ اس کا عمل منقطع ہو چکا ہے ،یعنی نامہ اعمال دفتر اعمال میں جمع ہو چکا ہے علامہ محاکمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

: ''وعندی اذا التعلق ایضا ممایتفاوت قوۃ و ضعفا بحسب الاشخاص بل و بحسب الازمان ایضا (روح المعانی۔جلد ۱۱ ج، ۲ ص ۵۸)

ترجمہ : میرے نزدیک جہاں تک جواب سلام کا تعلق ہے،قوت اور ضعف کے اعتبار سے اس میں بھی فرق ہے، کیونکہ بعض اشخاص کو جواب دینے کی بھر پور قوت حاصل ہے، بعض کو کمزور درجہ کی طاقت حاصل ہے، وہ بھر پور قوت سے جواب نہیں دے سکتے،، اور سننے والا سن نہیں سکتا،، بلکہ اس میں اوقات کا دخل بھی موجود ہے، بعض اوقات جواب دیتے ہیں اور بعض اوقات جواب نہیں دیتے ،صاحب روح المعانی کی اس توضیح سے ثابت ہوا کہ شائد وہ اس وقت ان سے گفتگو کرتا ہو، جس وقت وہ جواب دینے کی حاجت یا کیفیت میں نہ ہوں، یا ان کا جواب ہی کمزور درجے کا ہو، یا اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دینے کی قدرت ہی نہ دی ہو،لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ کوئی بھی میت خواہ بزرگ ہو یا عام آدمی جواب دے ہی نہیں سکتی ،مردہ جواب دینے کی طاقت ہی نہیں رکھتا ،مؤلف کا علی الاطلاق ہر مردے کے عدم جواب پر حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا قول بطور فتویٰ پیش کرنا غلط ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ٦٧ پر تحریر کیا ہی کہ ہر مسلمان نماز کی ہر رکعت میں یہ اقرار کرتا ہے، کہ ''**ایاک نعبد و ایاک نستعین**'' خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، اور یہی تعلیم تمام انبیائے کرام سے ملتی ہے۔ کہ پکارنے کے لائق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ہر مشکل میں اسے ہی پکارا جائے اللہ کو چھوڑ کر دوسری کو مافوق الاسباب مدد کیلئے پکارنا شرک اور بڑی گمراہی ہے۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ بے شک ہر مسلمان نماز کی ہر رکعت میں "**ایاک نعبدو ایاک نسعتین**" پڑھ کر یہ اقرار کرتا ہے ہم ہر مشکل میں ہر قسم کی مدد اے اللہ تجھ ہی سے مانگتے ہیں۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۶۵ پر مسئلہ استعانت و پکار کا عنوان قائم کیا،

استعانت اور پکار کی تعریف اور تقسیم کے بغیر ہی یہ لکھ دیا کہ ہر مشکل میں اسے ہی پکارا جائے، اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو مافوق الاسباب مدد کیلئے پکارنا شرک اور بڑی گمراہی ہے۔

جواباً کہا جاتا ہے کہ یہ غلط ہے، خود رب ذوالجلال نے فرمایا: "یاایھا الذین امنوا کونوا انصار اللّٰہ (الصّف،۲۸۔۱۴)

اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے مددگار ہو جاؤ،، جو ذات پاک، ہر جگہ ہر وقت، ہر مصیبت میں مددگار ہے، وہ مدد کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے؟ جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین، اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی مدد، اللہ تعالیٰ کی مدد کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے صرف مدد کرنے اور مددگار بننے کا حکم دیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ صرف ماتحت الاسباب مددگار بنو، اور مافوق الاسباب مددگار نہ بننا۔ مطلق مدد کرنے کا حکم دے کر یہ واضح کیا کہ جس قسم کی مدد درکار ہو، دین کی تبلیغ واشاعت، سر بلندی وسرفرازی کیلئے مدد بہم پہنچانا تم پر فرض ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو یہ طاقت ، اور یہ مقام ومرتبہ عطا فرمایا ہے، جس کے تحت وہ مافوق الاسباب مدد کرنے پر قادر ہے، تو شرک نہیں بلکہ

"**کونوا انصار اللّٰہ**" کی ایک جھلک ہے، ملا علی قاری نے مرقات شرح مشکوٰۃ میں یہ واقعہ نقل فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے، کہ دوران خطبہ فرمایا، **یا ساریۃ الجبل**، حاضرین، سامعین حیران رہ گئے عمر رضی اللہ عنہ نے کیا کیا ہے؟ اور کس کو ندا دی ہے ، صحابہ کے پوچھنے پر فرمایا نہاوند کے مقام پر لشکر اسلام ساریہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دشمنان اسلام

سے برسر پیکار رہے اور دشمن پہاڑ کے پیچھے مورچہ زن ہے اور مجاہدین اسلام پر بھرپور حملہ کیلئے پر تول رہا ہے میری نگاہ پڑی میں نے ساریہ کو آگاہ کیا ہے، حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ نے امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کی یہ نداسنی اور دشمن پر حملہ کیا اور فتح سے ہمکنار ہوئے، یہ دین کی نصرت تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے نہاوند کے مقام پر پہنچائی، یہ نداء بھی مافوق الاسباب تھی اور یہ مدد بھی مافوق الاسباب تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس امداد کے پہنچانے پر قادر تھے، اگر یہ شرک اور گمراہی کے زمرہ میں آتی تو اللہ تعالیٰ نہاوند تک کا علاقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ دکھاتا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں اس نوع کی مدد کرنے کا القاء بھی نہ فرماتا، اگر مافوق الاسباب کے تحت دینی امور میں مدد کرنا شرک اور گمراہی ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنی دور سے **یا ساریہ الجبل** کہہ کر کیوں پکارتے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس ندائے نصرت کو تمام لشکریوں نے سنا حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ نے اس سے استفادہ کیا اور فتح سے ہمکنار ہوئے، قرآن حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش اور اسکی تکمیل کیلئے استعمال ہونے والے کلمات کا تذکرہ فرماتے ہوئے بیان کیا:

"قال یاایھا الملاء ایکم یأیتنی بعرشھا قبل ان یأتونی مسلمین" (النمل:۳۸)

ترجمہ: فرمایا اے حاضرین دربار، بلقیس کا تخت، مسلمان ہو کر، ان کے میرے پاس آنے سے قبل کون لائے گا، یہ کلمات درحقیقت اس خواہش کی تکمیل میں بطور مدد کہے گئے، طاقتور جن، نے مجلس کے برخاست ہونے سے قبل لانے کا اعلان کیا اور علم کتاب، کے حامل آصف بن برخیاء نے آنکھ جھپکنے سے پہلے لانے کا اعلان کیا، ہر دو اعلانات کا تقابل اور موازنہ کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مجلس کے اختتام پذیر ہونے سے پہلے لانے اور تحت کے موجود ہونے کے متمنی تھے، اس لئے آصف بن برخیا نے چشم زدن میں لانے کا اعلان کیا اور سلیمان علیہ السلام کو ان کی قوت اور روحانی طاقت کا علم تھا، تخت ملک سباء میں شاہی محل کے خفیہ خانہ جس کے اردگرد کئی کمرہ جات تھے، میں سجا اور بچھا ہوا تھا۔ بڑا ضخیم، اور وزنی ہونے کے

ساتھ ساتھ مقفل کمرہ میں تھا، اتنی دور اور اتنے خانہ ہائے پردہ سے منگوانا تحت الاسباب نہ تھا۔ بلکہ مافوق الاسباب تھا، آصف بن برخیا نے مافوق الاسباب عمل کے ذریعے وہ تخت بدوں غیر حاضری لا کر پیش کیا، اس واقعہ سے مؤلف کا عندیہ کہ مافوق الاسباب مدد مانگنا، شرک اور گمراہی ہے،، باطل قرار پایا مدد طلب کرنا مافوق الاسباب ہو یا تحت الاسباب، مدد کرنے والا اس وقت تک مدد کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا، جب تک اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مدد اس کے شامل حال نہ ہو، امام رازی کے قول سے یہ مفہوم پہلے نقل ہو چکا ہے، موقعہ کی مناسبت سے دلیل کے طور امام رازی رحمہ اللہ کا یہ فرمان بھی ملاحظہ ہو: ''**اذا اصاب احد کم حرجۃ بارض فلاۃ قلیناد، اعینو اعباد اللہ یرحمکم اللہ**'' (کبیر، ج، ۲ ص ۱۶۳)

جب تمہیں کسی غیر آباد جگہ میں کوئی مشکل پیش آئے تو وہاں پکار کر کہو اے اللہ کے بندو، ہماری مدد کرو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے یعنی غیر آباد، بیابان جنگل، جہاں دنیاوی ظاہری اسباب اعانت موجود نہ ہوں وہاں اللہ کو پکارنا چاہیے یا اسکی مخلوق کو؟ امام رازی نے تو فرمایا ہے کہ وہاں عباد اللہ کو پکارو، اور ان کو مدد کرنے کا کہو۔

امام رازی نے ''**قلینادا عینو اعباد اللہ یرحمکم اللہ**' یہ حدیث نقل فرمائی ہے،

حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے عباد اللہ سے کون سے اللہ کے بندے مراد ہیں

، پوری حدیث پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عباد اللہ سے مراد فرشتے ہیں جو جنگلوں ، پہاڑوں ،صحراؤں، اور بیابانوں میں درختوں کے پتوں کی حفاظت پر مامور ہیں، لیکن یہ فرشتے انسان کی جنس سے ہیں نہ ان کا دیکھنا ممکن ہے تا کہ مدد مانگی جائے ، ایسی صورت حال میں یہ استعانت مافوق الاسباب ہے، اگر مان لیا جائے کہ فرشتے وہاں موجود ہیں اور اسباب بن رہے ہیں تو کہا جائیگا کہ موجود تو ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ سبب کی تعریف ہی ہے جو تحت الحواس ہو، پھر فرشتہ حکم خداوندی کے تابع ہے وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے، انسان کے تابع

نہیں، جب نظر بھی نہ آئیں، تابع فرمان بھی نہ ہوں تو پھر ان کا مدد کرنا ماتحت الاسباب کیسے ہوگا؟ اور یہ مدد عادی اور فطری کیسے ہوگی؟ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا:

''وان ستضر و کم فی الدین فعلیکم النصر'' (انفال، ۷۲)

ترجمہ: اگر دین کی تبلیغ اور اشاعت میں تم سے مدد طلب کریں، تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے،، اس سے قبل ارشاد ہوا کہ ''ھو الذی ایدک بنصرہ بالمومنین'' اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک وہی ہے جس نے اپنی خاص مدد سے آپ کی مدد کی، اور پھر مومنین کی مدد سے بھی آپ کو امداد دی۔ (انفال۔ ۶۲)

مزید فرمایا: ''یا ایھا النبی حسبک اللہ و من اتبعک من المومنین'' (انفال، ۶۵)

ترجمہ : اے نبی ﷺ اللہ تعالیٰ اور جو لوگ اسلام لائے اور پیروکار بنے اعانت و استعانت کیلئے آپ ﷺ کو کافی ہیں، جب اللہ مددگار اور کافی ہے، تو مخلوق کی مدد کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اعانت و استعانت کے مقام پر آپ ﷺ کیلئے بے مثال معاون اور مددگار ثابت ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ثابت ہونگے،،

ان مذکورہ بالا آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے سے مدد مانگنے؛ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے اور ''ایاک نعبدو ایاک نستعین،، میں تعلیم دی گئی کہ مجھ سے ہی مانگو کسی اور سے مدد نہ مانگنا، ان آیات میں فرمایا گیا کہ ایک دوسرے سے مدد مانگو، اور ایک دوسرے کی بھرپور مدد کرو، اور رسول ﷺ مخاطب کر کے فرمایا۔ مدد اور استعانت کیلئے آپ ﷺ کو اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کافی ہیں، یہ تعارض ہے۔

اس تعارض کے دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ''ایاک نعبدو ایاک نستعین'' کہتے وقت اللہ رب العزت سے یہ التجاء کی جائے کہ اے اللہ! معبود حقیقی تیری ہی ذات وحدہ لاشریک ہے، اور حقیقی معاون تیری ہی ذات وحدہ لاشریک ہے، اور حقیقی مددگار تو ہے باقی ہر قسم کی مدد

اور امداد تیری عطاء تیری قدرت اور تیری مرضی پر موقوف ہے، وہی مدد کرے گا جس کو مدد کرنے کے قابل تو بنائے گا، عالم ظاہر اور عالم غیب سے میری مدد کا سامان مہیا فرما،، ہر قسم کی مدد مافوق الاسباب ہو یا ماتحت الاسباب یہ اللہ تعالیٰ کی ہی ہے کیونکہ وہی اسباب کا مالک اور خالق ہے اور یہی مفہوم اور تعبیر ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' کی ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۶۸ پر سورۃ النحل کی یہ آیہ کریمہ نقل کی:

''والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا و ہم یخلقون اموات غیر احیاء و ما یشعرون ایان یبعثون'' اور جن کو وہ خدا کے بغیر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے: وہ خود مخلوق ہیں، مردے اور فانی ہیں زندہ جاوید نہیں اور ان کو پتہ نہیں کہ کب ان کو قیامت میں اٹھایا جائے گا، پھر فائدہ کے تحت لکھا کہ اس آیت سے پتہ چلا کہ مافوق الاسباب اسے پکارنا چاہیے جو نہ مخلوق ہو اور نہ اس پر موت طاری ہوسکے۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ مؤلف نے آیہء کریمہ کا غلط معنی بیان کیا، اور اس سے غلط فائدہ اٹھایا۔

(۱) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت فرمایا: **''ثم اخبر ان الاصنام التی یدعونہا من دون اللہ لا یحلقون شیأو ہم یخلقون''** (ابن کثیر جلد ۶ ص ۵۶۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ بے شک یہ بت اللہ کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتے، بلکہ یہ خود مخلوق ہیں، کیونکہ یہ پتھر اللہ کی مخلوق ہیں۔

۲) امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''و مع ذالک فتعلمون انہ یقبح عبادتہ فہذہ جمادات محضۃ و لیس لہا فہم و لا قدرۃ فکیف تقدمون علی عبادتہا'' (کبیر، ج، ۲ ص ۱۲)

ترجمہ: اس کے باوجود تمہیں معلوم ہے کہ غیر خدا کی عبادت کرنا برا ہے اور یہ بت صرف پتھر ہیں، انہیں فہم اور قدرت نہیں تو تم کس طرح ان کی عبادت پر آمادہ ہوتے ہو۔

علامہ سید محمود آلوسی نے فرمایا:

(۳) والالٰهة الذين تعبدونهم ایها الکفار پھر فرمایا۔ الاول هو اللہ تعالیٰ و الثانی الاضام (روح المعانی، جلد ۸ ج، ا ص ۱۱۹)

ترجمہ: اے کفار جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور انہیں معبود مانتے ہو وہ پتھر ہیں ان کا خالق اللہ ہے "**وھم یخلقون**" سے مراد اصنام یعنی بت ہیں، یتنوں تفاسیر سے معلوم ہوا کہ یہ آیہء کریمہ کفار اور بتوں کی مذمت میں نازل ہوئی اور کفار کے علم ودانش کو جھنجوڑا گیا ہے کہ تمھں علم ہے کہ ان میں فہم وقدرت نام کی کوئی چیز نہیں یہ تراشیدہ پتھر ہیں ان کا خالق اللہ وحدہ لاشریک ہے اسکو چھوڑ کر ان کی عبادت کس طرح اور ان کو معبود کیوں مانتے ہو؟

تینوں تفاسیر سے واضح ہوا کہ یدعون کا معنی پکارنا نہیں بلکہ عبادت کرنا ہے مؤلف نے کفار کی مذمت میں، نازل آیہء کریمہ کو مسلمانوں پر، اور بتوں کی مذمت میں نازل اس آیہء کو انبیاء واؤلیاء، صلحاء پر چسپاں کیا، یہ بددیانتی کی معراج ہے یا جہالت کی انتہاء بہر حال اس آئت کا مسلمانوں کی نداء اور انبیاء واؤلیاء اور صلحاء کی ذوات سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ اختصار کے ساتھ ہم نے تین مستند تفاسیر سے ثابت کیا ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۶۸ پر عنوان قائم کیا حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کو پکارا: جب حضرت آدمؑ اور حضرت حوا علیہا السلام نے شجر ممنوع کا پھل کھایا تو آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں التجاء کی کہنے لگے:

"ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم و تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین"

ترجمہ: اے ہمارے پالنے والے ہم نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور ہمیں نظر عطوفت سے نہ دیکھا تو یقینا ہم خسارے میں جا پڑیں گے، فائدے کے تحت تحریر کیا کہ: جب آدمؑ نے بوقت غم رب کو پکارا تو اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ بوقت

مصیبت اپنے باپ کی طرح صرف اور صرف اپنے رب کو پکارے۔

توضیحاً کہا جائے گا کہ "امنا و صدقنا، و عملنا بھا" لیکن کیا مؤلف اور ان کے ہم نواؤں کا یہی عقیدہ اور یہی عمل ہے؟ آئیے دیکھتے ہیں ملک پاکستان اور آزاد کشمیر میں جب بھی تنظیم اہل حدیث پر کوئی اُفتاد پڑی ہے انہوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ عوام اہل حدیث غیر مقلدین نے گورنمنٹ، انتظامی اداروں کے چکر نہیں لگائے، ان کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے؟ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مگر اختصار ملحوظ خاطر ہے،

ایک واقعہ ہدیہء ناظرین ہے

تنظیم اہل حدیث غیر مقلدین نے کھوئی رٹہ کے مقام پر جامع مسجد کی صورت میں اشاعت و تبلیغ کا ایک مرکز قائم کیا، عوام علاقہ نے اس کا تار پول بکھیر دیا، مسلمانوں کو کافر مشرک کہنے والی صداؤں کو ہمیشہ کیلئے چپ کرادیا، تنظیم مردگی کی حالت میں آہ وفغاں کرتی ہوئی، تھانہ اور عدالت پہنچ گئی۔ مقدمہ دائر کردیا گیا، **ایاک نعبدو ایاک نستعین**' کا حکم بھول گئی، دینی مرکز کا اکھڑ جانا، طاقت وعقیدے کے بل بوتے آواز تنظیم کو خاموش کرانا مصیبت نہیں، بڑی پریشانی نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ اگر ہے تو اولاد آدم علیہ السلام نے اپنے باپ کی مخالفت کیوں کی؟ سانحہ کھوئیرٹہ، اور واقعہ آدم علیہ السلام کے درمیان گہری مناسبت بھی موجود ہے، آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو ان کی آماجگاہ جنت سے نکالا گیا اور تنظیم اہلحدیث غیر مقلدین کو ان کی آرامگاہ کھوئیرٹہ سے بے دخل کیا گیا، آدمس نے "**ربنا ظلمنا انفسنا**" کہہ کر اپنے رب کو پکارا اور تنظیم نے پولیس اور عدالتوں کو پکارا حضرت آدمس اور حضرت حوا علیہا السلام نے شجر ممنوع کا پھل کھا کر حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی، لہٰذا اس کے ازالے، اور انعامہائے گرانمایہ حاصل کرنے کیلئے ان پر لازم تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتے چنانچہ انہوں نے اللہ کو

پکارا، اور درگرز کرنے کی التجاء کی اس میں تعلیم، ترغیب، یا تعجب کی کونسی بات ہے،
توضیحاً کہا جاتا ہے کہ زکریا علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر ہیں، کوئی انسان، کوئی فرشتہ اس تعلق تک نہیں پہنچ سکتا جو تعلق نبی اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، اُلوہیت کے بعد سب سے بڑا منصب اور مرتبہ نبوت اور رسالت ہے، جسطرح یہ منصب، عظمت شان اور رفعت مقام کا حامل ہے اسیطرح جو شخص اس سے متصف اور اس کا حامل ہے اس کا ایمان، عمل اور تعلق باللہ بھی غیر مثالی ہوتا ہے، اس لئے زکریا علیہ السلام نے نبی ہونے کے ناطے خدائے تعالیٰ کو پکارا، لیکن یہ پکار یہ نداء کہاں اور کس ماحول میں ہوئی؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ اس دعا کا پس منظر کیا ہے؟ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے خالو بھی تھے، نبی ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے کفیل بھی تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام جب حجرہ مریم علیہا السلام میں خبر گیری کیلئے جاتے تو وہاں بے موسم کے پھل دیکھتے، سردیوں کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل سردیوں میں، حضرت زکریا علیہ السلام نے ازراہ تعجب پوچھا؟ تمہارے پاس یہ پھل کہاں سے آئے؟ مریم علیہا السلام نے کہا اللہ کی طرف سے حضرت زکریا علیہ السلام بڑھاپے کی حالت میں تھے۔ اور ان کی بیوی بانجھ تھی، بغیر کسی کے لانے کے بے موسمی پھلوں کا موجود ہونا حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت تھی کیونکہ وہ ولیہ تھیں، ولیہ کے مقدس مقام اور کرامت کو دیکھ کر اولاد کی خواہش ہوئی مقدس مقام اور کرامت دعا کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ بنے اور یہ باور ہو گیا کہ جو اللہ بند کمرے میں مریم علیہا السلام کو بغیر کسی ذریعہ اور لانے والے کے بے موسم پھل دیتا ہے، وہ میرے بڑھاپے میں اور میری بیوی کے بانجھ ہونے پر بھی اولاد دینے کی قدرت رکھتا ہے،، زکریا علیہ السلام نے مقام عبادت جو حجرہ مریم علیہا السلام تھا اور ماحول ولایت اور کرامت ولیہ کے حسین امتزاج میں اولاد کیلئے اللہ کو پکارا ایسی صورت میں اللہ کو نہ پکارتے تو اور کس کو پکارتے۔ (ایوب علیہ السلام نے بھی مصیبت میں رب العالمین کو پکارا تھا، ص ۶۹)

پیغمبر اللہ تعالیٰ کی منتخب فرمودہ، اور فرستادہ وہ ہستی ہے جس سے اللہ بالواسطہ اور بلاواسطہ کلام فرماتا ہے، اس کا ایمان شہودی اور غیر متزلزل ہوتا ہے، انوار توحید سے اسکے افکار اور کردار اور اعتقاد منور ہوتے ہیں جہاں شیطان کا گزر تک نہیں ہوسکتا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان عبادی لیس لک علیہم سلطان"

اے شیطان میرے بندوں پر تیرا شیطانی داؤ پیچ نہیں چلے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام برضائے ربی سات سال اور کچھ مہینے مبتلائے مرض رہے (کبیر، جز،۲۲۔ص۲۰۶) مال، اولاد، جائیداد، اہل وعیال کی قربانی، دی، دل ودماغ اور زبان کے علاوہ جسم بھی قربان کیا، مگر ایک لحظہ کیلئے بھی خدا کی عبادت، ذکر سے غافل ہوئے نہ حرف شکایت زبان پر لائے، جب کھانا، پینا، ختم ہو گیا دوست احباب نے ساتھ چھوڑ دیا، اہلیہ بھی چلی گئیں، غرضیکہ دنیاوی تمام رشتے ختم ہو گئے، ظاہری اسباب بھی جاتے رہے تو اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا:

"رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین،، امام رازی نے فرمایا: **"فلما نظر ایوب فی شانہ ولیس عندہ طعام ولا شراب، ولا صدیق، وقد ذھبت امراتہ خر ساجدا وقال رب انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین"** (کبیر ج، ۲۲، ص۲۰۷)

ترجمہ: جب حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری، اپنی حالت کو دیکھا کہ انکے پاس کھانے کو کچھ ہے نہ پینے کو، دوست احباب بھی ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اور زوجہ بھی جا چکی ہے، تو احساس بے نوائی اور کیفیت تنہائی میں سر بسجود ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کی: اے رب بے شک مجھے تکلیف پہنچ گئی ہے، اور تو ہی ارحم الرّاحمین ہے امام رازی کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ یہ دعا آپ علیہ السلام نے اسی وقت مانگی جب ظاہری اور دیناوی اسباب ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

جب تک کھانا پینا مہیا ہوتا رہا، دوست احباب خبر گیری کرتے رہے، زوجہ محترمہ اُمور خدمت

بجالاتی رہی اس وقت تک آپ علیہ السلام نے دعا نہیں مانگی، تنہائی اور بے بسی کی حالت میں دعا مانگی جو قبول ہوئی، ثابت ہوا انبیائے کرام بھی اسباب ظاہریہ پر بھروسہ کرتے رہے، اور انکو استعمال

میں لاتے رہے ہیں، گویا آپنے یہ دعا ایک محضوص وقت اور محضوص حالت اور مخصوص کیفیت میں مانگی ہے، یہ دعا وقت، ماحول کے اعتبار سے مطلق نہیں بلکہ مقید ہے، جیسا کہ امام رازی نے فرمایا ہے، مؤلف کا بدوں قید اطلاق کرنا اور چسپاں کرنا غلط ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۶۹، پر مسئلہ مختار کل کے تحت لکھا کہ:

اہل سنت و جماعت مختار کل قادر مطلق اور چیزوں کو حلال کرنے والے، اور حرام کرنے والے صرف اللہ کو مانتے ہیں۔

توضیحاً کہا جاتا ہے کہ مؤلف نے اپنے آپ اور اپنے ہم نواؤں کو اہل سنت و جماعت کہا ہے، جو صریحا غلط ہے اور یہ اسلئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں یہ فرقہ اہل سنت و جماعت ہو ہی نہیں سکتا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائیگی "**کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ قالو من ھی یارسو لا اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ما انا علیہ و اصحابی**" (رواہ الترمذی، مشکوۃ ۳۰، باب الاعتصام بالکتاب و السنہ)

ترجمہ: ایک فرقے کے علاوہ باقی سب دوزخی ہونگے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ناجی فرقہ کون ہوگا؟ فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر گامزن ہوگا،،

مسند امام احمد رضی اللہ عنہ اور ابوداؤد رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ "**ثنتان و سبعون فی النار و واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ الحدیث**" (مشکوۃ ایضا

ترجمہ: بہتر فرقے جہنمی اور ایک جنتی ہوگا اور وہ اہل سنت و جماعت ہیں۔ اس پر ملا علی قاری

نے فرمایا: ''ای اھل الفقہ و العلم الذین اجمتعو اعلی اتباع آثارہ ﷺ'' (مرقاۃ)

کہ الجماعۃ سے مراد وہ علماء اور فقہاء ہیں جو نبی کریم ﷺ کے افعال، اقوال کی اتباع پر متفق اور مجتمع ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''اتبعو االسو اد الاعظم، فانہ من شذ شذ فی النار رو اہ ابن ماجہ من حدیث انس، مشکوۃ ایضاً''

ترجمہ: کہ سواد اعظیم کی پیروی کرو، کیونکہ جو ان سے الگ ہوا وہ جہنم میں ڈالا جائیگا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''ان اللہ لا یجمع امتی او قال امۃ محمد علی ضلالۃ و ید اللہ علی الجماعۃ و من شذ شذ فی النار رو اہ الترمذی، مشکوۃ ایضا)

ترجمہ: کہ بے شک اللہ تعالیٰ اُمت محمدیہ کا اجماع گمراہی پر نہیں ہونے دیتا، اور جماعت پر اللہ تعالیٰ کا دست رحمت اور دست نصرت ہے، جو ان سے جدا ہوا وہ جہنم میں گیا، ملا علی قاری نے فرمایا ''یعبر بہ الجماعۃ الکثیرۃ، و المراد ماعلیہ اکثر المسلمین'' (مرقاۃ)

سواد اعظم الجماعتہ الکثیرۃ کو کہا جاتا ہے، اور اس سے مراد وہ امر ہے جس پر اکثر مسلمانوں کا عمل ہو، پاکستان، ہندوستان، افغانستان، بلکہ پوری دنیائے اسلام کا سروئے کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اکثریت مسلمانوں کی اہل سنت و جماعت ہے، کیونکہ شرعی اور فقہی اعتبار سے پوری دنیا میں چار ہی مذہب پائے جاتے ہیں حنفی، مالکی، حنبلی، اور شافعی اور یہی اہل سنت و جماعت ہیں، دیگر فرقے، اقل قلیل ہیں، اور یہی مذاہب اربعہ ماانا علیہ و اصحابی کی تعبیر اور تفسیر ہیں، رسول ﷺ نے ان کو ہی سواد اعظم اور الجماعۃ فرمایا ہے، اور انکی مخالفت کرنے والے اور ان سے علیحدہ ہونے والے کو دوزخی فرمایا ہے، ان احادیث اور تشریحات احادیث کے پڑھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد مؤلف کا اپنے آپ ﷺ کو اہل سنت و جماعت کہنے

کہلوانے کا کیا جواز اور کیا حق ہے؟

”ما انا علیه و اصحابی اور فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین الحدیث رواه احمد و ابو داؤد، و الترمذی، و ابن ماجه، مشکوة ۳۰

لیکن محقق ابن الہمام صاحب فتح القدیر نے جو حدیث نقل کی ہے اس میں من بعدی کا اضافہ ہے،

ترجمہ:۔ ہر دو احادیث کو یکجا کرنے سے ثابت ہوا کہ جس طرح رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنا واجب ہے، اسیطرح خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا بھی واجب ہے، کیونکہ علیکم اسم فعل ہے اور اس کا معنی ہے الزموا،، یعنی لازم کرلو، واجب کرلو،، علیکم جس طرح بسنتی پر داخل ہے اسیطرح واؤ حرف عطف کی وساطت سے سنۃ الخلفاء الراشدین پر بھی داخل ہے، حدیث کا معنی یہ ہے کہ تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کا التزام، لازم اور واجب ہے، رسول ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کے طریقے کا اتباع واجب ہے، یعنی سنت رسول ﷺ اور سنت خلفائے راشدین کا اتباع واجب ہے، مؤلف کا تعلق اس فرقہ سے ہے ، جو آٹھ تراویح پر ایمان رکھتے ہیں۔

محقق ابن الہام نے فرمایے: ”روی انه ﷺ خرج لیلة من لیالی رمضان و صلی عشرین رکعة، فلما کانت اللیلة الثانیة اجتمع الناس، فخرج و صلی بهم عشرین رکعة، فلما کانت اللیلة الثالثة کثر الناس فلم یخرج علیه الصلوة و السلام،، (فتح القدر۔ جلد اول ص ۴۸۴)

ترجمہ: ایک روایت کے مطابق رمضان کی ایک شب رسول ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں، دوسری رات پھر تشریف لائے اور بیس رکعت تراویح پڑھیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی پڑھائیں، جب تیسری رات آئی صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد جمع ہو

گئی اور آپ مسجد میں تشریف نہ لائے، آپ ﷺ کے زمانے پاک سے لیکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ اقدس تک لوگ تنہا تنہا بیس رکعت تراویح پڑھتے رہے،، مؤطا امام مالک رضی اللہ عنہ میں یزید بن رومان کی یہ روایت موجود ہے:

''کان الناس یقومون فی زمن عمر بن الخطاب بثلاث و عشرین رکعۃ''

اور محدث بیہقی نے سائب بن یزید سے روایت کی کہ ''کنا نقوم فی زمن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بعشرین رکعۃ و الوتر،، (فتح القدیر، جلد اول ۴۸۵، موطا ۹۸ و حاشیہ)

مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ رسول ﷺ نے صرف دو مرتبہ نماز تراویح کا اہتمام فرمایا، ایک دفعہ تنہا بیس پڑھیں، اور دوسری مرتبہ بیس تراویح پڑھائیں، ہاں تراویح کو باجماعت پڑھنے پڑھانے کی ابتداء اور تسلسل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی اہل حرمین طیبین نے اعتراض کیا نہ انکار بلکہ دو بعد میں آنے والے خلفاء حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود، یا ان کے دور میں کسی بھی صحابی رضی اللہ عنہ، یا اہل حرمین نے انکار کیا نہ انگشت، اعتراض اٹھائی، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اعتراض و انکار کیا اور نہ ان کے دور میں کسی کونے سے اسکی مخالف میں آواز اٹھائی گئی، گویا بیس رکعت تراویح ایک طرف خلفائے ثلثہ، جو خلفائے راشدین مہدیین ہیں کی سنت قائمہ بن گئیں اور دوسری طرف اہل حرمین کے اجماع سے مؤکد ہوگئیں۔ اگر مان لیا جائے کہ رسول ﷺ نے آٹھ تراویح پڑھی ہیں، اسلئے مؤلف اور ان کے ہم نوا، آٹھ پڑھتے ہیں، چلو اس عمل سے علیکم بسنتی پر عمل ہو گیا، مگر حدیث کے بقیہ حصہ پر عمل نہ ہوا، خلفائے ثلثہ کی سنت جو بیس تراویح ہے وہ بھی چھوڑ دی اور اجماع امت کی مخالفت بھی کی، کیا یہ ''تومنون ببعض و تکفرون ببعض'' کی صورت نہیں، اور جو الجماعۃ، اور سواد اعظم سے قول و عمل میں کٹ جائے اس کیلئے فرامین رسول ﷺ پہلے گزر چکے ہیں، ان کا مستحق نہیں، فقط بسنتی پر عمل کرنے والا اور سنۃ الخلفاء الراشدین الحدیث کو چھوڑنے والا اہل سنت

وجماعت کیسے ہوسکتا ہے، اہل سنت وجماعت ہونے کیلئے رسول ﷺ نے فرمایا: ''**ماانا علیه واصحابی**''

-آٹھ رکعت پڑھنے سے ''**ماانا علیه**'' پرعمل تو ہو گیا لیکن ''**واصحابی**'' پرعمل نہ ہوا، جبکہ **اصحابی** کے عمل کو اپنانے سے **ماانا علیه** پرخود بخود عمل ہوجاتا ہے، کیا مذکورہ بالا حدیث **ماانا علیه** پر پوری ہوجاتی ہے؟ مفہوم حدیث اور مضمون **ماانا علیه** پر مکمل ہوجاتا ہے؟ کیا حدیث صرف **ماانا علیه** تک محدود ہے، اور بقیہ حصہ جزوحدیث نہیں؟ کیا **علیکم** صرف **بسنتی** پر داخل ہے؟ **وسنة الخلفاء الراشدین** ''اس کا لفظی اور معنوی مدخول نہیں؟ کیا ''**بنسبتی وسنة الخلفاء الراشدین**'' کے درمیان واؤ، عاطفہ نہیں، کیا یہ واؤ **بسنة الخلفاء** کو **بسنتی** کی طرح **علیکم** کے تابع حکم قرار نہیں دیتی؟ کیا یہ حدیث صحاح ستہ کی تین کتابوں میں موجود نہیں، جب ہے اور اسناد کے اعتبار سے بھی صحیح ہے تو اس پر عمل نہ کرنے میں کون سا امر مانع ہے، اہل حدیث کہلوانے والوں کو تو ہر صحیح حدیث پر عمل کرنا چاہیے، اگر حدیث کے ایک جز پر عمل کرنے، اور من پسند یا اسکے کسی حصے پر عمل کرنے کا نام اہل حدیث ہے تو پھر ایسے لوگوں کو مبارک ہو، لیکن انہیں اہل سنت وجماعت کہلوانے کا کوئی حق نہیں، کیا ایسی کوئی حدیث ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ خلفائے ثلثہ رضی اللہ عنہم نے بیس رکعت تراویح نہیں پڑھیں؟ کیا ایسا کوئی ثبوت ہے جس سے معلوم ہو کہ بیس رکعت تراویح کے سلسلہ میں اہل حرمین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی ہو؟ اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہو؟ یا بعد میں آنے والے خلفاء رضی اللہ عنہم نے ان کے حکم اور عمل پر خط تنسیخ کھینچا ہو، یا خلفائے ثلثہ رضی اللہ عنہم کے وصال کے بعد اہل حرمین نے بیس رکعت تراویح کی ادائیگی سے انحراف کیا ہو، بلکہ بیس رکعت تراویح سنت متواترہ ہے جو آج تک اسی طرح قائم ودائم ہے جسطرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد کے خلفاء رضی اللہ عنہم نے اسکو قائم فرمایا تھا۔

مزید۔ بالفرض تراویح آٹھ رکعات ہیں اور حضور ﷺ نے آٹھ ہی پڑھی ہیں، جبکہ ایسا نہیں، تو یہ سنت فعلی ہوئی، اور فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین الحدیث سنت قولی ہے، اصول حدیث کے مطابق سنت قولی کو سنت فعلی پر ترجیح حاصل ہے، پھر بھی اہل حدیث حضرات کیلئے بیس رکعت تراویح پڑھنا لازم ہے۔ اگر وہ اہل سنت وجماعت ہیں تو انہیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔

نوٹ: اہل سنت وجماعت کا جاہل سے جاہل شخص بھی اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق اشیاء کے حرام، حلال کرنے والا اللہ وحدہ لاشریک کو جانتا، مانتا اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے، نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام بتانے اور کرنے کا اختیار دے رکھا تھا، مسئلہ مختار کل میں اس پر ثبوت نقل ہو چکا ہے، اعادہ کرنا عبث اور ضیاع وقت ہے، آپ ﷺ کے علاوہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ، ولی، گدی نشین کو اختیار حاصل نہیں۔

مؤلف نے غلط الزام تراشی کی ہے، ص ۷۰ پر جو بے ہودہ کفریہ شعر تحریر کیا

ہے یہ بھی مؤلف کی اپنی اختراع ہے اہل سنت وجماعت ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص اور ایسا بے ہودہ کفریہ شعر کہنے والے کو کافر مطلق واجب القتل قرار دیتے ہیں، اور نقل کرنے والے مؤلف کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعائے ہدایت مانگتے ہیں، کیونکہ مؤلف نے بغیر ثبوت کے یہ کفریہ شعر اہل سنت وجماعت کے سر تھونپا ہے،، مؤلف نے کتابچہ کے ص ۷۰ پر تحریر کیا تمام خزانوں کا مالک ومتصرف صرف اور صرف اللہ ہے،، اور اسکی تائید اور توثیق میں یہ آیہ کریمہ بھی نقل کی: ‘‘۔ الم تعلم ان اللہ لہ ملک السموت والارض ومالکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر،،

ترجمہ: کیا تو نہیں جانتا بلاشبہ خدا تعالیٰ کیلئے ہے ملک اور اختیار آسمانوں اور زمینوں کا اور

تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں،

اقول: قرآن حکیم کے ہر حرف، بلکہ ہر زیر زبر پر ایمان ہے کہ وہ منزل من اللہ ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ زمین وآسمان کی ہر شی کا مالک حقیقی اللہ ہے کیونکہ وہی ہر شی کا خالق ہے، یہاں اس بات کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن حکیم تبیانا لکل شئی ہے، ہر حکم کی تفصیل، اور لفظ کا معنی اور مراد خود قرآن نے بیان فرمایا ہے قرآن نے فرمایا:

"ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا"

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے زمین میں سب کچھ تمھارے نفع اور فائدے کیلئے پیدا کیا ہے یعنی کائنات ارضی کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے فائدے اور منفعت کیلئے پیدا فرمائی ہے، فائدہ کیلئے حقوق ملکیت اور حق تصرف کا ہونا لازمی اور بنیادی شرط ہے، ان کے بغیر انتفاع ناممکن ہے، امام رازی نے لکم کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

"فھو یدل علی ان المذکور بعد قولہ خلق لاجل انتفاعھا فی الدین والدنیا، امافی الدنیا فلنصلح ابداننا، ولنتقوی بہ علی الطاعات وامافی الدین فللاستدلال بھذہ الاشیاء والاعتبار بھا وجمع بقولہ مافی الارض جمیعا، جمیع المنافع، فمنھا ما یتصل بالحیوان، والبنات، والمعارن، والجبال ومنھا مایتصل بضروب الحرف والامور التی استبنطھا العقلاء بین تعالی ان کل ذالک انما خلقھا کی ینتفع بھا"

(کبیر۔ج۔۲۔ص ۱۵۳)

ترجمہ: لکم، کا خلق کے بعد آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زمین کی ہر شی کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ تم دنیاوی اور دینی معاملات میں ان سے نفع حاصل کرو اور ان اشیاء سے توحید باری تعالی پر استدلال کرو اور ان پر اعتبار کرو، ان تمام فوائد اور منافع کو مافی الارض میں جمع فرمایا گیا ہے ان میں بعض منافع وہ ہیں جن کا تعلق، حیوانات، نباتات، معادن یعنی معدنیات اور پہاڑوں

سے ہے، اور بعض کا تعلق صنعت وحرفت سے ہے، اور ان امور سے ہے، جو ارباب عقول نے استنباط کئے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمام چیزیں اس لئے پیدا کی گئی ہیں تا کہ تم ان سے نفع حاصل کرو، ان مذکورہ بالا اشیاء سے نفع کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان ان اشیاء کا مالک نہ ہو اور ان میں تصرف کا حق نہ رکھتا ہو۔ دنیا میں موجود جتنی اشیاء ہیں جانور ہوں ،زمینیں ہوں یا باغات وسبزیات، معدنیات ہوں یا سونے اور چاندی والے پہاڑ یا پتھر ہر شخص کی خصوصی ملکیت اور اس کے تصرف میں ہیں، جن میں دوسرا کوئی شخص دعوٰی ملکیت کرسکتا ہے، نہ تصرف، پوری روئے زمین، قوموں، اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہے ہر قوم کی اپنی حکومت اپنی ملکیت اپنا مذہب اور اپنا سکہ رائج ہے ہر ملک اپنے خطہ کی حفاظت کیلئے فوج اور ہتھیار رکھتا ہے اندرون ملک مداخلت، اور سرحدی بدامنی پر جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اگر کوئی شخص دوسرے کی ملکیت میں بے جا مداخلت کرے، قبضہ کرے یا املاک میں چوری ڈکیتی کا ارتکاب کرے تو مقدمہ درج ہوتا ہے، تجاوز کرنے والے شخص کو مجرم قرار دیکر حد یا تعزیر کی سزا دیجاتی ہے، مالک شخص کی وفات کے بعد قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے، بحکم قرآن

”لہ مافی السمٰوات والارض، لِلّٰہ مافی السموت ومافی الارض“

جب ہر چیز کا مالک اور مختار اللہ ہی ہے تو یہ تقسیم، حد بندی، انفرادی ملکیت، جزا، سزا کا اجراء ہاتھ کاٹنا، درے لگانا رجم وغیرہ سزاؤں کا حکم اور اجراء کس چیز کی غمازی کرتا ہے؟ ماننا پڑیگا کہ کائنات ارضی کی ہر ہر شی کا مالک حقیقی اللہ وحدہ لاشریک ہے اسکی مرضی، اسکی عطاء اور اسکی تعلیم سے اسکی مخلوق مالک اور متصرف ہے، آیہ کریمہ جو مؤلف نے نقل کی ہے، اس میں ملک حقیقی کا ذکر ہے، اور خلق لکم مافی الارض جمیعا میں ملک عطائی اور ملک عارضی کا ذکر ہے اب کوئی منافاۃ رہی نہ تناقض،،

مؤلف نے فائدہ ص ۷۰ کے آخر میں لکھا کہ :

اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کارساز، اور مددگار نہیں۔

اقول: حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل، نعم المولیٰ و نعم النصیر پر پورا اور مکمل ایمان ہے ،لیکن اس شان اور اس قدرت کا مالک خود ارشاد فرماتا ہے، یا ایھا الذین امنو کونو انصار اللّٰہ، (الصّف۔ ۱۴) اے ایمان والو تم اللہ جو واحد کارساز اور واحد مددگار ہے، کے مددگار بنو، اللہ کا فرمان تمہارے لئے ایسا ہے، جس طرح

"قال عیسی بن مریم للحواریتین من انصاری الی اللّٰہ" (ایضا)

اللہ واحد کارساز اور واحد مددگار ہو کہ اپنے مومن بندوں سے کیوں مدد طلب کر رہا ہے؟ میرا تم سے مدد کا کہنا ایسے ہی ہے جسطرح عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے مدد کیلئے کہا تھا؟ بے شک اللہ واحد کارساز اور واحد مددگار ہے، لیکن اس کے باوجود خود فرماتا ہے۔

"وان ستنصروا کم فی الدین فعلیکم النصر" (انفال۔ ۷۲)

کہ اگر دین کی اشاعت و تبلیغ میں مدد مانگیں تم پر واجب ہے کہ تم ان کی مدد کرو، واحد کارساز ، واحد مددگار مسلمانوں کو مسلمانوں کی مدد کرنے کا حکم دے رہا ہے، حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے مددگار بننے کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی چنانچہ ان کو بھی نبی بنایا گیا، امام رازی نے فرمایا: والکلام فی حقیقۃ الملک و القدرۃ، آیہء کریمہ میں حقیقی ملک اور حقیقی قدرت کا بیان ہے (کبیر: ج، ۳، ص ۲۳۴)

ماننا پڑیگا کہ حقیقی کارساز، اور حقیقی مددگار اللہ وحدہ لاشریک ہے، اگر مخلوق، مخلوق کی مدد کریگی تو درحقیقت وہ بھی اللہ ہی کی مدد ہے، آیات بالا میں اللہ تعالیٰ نے خود مدد کا فرما کر یہ اعلان کیا ہے

کہ جن اشخاص کو میں نے مدد دینے کے قابل بنایا ہے، اگر تم ان سے مدد مانگو اور وہ تمہاری مدد کریں تو یہ شرک نہیں ایاک نعبدو ایاک نستیعن کے خلاف نہیں وہ میری ہی مدد ہے ، اور وہ مدد میری مرضی اور منشاء کے مطابق ہے،، امام رازی نے فرمایا: ''وذالک لان ذالک الغیر لا یمکنہ اعانتی الا اذا اعنتہ علی تلک الاعانۃ''

(کبیر، ج، ۲ ص ۲۵۴)

ترجمہ: دوسرے شخص کا مدد کرنا ایاک نستیعن کے خلاف نہیں کیونکہ وہ اس وقت تک مدد کی طاقت نہیں رکھتا، جب تک اللہ اسکو مدد کی ہمت اور طاقت عطا نہ کرے خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کی مدد اللہ کی مدد ہے، شرک نہیں۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۱۷ پر تحریر کیا کہ تصرفات کے اختیار میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں، اور اس پر آیہء کریمہ: ''قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشآء و تنزع الملک ممن تشآء و تعز من تشآء و تزل من تشآء بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر ،، نقل کی ہے۔

ترجمہ: کہہ دیجیے اے حبیب ﷺ اے اللہ تو مالک الملک ہے قادر و مختار ہے اور جسے چاہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے جسے چاہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کرتا ہے، اور تیرئے ہاتھ میں خیر ہے، بلا شبہ تو ہر چیز پر قادر اور مختار ہے۔

اقول: آیہء کریمہ میں ملک حقیقی، اور قدرت حقیقی کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے مختار حقیقی ہونے کا بیان ہے، آیہء کریمہ میں عزت و ذلت دینے کی تفصیل ہے یعنی تمام اُمور اللہ کے دست قدرت میں ہیں، مخلوق نہ کسی کو عزت دے سکتی ہے نہ ذلت، وہ اپنی زمین پر جس کو چاہے حکومت اور فرمانروائی عطا کرتا ہے اور جس کو چاہے تخت شاہی سے اُتار کر پابند سلاسل کر دیتا ہے

،اگر عزت وذلت مخلوق کے ہاتھ میں ہوتی، اور تخت شاہی کو سجانا مخلوق کے بس میں ہوتا تو طاقتور یہودونصاری اورزورآور ہنوودہریہ مسلمان ممالک پر قابض وحاکم ہوتے، اور کلمہ گو مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیتے، پوری دنیامیں یہودوانصاری ہندویت اوردہریت کو عددی اورمادی اعتبار سے عزت حاصل ہے، ہرجگہ مسلمان، زبوں حالی اور ذلت سے دوچار ہیں ،مسلمانوں کی معاش اورمعاشرت پر یہودوانصاری کا قبضہ ہے، اسلامی ممالک کی داخلی اور اقتصادی پالیسیاں یہودونصاری کے ایوانوں میں طے پاتی ہیں، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے،''العزۃ اللہ ولرسولہ وللمومنین،،

ترجمہ: عزت صرف اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور مومنین کیلئے ہے، قرآن نے یہودانصاری کے متعلق فرمایا:''غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین'' دوسری جگہ فرمایا:

''ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ''

معلوم ہوا کہ یہودونصاری ہوں یا ہنود ودہریہ، مغضوب اورضال ہیں، ذلت وخواری سے ہمکنار ہیں، لیکن رب رحمن، اوررب رحیم نے دنیاوی لحاظ سے ان کو بھی ایک گونہ عزت دے رکھی ہے، اورمسلمانوں کو دین، دنیااوراُخروی عزت دی گئی ہے، اگر کوئی طاقتور، صاحب منصب اور صاحب اختیار شخص کسی جمہوری، پارلیمانی، عوامی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قابض ہو جائے، اورجھوٹی عزت حاصل کرکے سیاہ وسفید کا مالک بن جائے، جسطرح بدقسمتی سے مُلک پاکستان میں ہوتا چلا آیا ہے، پوری پاکستانی قوم، بلکہ پوری دنیا اسکی مذمت کرتی آئی ہے، کیا یہ اختیار تصرف اللہ تعالیٰ کا ہے، یا اسکی مخلوق کا؟ اگر اللہ کا تھا تواس کے خلاف نصرت، واویلا، اور اسکی مذمت اور بالا عدالتوں سے اس کے خلاف رجوع کیوں کیا گیا؟ اگر یہ غلط اقدام مخلوق کے اختیاروتصرف کا کرشمہ ہے تو پھر''وتعزمن تشآءوتذل من تشآء'' کا مقصد؟ تسلیم کرنا پڑے گا کہ محولہ بالا آیہ کریمہ میں حقیقی بادشاہی اور حقیقی بادشاہ اور حقیقی تصرف کا ذکر ہے۔ وہ اللہ

تعالیٰ کو ہی حاصل ہے،،

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۱۳ پر تحریر کیا'' رسول ﷺ کا اعلان کہ میں نفع، نقصان کا مالک نہیں''، اس پر یہ آیت بھی نقل کی: ''قل انما ادعوا ربی و لا اشرک بہ احدا قل انی لا املک لکم ضرا و لا رشدا''

ترجمہ: کہہ دیجیے اے میرے محبوب ﷺ کہ میں تو صرف اپنے پالنے والے کو پکارتا ہوں ،اوراس کے ساتھ کسی کوشریک نہیں کرتا، اور یہ بھی کہہ دیجیے کہ میں تمھارے نفع ونقصان کا مالک ومختارنہیں ہوں،

اقول: ۔ہر مسلمان کا یہی ایمان اور یہی عقیدہ ہے،مگر مؤلف نے غلط نظریہ رکھتے ہوئے بطور دلیل اس عقیدہ پر کہ اہل سنت وجماعت پیران پیر عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کو نفع ونقصان کا مالک اور مختار سمجھتے ہیں، نقل کی ہے، آیہ کریمہ روح ایمان ہے مگر مؤلف کا نظریہ غلط خلاف حقائق الزام تراشی اور خود ساختہ ہے، جو قابل مذمت اور لائق تردید ہے،

اہل سنت وجماعت ہر قسم کے نفع ونقصان کا خالق ومالک اللہ وحدہ لاشریک کو مانتے ہیں۔اس کے سوا مخلوق کی جانب سے جو نفع ونقصان ہوتا ہے، وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، بندہ محض ایک ذریعہ اور سبب بنتا ہے، نبی کریم ﷺ ذاتی طور پر نہ نفع ونقصان کے مالک ہیں، نہ خالق، بلکہ ایک موثر اور دیرپا ذریعہ اور سبب ہیں، خواہ نفع ونقصان دنیاوی ہو یا اخروی، آپ ﷺ کی ذات نزول رحمت اور بخشش اور دفع عذاب کا ذریعہ ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین، وانک لتھدی الی صراط مستقیم، وجئنا بک علی ھؤلآء شھیدا'' انا ارسلناک شاھدا و مبشر و نذیرا و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجا منیر''

صراط مستقیم پر چلنا نفع ہے، گمراہی، نقصان ہے، حصول جنت نفع ہے، دخول جہنم نقصان ہے، آپ ﷺ کا کام نفع ونقصان کا بتانا، نفع کے ذرائع اور نقصان کے اسباب کا بیان کرنا آپ ﷺ کی شان نبوت اور آن رسالت ہے نفع ونقصان کا مالک ہونا آپ ﷺ کے منصب کا حصہ یا منصب کو لازم نہیں، آپ ﷺ کا کام صرف ان کی تبلیغ کرنا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، **ماعلیک الاالبلاغ، ماعلی الرسول ﷺ الا البلاغ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک** مؤلف جا بجا غلط نظریہ رکھ کر غلط عقیدہ کو اہلسنت وجماعت کی طرف منسوب کرتے آئے ہیں، خوف خدا نام کی کوئی چیز ان کے پاس سے نہیں گزری، ہم اہل سنت وجماعت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نفع ونقصان کا خالق اور حقیقی مالک نہیں سمجھتے،، بہتان لگانے والوں کو اللہ عقل ودانش عطا فرمائے''۔ مؤلف نے کتابچہ کے ص ۷۰ پر لکھا کہ تمام خزانوں کا مالک ومتصرف صرف اور صرف اللہ ہے، سورۃ النازعات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ **فالمدبرات امرا**، ترجمہ:۔ کام کی تدبیر کرنے والوں کی قسم''

امام رازی نے اس آیت کے تحت فرمایا: **فاجمعوا علی انھم الملائکۃ**'' ترجمہ:۔ تمام علمائے مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں، اور کون، سے فرشتے ؟

قال مقاتل، یعنی جبریل علیہ السلام ومیکائیل علیہ السلام، واسرافیل علیہ السلام، عزرائیل علیہ السلام یدبرون امر اللہ تعالیٰ فی اھل الارض، وھم المقسمات امرا، فاما جبریل علیہ السلام فوکل بالریاح والجنود، واما میکائیل علیہ السلام فوکل بالمطر والنباتات، واما ملک الموت فوکل بقیض الانفس واما اسرافیل علیہ السلام فھو ینزل بالامر علیھم، وقوم منھم موکلون بحفظ بنی آدم وقوم اخرون بکتابۃ اعمالھم، وقوم آخرون بالخسف والمسخ والریاح والسحاب والامطار''

(کبیر۔ جز۔ ۳۱۔ ص ۲۸)

ترجمہ:۔ حضرت مقاتل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فالمدبرات امرا سے مراد جبریل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، اسرافیل علیہ السلام، اور عزرائیل علیہ السلام ہیں، جو دنیا والوں میں احکامات خداوندی کی تدبیر کرتے ہیں، مقسمات امرا بھی یہی فرشتے ہیں، جبریل رضی اللہ عنہ ہواؤں اور لشکروں کے امور کی تشکیل پر مامور ہیں، میکائیل رضی اللہ عنہ بارشوں اور نباتات کے امور پر مامور ہیں، عزرائیل رضی اللہ عنہ انسانوں کی ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں، اور اسرافیل رضی اللہ عنہ ان ملائکہ پر احکامات جاری کرتے ہیں، انہی میں سے فرشتوں کی ایک جماعت ایسی ہے جو بنی نوع انسان کی حفاظت پر مامور ہے، اور ایک جماعت ایسی ہے، جو انسانوں کے اعمال درج کرنے پر مامور ہے اور ایک جماعت ایسی ہے جو زمین کی توڑ پھوڑ یعنی زلزے، صورت دنیا کی تبدیلی، ہواؤں کے چلانے، بادلوں کے لانے اور بارشیں فرسانے پر مامور ہے، مؤلف نے جو آئیت مذکورۃ الصدر عنوان کی تائید میں نقل کی ہے، اگر اس آئیت اور ان آیات کا تقابل اور موازنہ کیا جائے تو تعارض لازم آتا ہے لیکن کلام الٰہی کا معجزہ یہ ہے کہ اس میں تعارض اور تناقض نہیں، سورۃ بقرہ کی آئیت:

الم تعلم ان اللہ لہ ملک السمٰوٰت و الارض و مالکم من ولی و لا نصیر

(بقرہ۔۱۰۷) سے مؤلف نے جو عندیہ اور عقیدہ قائم کیا ہے وہ غلط ہے، کیونکہ مؤلف کے عنوان پر عمل کرنے سے سورۃ نازعات، سورۃ ذاریات کی آیات کا انکار لازم آتا ہے، ان سورتوں اور ان کی آیات میں خود اللہ تعالیٰ نے کائنات میں تصرف کرنے والے فرشتوں کی قسم کھائی ہے، اگر یہ فرشتے ہیں ہی نہیں، یا ہیں مگر تصرف نہیں کرتے، اسرافیل علیہ السلام تصرف کرنے کا حکم نہیں دیتے، یا حکم دینے کے مجاز ہیں نہ تصرف کرنے کے تو اللہ نے **والمدبرات امرا** کیوں فرمایا؟ اور پھر مخصوص الفاظ جو انکے تصرف کی واضح دلیل ہیں ذکر فرما کر اس حوالے سے ان کی قسم کیوں اٹھائی'' آیات قرآنیہ، حدیث مقاتل رضی اللہ عنہ اور امام رازی رضی اللہ عنہ کی تفسیر سے

ثابت ہوا کہ مؤلف نے سرخی جما کر جو اپنا عندیہ اور عقیدہ پیش کیا وہ غلط ہے۔ مؤلف نے غلط مفہوم پیش کرنے کے جنوں میں، تفسیر و حدیث تو درکنار آیات کے درمیان پیدا ہونے والے تعارض کو بھی نہیں دیکھا تعارض دور کرنا تو دور کی بات ہے"۔ جہاں تک خزانوں کے مالک ہونے کا تعلق ہے بے شک ان کا خالق اور مالک حقیقی اللہ وحدہ لاشریک ہے اور متصرف حقیقی بھی وہی ہے، لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ کسی کو مالک بناتا ہے نہ تصرف کا اختیار دیتا ہے، مؤلف نے اپنا عندیہ اور عقیدہ پیش کیا ہے، ورنہ حقائق اور دلائل اس کی تائید نہیں کرتے، حضور ﷺ نے فرمایا:

"بعثت بجوامع الکم، و نصرت بالرعب، و بینا انانائم رائیتنی ائوتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی"

(متفق علیہ مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ)

ترجمہ: مجھے جوامع الکم دیکر مبعوث فرمایا گیا ہے، رعب سے میری نصرت کی گئی ہے، میں اسی دوران سویا ہوا تھا، کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مجھے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں، اور میں نے اپنے ہاتھوں میں لی ہوئی ہیں۔'

ملا علی قاری رضی اللہ عنہ نے اسکے تحت نقل کیا کہ:۔

فی النہایۃ ارادما سھل اللہ لہ و لامۃ من افتتاح البلاد المتعددات و استخراج الکنوز المتنوعات:،

نہایہ میں ہے کہ آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو متعدد شہر فتح کرنے، اور ہر قسم کے خزانوں کو نکالنے کی سہولت عطا فرمائی ہے،

"او المراد منہ معادن الارض التی فیھا الذھب و الفض و سائر الفنزات"

(مرقاۃ۔جلد۔۱۱۔۵۰)

ترجمہ:۔ یا آپ ﷺ کے فرمان سے فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو روئے زمین کی تمام معدنیات، سونا، چاندی اور دیگر مائع وغیرہ دے دیئے ہیں، یعنی ان معدنیات کو خزانوں سے تعبیر فرمایا، ان کے ملک اور تصرف کو چابیاں لینے اور دینے سے تعبیر فرمایا:۔ اس وقت اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ سونا، چاندی اور دیگر قیمتی دھاتوں، بلکہ سیال سونا کے حامل ملک مسلمانوں کے زیر قبضہ اور زیر تصرف ہیں، سونا، چاندی اور تیل پیدا کرنے والے ممالک مسلمان اور عرب ہیں۔ تیل اس وقت پوری دنیا کی معشیت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، مائع گیس حیات انسانی کی آخری سانس ہے، روس سے آزاد ہونے والی ریاستیں اس گیس سے، مالامال ہیں، یہ گیس اتنی وسیع مقدار میں معلوم کی گئی ہے کہ پوری دنیا برسوں تک اس سے استفادہ کر سکتی ہے، دنیا کے چھ بڑے ممالک اس گیس سے استفادہ کرنے کیلئے ایک معاہدہ کے تحت کام کر رہے ہیں، بحمد اللہ پاکستان بھی ان انعامات سے بہرہ ور ہے، یہ تمام خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن ان میں تصرف اور ملکیت کا حق انہی ممالک کو ہے، جن میں یہ پائے جاتے ہیں، عراق اور کویت کی یہودی اور نصرانی جنگیں ملک اور تصرف کی تبدیلی کیلئے لڑی گئیں، عراق، کویت پر امریکہ، برطانیہ کا قبضہ ہے، تیل اور دیگر معدنیات پر بھی ان کا ہی قبضہ اور تصرف ہے، یہود و نصاریٰ کے اس جابرانہ، ظالمانہ، اور غاصبانہ قبضہ اور تصرف کو ملک خداوندی اور تصرف باری تعالیٰ کہنا جائز اور ممکن ہے؟ اس غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غاصبانہ قبضہ اور تصرف کے قیام اور بقاء کیلئے لاکھوں انسانوں کو بھونا گیا، لاکھوں خواتین کی عصمت اور عفت لوٹی گئی، لاکھوں بچوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ رچے، بسے شہروں کو بارود کا ڈھیر بنا دیا گیا اور بالآخر یہود و نصاریٰ ایک قدیم علمی، روحانی، ملک کے مالک اور متصرف ہو گے، یہ ملک الم تعلم لہ ملک السمٰوٰت

و الارض الآیہ کی تعبیر تشریح ہے یا نقیض؟ تعبیر اور تشریح تو ہو نہیں سکتی بلا شبہ یہ نقیض

ہے، نقیض ہے تو آئیہ مقدسہ میں لہ ملک السمٰوت و الارض کا معنی کیا ہے؟ ماننا پڑیگا کہ آئیہ مقدسہ میں حقیقی ملک اور حقیقی قدرت کا ذکر ہے، دنیا میں پائے جانے والے ملک اور قدرت کے نمونے اور واقعات اللہ تعالیٰ کی عطا اور رضاء اسکی مہربانی ہے، وہ چاہے تو اپنے دشمنوں کو بھی وسیع و عریض ملک اور طاقت عطا فرما دے''، بہرحال مؤلف نے جس عندیہ اور جس عقیدہ کو ثابت کرنے کیلئے آئیہ کریمہ کا سہارا لیا ہے، وہ ثابت نہیں ہوا۔

مؤلف نے کتاب کے ۱۷ پر لکھا کہ:۔ رسول ﷺ کا اعلان کہ میں نفع، نقصان کا مالک نہیں، اس سرخی اور عنوان کے تحت آئیہ کریمہ **قل انما ادعو اربی و لا اشرک بہ احدا قل انی لا املک کم ضرا و لا رشدا**:۔ بھی نقل کی

ترجمہ:۔ کہہ دیجیے اے میرے محبوب ﷺ کہ میں تو صرف اپنے پالنے والے کو پکارتا ہوں ،اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور یہ بھی کہہ دیجیے کہ میں تمہارے نفع، نقصان کا مالک ومختار نہیں ہوں، فائدہ کے تحت لکھا کہ جب سرور کائنات ﷺ کو کسی کے نفع ونقصان کا اختیار نہیں تو پیران پیر صاحب اور دوسروں کو کیونکہ ہوسکتا ہے؟

اقول:۔ اسی عنوان اسی مفہوم، اور اسی مضمون پر مبنی آیت سورہ اعراف آیت ۱۸۸۔ سورہ یونس آئیت نمبر ۶۹۔ میں بھی آئی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے، کہ آپ ﷺ کہہ دیں کہ میں اپنی ذات کیلئے بھی کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں الا ماشاء اللہ امام رازی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ای انا لا ادعی علم الغیب، ان انا نذیر و بشیر، و نظیرہ قولہ تعالیٰ فی سورۃ یونس ویقولون متی ھذا الوعد ان کنتم صادقین، قل لا املک لنفسی ضرا و لا نفعا الا ماشاء اللہ''

ترجمہ:۔ آئیہ کریمہ کا معنی یہ ہے کہ میں علم غیب کا دعوٰی نہیں کرتا، میں صرف نذیر اور بشیر

ہوں، اسکی مثال سورہ یونس میں بھی موجود ہے کہ کفار کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو قیامت آنے کا وعدہ کب پورا ہوگا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب آپ ﷺ کہہ دیں میں اپنی ذات کیلئے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں، **الا ماشائاللہ**،،

امام رازی رضی اللہ عنہ نے شان نزول کے ضمن میں فرمایا:۔ حضور ﷺ جب غزوہ نبی المصطلق سے واپس تشریف لائے تو راستہ میں ایک بدبودار ہوا چلی جسکی وجہ سے جانور، سواریاں بھی تتر بتر ہوگئیں، اور اسکی وجہ بتاتے ہوئے رسول ﷺ نے فرمایا:۔

رفاعہ منافق مدینہ میں فوت ہو گیا ہے یہ بدبودار ہوا اسکی موت پر چلی ہے اس پر منافقین کو غیظ وغضب نے آلیا، چونکہ سواری کے جانور بھاگ گئے تھے، حضو ﷺ نے فرمایا:۔ میری اونٹنی کہاں ہے؟ عبداللہ بن ابی منافق نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا تمہیں تعجب نہیں ہوا کہ محمد ﷺ رفاعہ کے مدینہ میں مرنے کی خبر دے رہے ہیں مگر ان کو اپنی اونٹنی کا پتہ نہیں؟ اس پر رسول ﷺ نے فرمایا:۔ منافق لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں میری اونٹنی اس گھاٹی میں ہے اور اسکی نکیل ایک درخت کے ساتھ اٹکی ہوئی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم گئے اور اونٹنی کو اسی جگہ اور اسی حالت میں پایا جس کا ذکر رسول ﷺ نے فرمایا تھا، اور پھر یہ آئیہ کریمہ **قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا الا ماشآء اللہ** نازل ہوئی (کبیر، جز،۱۵۔ ۸۳)

امام رازی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا، اعلم ان القوم لما طالبوہ بالاخبار عن الغیوب وطالبوہ باعطاء الاموال الکثیرہ، والدولۃ العظیمۃ ذکر ان قدرتہ قاصرۃ وعلمہ قلیل وبین ان کل من کان عبدا کان کذالک، والقدرۃ الکاملۃ والعلم المحیط لیسا الا للّٰہ تعالیٰ فالعبد کیف یحصل لہ ھذہ القدرۃ وھذا العلم (کبیر، الضا)

ترجمہ:۔ اے مخاطب تجھے علم ہونا چاہیے کہ جب کفار نے آپ ﷺ سے علم غیب کی خبریں دینے، اموال کثیرہ اور بے شمار دولت کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، میری اتنی طاقت

،اور میرا علم اتنا نہیں، پھر واضح فرمایا کہ جو بھی بندہ ہے اس کا حال ایسا ہی ہے، قدرت کاملہ اور علم محیط اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں، یہ قدرت کاملہ اور علم محیط ایک بندئے کو کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ امام رازی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا :

"المراد لا املک لنفسی من الضرر و النفع الا قدر ماشآء اللہ ان یقدر نی علیه و یمکننی منه، و المقصود من ھٰذا الکلام بیان انه لا یقدر علی شیء الا اذا اقدر ہ اللہ علیه" (کبیر، جز، ۱۵ ـ ۸۴)

ترجمہ : آیہ میں مراد یہ ہے کہ میں اپنی ذات کیلئے نفع اور نقصان کا اتنا ہی مالک ہوں جتنی اللہ تعالیٰ نے مجھے قدرت دی ہوئی ہے، اور اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ میں نفع اور نقصان کا مالک اسی وقت ہوتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ مجھے طاقت اور قدرت عطا کرتا ہے''۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ہر سہ آیات کا مضمون، مفہوم، اور عنوان ایک ہی ہے، مؤلف کی نقل کردہ آیت کے پہلے حصہ میں اعلان عبادت ہے کہ بندہ ہوں، اور قدرت کاملہ اور علم محیط کا حامل نہیں ہوسکتا، میں علم غیب کا دعوٰی نہیں کرتا، کہ تمھیں غیب کی خبریں بتاؤں، میں تو صرف نذیر اور بشیر ہوں، میں اپنی اور تمہاری ذات کیلئے اتنے ہی نفع اور نقصان کا مالک ہوں جتنے نفع ونقصان کی اللہ تعالیٰ مجھے علم، قدرت اور طاقت دیتا ہے، اس میں قدرت کاملہ، علم محیط، اور حقیقی نفع ونقصان کا مالک ہونے کی نفی ہے ان امور کے عطائی ہونے کی نفی نہیں جیسا کہ مؤلف نے سمجھ رکھا ہے''، سیدّ محمد آلوسی رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا:۔ کہ :۔ **وقال المعنی لا اقدر علی شیٔ منالضر و النفع، الا ماشآء اللہ تعالیٰ ان اقدر علیه منهما، فانی اقدر علیه بمشیته سبحا نه'**

ترجمہ: اسلاف میں سے بعض نے یہ فرمایا ہے کہ :۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نفع ونقصان کا اسقدر ہی مالک ہوں جس قدر اللہ تعالیٰ نے مجھے طاقت اور قدرت دے رکھی ہے، مزید نقل

کیا کہ:۔ **من اللعبد قدرة موثرة باذن اللہ تعالیٰ لا انہ لیس لہ قدرة اصلا، کمایقولہ لجبریہ، ولا ان لہ ان شاء اللہ تعالیٰ وان لم یشآئ کما ھو رأی المعتزلۃ،**

(روح المعانی۔جلد٦۔جز۔٢۔ص١٣٠)

ترجمہ:۔بعض اسلاف نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے بندے کو ایک موثر قدرت حاصل ہے، ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو بالکل قدرت دی ہی نہیں، یہ جبریہ فرقہ کا مذہب ہے (یعنی ان کے نزدیک بندہ بے بس اور بے اختیار ہے، ایک چلتے پھرتے پتھر کی مانند ہے۔) اور ایسا بھی نہیں کہ قدرت تو حاصل ہے لیکن غیر موثر ہے، اور یہ اشاعرہ کے ہاں مشہور ہے، یعنی خود مختار نہیں) اور ایسا بھی نہیں کہ اللہ چاہے یا نہ چاہے اسکو قدرت موثرہ حاصل ہی نہیں یہ معتزلہ کا مذہب ہے" صاحب روح المعانی کی اس تفصیل کو ملاحظہ کرنے کے بعد صاف پتہ چلتا ہے کہ مؤلف نے فائدہ کے تحت جو کچھ تحریر کیا ہے، یہ معتزلہ یا جبریہ کا مذہب اور عقیدہ ہے اہل سنت و جماعت کا نہیں، تفکرّ وتدبیرّ"؛

امام رازی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، **الایمان نفع، والکفر ضرّ**:۔ایمان نفع ہے اور کفر نقصان ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصل الایمان اور روح ایمان ہیں، قرآن ارشاد فرماتا ہے:۔

من یطع الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقد اطاع اللہ، امام رازی رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛۔

ھو شطر الایمان بل ھی کالغبصن ھی معرفۃ ذات اللہ وعلمہ وقدرتہ، حکمتہ ثم اذا حصلت معرفۃ البنوة فحینئذ یستفاد منھا معرفۃ بقیۃ الصفات کا السمع والبصر والصفات الحیریۃ والوجدانیہ

ترجمہ:۔رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع جزوایمان ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اللہ تعالیٰ کی معرفت کیلئے ایک جڑ کی مانند ہے معرفت، ذات باری تعالیٰ اسکے علم، قدرت، اور اسکی حکمت کی معرفت سے پہلے ضروری ہے، جب نبوت کی معرفت حاصل ہوجائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی

بقیہ صفات ذاتیہ، سمع، بصرا، اور دیگر صفات جبریہ اور وجدانیہ کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے''، اگر رسول ﷺ کی ذات مقدسہ کسی نفع اور نقصان کی مالک نہیں تو وہ ذات ایمان کا جز کیسے بن گئی؟ جو ایمان نفع ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت نفع ہے، مگر یہ نفع معرفت نبوت ہونے پر موقوف ہے، معرفت خداوندی اور اسکی صفات ذاتیہ کا علم رکھنا واجب ہے، جب موقوف واجب ہے، تو لامحالہ موقوف علیہ بھی واجب ہوگا، کیونکہ موقوف علیہ سے موقوف تک رسائی، اور حصول ممکن ہے، نماز تک رسائی اور ادائیگی وضوء پر موقوف ہے، نماز عبادت، اور فرض ہے، لہذا وضو بھی عبادت ہے، اور اسکے ارکان کو فرض کا درجہ حاصل ہے، بالکل اسیطرح اللہ کی ذات وصفات کی معرفت ایمان ہے، مگر اس ایمان کی تکمیل نبی کریم ﷺ کی معرفت سے ہوتی ہے، ایمان نفع ہے، لیکن یہ نفع توحید ورسالت کی معرفت کا نام ہے، معلوم ہوا ذات رسول ﷺ خود نفع ہے، کیونکہ بقول امام رازی رضی اللہ عنہ معرفت رسول ﷺ ایمان کی جڑ اور اصل ہے، اگر اطاعت رسول ﷺ اطاعت خدا ہے تو ذات رسول ﷺ اصل نفع اور مالک نفع ونقصان کیوں نہیں؟ نفع کا مالک وہی ہوسکتا ہے جو نفع پہچانے کے قابل ہو، رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دینی، اخروی اور دیناوی نفع پہنچانے اور دینے کی طاقت دے رکھی ہے، قرآن ارشاد فرماتا ہے:۔ **ووجدک عائلا فاغنیٰ'' فاما السائل فلاتنھر''** آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا، دین، آخرت کی غناء تونگری اور بے پناہ دولت عطا فرمارکھی ہے سائل کو اپنے دروازئے سے خالی واپس نہ کرنا، صحابہ نے ٹوٹی ٹانگوں، دکھتی آنکھوں، سڑئے گلے جسموں، تیرہ وتاریک رنگوں کا علاج حضور ﷺ سے کروایا، دوران جنگ تلواریں ٹوٹیں تو آپ ﷺ سے لکڑیوں کی تلواریں لیں آپ ﷺ نے ان کو مس فرماکر لوہے میں ڈھال دیا، دوران جنگ جنت کا وعدہ لیا، شہید ہوئے تو فرشتے اٹھا کرلیگئے۔ بھوک اور پیاس سے مجبور ہوئے تو تھوڑئے کھانے، اور تھوڑئے پانی کو مسّ کیا تو سینکڑوں شکم سیر ہوئے، کیا یہ ذات پاک کسی

بھی نفع اور نقصان کی مالک نہیں ۔،۔حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو فرشتوں کے ہمراہ اڑنے، جنت اور دنیا میں سیر کرنے کا شرف کس سے ملا؟ جنت میں بسیرا کہاں سے نصیب ہوا؟ اسلام سے ،اور اسلام کس نے دیا، ذات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، یہ تمام چیزیں اسلام، ایمان اور شہادت سے ملیں مگر یہ سب کچھ کس نے دیا؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، جنہوں نے انہیں اسلام کے مدرسہ میں داخل فرمایا:۔اور قرآن وحکمت کی تعلیم دی جس کے نتیجے میں یہ منافع کثیرہ حاصل ہوئے'،، قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مالک ہونے کا ذکر فرمایا:۔**انا اعطیناک الکوثر**؛امام رازی نے فرمایا۔**ای خیر الکثیر فی الدنیا و الدین،**

ترجمہ:۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین اور دنیا میں خیر کثیر عطاء فرمایا'' پھر فرمایا:۔

ای لما اعطاک خالق السمٰوٰت و الارض خیرات الدنیا و الاٰخرۃ (کبیر۔جز۔۳۲۔۱۲۰)

ترجمہ:۔زمینوں اور آسمانوں کے مالک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا اور آخرت کی خیرات کثیرہ عطا فرمائی ہیں۔پھر فرمایا:۔**ان الاعطاء یوجب التملیک** (کبیر۔جز۔۳۲۔۱۲۳)۔

اعطاء تملیک کو واجب کرتا ہے،یعنی **انا اعطیناک الکوثر** کا معنی یہ ہے کہ دین و دنیا کی جتنی بھی خیرات کثیرہ ہیں ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا مالک بنایا ہے اور کب سے مالک بنایا ہے؟ امام رازی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

یدل علی ان ھذا الاعطاء کان حاملا فی الماضی (کبیر۔۳۲۔۱۲۲)

یعنی تملیک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمانہ ماضی میں ہی دی گئی ہے'' ماضی قریب یا ماضی بعید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔**انھا اشارۃ الی ان حکم اللہ بالاسعاد و الاشقائ و الاغناء و الافقار لیس امرا یحدث بل کان حاصلا فی الازل** (کبیر۔۳۲۔۱۲۲)

ترجمہ:۔**اعطیناک الکوثر** صیغہ ماضی کسے لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ،نیک بختی، بد بختی،غنا،اور فقر کا حکم اور فیصلہ اب اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا بلکہ یہ ازل کے فیصلہ جات ہیں، گویا

اللہ تعالیٰ نے روزازل سے ہی دینی دنیاوی خیرات کثیرہ کا فیصلہ آپ ﷺ کے حق میں کیا تھا، اورآپ ﷺ روزازل سے خیرات کیژہ کے مالک چلے آرہے ہیں، پھر فرمایا؛۔

ان من کان فی الزمان الماضی ابدا عزیز امر عی الجانب مقتضی الحاجة اشرف ممن یصیر کذالک"؛(کبیر ایضا)

ترجمہ؛۔جوذات پہلے ہووہ ہمیشہ عزیز،توجہ کے لائق،اورہرقسم کی ضرورت پوری کئے جانے کے قابل اوربعد میں آنے والےلوگوں سے افضل اوراعلیٰ ہوتی ہے،**و لھذا قال علیه الصلوٰة و السلام کنت بنیا و آرم بین المآء و الطین** (کبیر۔ایضا)

یعنی رسول ﷺ کی ذات اقدس سب سے اول سب سے اشرف،اورسب سے اعلیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ خاص اورعطاہائے ازلیہ کی اولین مرکز ہے،مخلوق کی تقادیر کا فیصلہ ازل میں ہوا تھا،روزازل سے ہی دین، دنیا،اورآخرت کی خیرات کثیرہ کا فیصلہ آپ ﷺ کے حق میں کیا جا کرآپ ﷺ کو مالک ومختار بنایا گیا تھا، پھر فرمایا؛۔

کانه یقول انا قدھیانا اسباب سعدتک قبل دخولک فی الوجود فکیف نھمل امرک بعدو جورک و اشتغالک بالعبودیة (کبیر۔ایضا)

ترجمہ:۔گویااللہ تعالیٰ ارشادفرماتاہے۔بےشک ہم نے اے محبوب ﷺ آپکی سعادت کے اسباب آپ ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی مہیا کررکھے تھے،اب آپ ﷺ موجود،اورمصروف عبادت ہیں،کس طرح یہ اسباب نہ دئے جائیں خیرات کثیرہ کیاہیں؟امام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں؛۔

الخیرات الکثیرة و ھی الاسلام، و القرآن، و النبوة، و الذکر الجمیل فی الدنیا و الاخرة (کبیر ۳۲۔۱۲۳)

ترجمہ:۔خیرات کثیرہ، اسلام، قرآن، نبوت، دنیااورآخرت میں آپ ﷺ کاذکرجمیل ہے، یہ تمام چیزیں ہدایت اورایمان ہیں، جب حضور ﷺ کو یہ دی گئیں اوران کا مالک ومتصرف بنایا

گیا، اور روزِ اول سے ہی دی گئیں تو یہ کہنا کہ آپ ﷺ نفع و نقصان کے مالک نہیں، سچ اور حق سے صرف نظر نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت میں کائنات کا وجود اور رنگ آپ ﷺ کی ذات سے ہی فیض یافتہ ہے:۔ آدم علیہ السلام کی خلافت ہو یا نوح علیہ السلام کی نجابت، داوٗد علیہ السلام کی قرأت ہو، یا ابراہیم علیہ السلام کی خلت، موسیٰ علیہ السلام کی کلیمی ہو، یا عیسیٰ علیہ السلام کی مسیحائی یا اسماعیل علیہ السلام کی ذبیحائی ، آسمانوں کی بلندی ہو یا زمینوں کی پستی ، عرش کی عظمت ہو یا لامکان کی رفعت فرشتوں کی عصمت ہو یا حوروں کی عفت، غلمان کا نور ہو یا جنت کا سرور، سورج کی چمک ہو یا ستاروں کی دمک ،کلیوں کی چٹک ہو یا نسیم سحر کی خنک ، چاند کی ضوء فشانی ہو یا ابر نیساں کی روانی ،سمندر کی گہرائی ہو یا موتیوں کی صفائی ، پھولوں کی رعنائی ہو، یا شبنم کی گلشن آرائی ، دلوں کی آشنائی ، ہو یا ضرب **الا اللھی بلکہ ساری خدائی آپ ﷺ کے وجود رحمت کا ہی فیض ہے،،**

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے، دیدۂ کور کو کیا نظر آئے اور کیا دیکھے؟۔،۔

مؤلف نے کتابچہ کے ۲۷ پر بیٹا، بیٹی دینے والا کون؟ کے نام سے عنوان قائم کیا اور دلیل یہ

آیہ کریمہ نقل کی، للہ ملک السمٰوٰت و الارض یخلق مایشآء یھب لمن یشآء اناثا و یھب لمن یشآء الذکور و یجعل من یشآء عقیما انہ علیم قدیر

ترجمہ: اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمان اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطاء فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا ان کو جمع کر دیتا ہے، بیٹے بھی اور بیٹاں بھی اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے، بے شک وہ بڑا جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے،

فائدہ کے ضمن میں لکھا کہ بیٹا، بیٹی، دنیا اللہ کا کام ہے، اس کا اختیار اللہ نے کسی اور کو نہیں دیا، اقول:۔ بیٹا، بیٹی، دنیا یا نہ دنیا اللہ کا کام، اللہ کی قدرت اور اسی کا اختیار ہے،، کسی مسلمان کو اس

میں شک ہے نہ شاہبہ وہم،،لیکن سورۃ مریم میں فرمایا گیا؛۔

فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشیرا اسویا، قالت انی اعوذ بالرحمن منک ان کنت رجلا تقیا قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاما زکیا،

(مریم۔۱۷۔تا۔۱۹)

ترجمہ: پھر ہم نے مریم علیہ السلام کے پاس اپنی روح یعنی جبریل علیہ السلام کو بھجا، پس وہ ایک مکمل انسان کی صورت میں مریم علیہ السلام کے سامنے آئے، وہ کہنے لگیں میں تم سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں ،اگر تو مرد متقی ہی کیوں نہ ہو،، حضرت جبریل علیہ السلام خدا نہیں، خدا کی مخلوق اور رسول علیہ السلام ہیں ،انہوں نے فرمایا: **لاھب لک غلاما ذکیا**، میں اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور تیرے پاس اس لئے آیا ہوں تا کہ تجھے پاک صاف بچہ دوں،، مؤلف کی نقل کردہ آیت میں یھب ہے جس کا معنی ہے اللہ دیتا ہے اور اس آیت میں لاھب ہے یعنی میں دینے آیا ہوں، سورۃ الشوٰری جس کا حوالہ مؤلف نے دیا اس میں یھب ہے یعنی مضارع واحد غائب، اور سورۃ مریم میں اھب واحد متکلم ہے، فعل مضارع ایک اگرچہ اختلاف فاعل ہے، اور معنی بھی ایک ہے، آیت کا ظاہری معنی چھوڑ کر دور کی تاویل لانا درست نہیں، جبرایل علیہ السلام کا یہ کہنا کہ تجھے بیٹا دینے آیا ہوں شرک نہیں؟ اگر نہیں اور یقینا نہیں تو کیوں؟ جبکہ سورہ شوٰری میں صاف بتایا گیا ہے کہ بیٹی، بیٹا، اللہ ہی دیتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے، ماننا پڑے گا کہ جبرائل علیہ السلام نے مجازی طور پر بیٹا دینے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، کیونکہ انہوں نے ہی مریم علیہ السلام کے گریبان میں پھونک ماری تھی، جیسا کہ امام رازی نے فرمایا :

،،واما قولہ لاھب لک غلاما ذکیا: ففی مجازہ وجھان الاوّل اذالھبۃ لما جرت علی یدہ بانّ کان ھو الّذی نفخ فی جیبھا بامر اللہ تعالیٰ جعل نفسہ کانہ ھو الّذی وھب لھا،،

ترجمہ: حضرت جبرائیل علیہ السلام کا فرمان **لاھب لک غلاما ذکیا**، کہنے کی دو وجہیں ہیں فرمایا **لاھب لک الاٰیۃ** امام رازی نے فرمایا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ جبرائیل علیہ السلام خود ایک جسم ہیں اور تمام اجسام باہم تمام ماہیات میں مماثل ہیں۔مگر

"فلما لا یجوز ان یقال ان اللّٰہ تعالیٰ خصّ بعضھا بھذہ القدرۃ رون البعض حتی انہ یصحّ منھا ذالک ولا یصح ذالک من البشری لک" (کبیر، جز۔۲۱۔ص۱۹۸)

مگر یہ بھی جائز ہے، اجزائے انسانی کی ترکیب، عقل، زندگی اور بولنے کی قدرت، پیدا کرنے کی طاقت بشر کے علاوہ بعض نوری اجسام کو ہو اور بعض کو نہ ہو، اسلئے **لاھب لک** کہا ہو۔امام رازی نے فرمایا: ابن عامر رضی اللہ عنہ اور نفع رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لیھب بھی آیا ہے، ایسی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بحیثیت رسول تیرے پاس بھیجا ہے کہ میں تجھے بشارت دوں کہ وہ تجھے گناہوں سے پاک بیٹا عطا فرمائے گا لاھب کی صورت میں حقیقی طور پر بیٹا دینے والا اللہ ہے، جبرائیل نے جو اپنی طرف بیٹا دینے کی نسبت کی ہے یہ مجازاً ہے، جبرائیل نے مریم کے گریبان میں پھونک ماری اور وہ ذریعہ اور سبب بنے، اسطرح حقیقت میں بیٹا اللہ ہی دیتا ہے، مگر اللہ کی بارگاہ میں دعا کر کے وسیلہ بنتا ہے، کوئی عاقل، ایماندار یہ نہیں کہتا کہ فلاں بزرگ یا فلاں ولی نے مجھے بیٹا دیا ہے، بلکہ ہر شخص یہی کہتا ہے، کہ بیٹا اللہ نے دیا ہے اور فلاں بزرگ نے اللہ کے حضور بیٹا دینے کی دعا کی ہے، مزار ولی پر جا کر ولی کی وساطت سے اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کو طلب کرنا جائز ہے شرک یا بدعت نہیں، امام ابن تیمیہ نے تحریر کیا ہے جب تستر فتح ہوا تو ہرمز بادشاہ کے مال خانہ میں تخت پر ایک نعش پائی گئی، اہل تستر محیط اور خشک سالی کے موقعہ پر اس نعش کو تخت سمیت باہر لاتے اور اس کے وسیلہ سے بارش طلب کرتے، اللہ بارش برساتا، یہ نعش حضرت دانیال علیہ السلام کی تھی، قسطنطنیہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار بھی مرجع عوام وخواص تھا، مخلصاً۔(اقتصاء الصراط المستقیم ص ۳۳۹)

حضرت زکریا علیہ السلام نے حجرہ مریم علیہا السلام میں جہاں وہ مریم علیہا السلام کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، مریم کی کرامات دیکھ کر کہ یہاں غیر موسمی پھل اللہ ہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے پاکیزہ اولاد کیلئے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے دعا کو قبول فرمایا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا پیغمبر عطا فرمایا۔

(تفسیر کبیر، زیر آیت نمبر ۳۸) ملاخطہ کریں۔

یہاں اختصار ملحوظ ہے، لیکن ولی کے آستانہ پر جانا اور اسکی وساطت سے اولاد کی خواہش کرنا اور اولاد مانگنا نبی کی سنت ہے شرک اور بدعت نہیں۔

اگر مقام متبرک، اور کرامات مریم علیہا السلام دعا کیلئے زکریا علیہ السلام کو برانگیختہ نہ کرتے تو وہ اس جگہ اور اس وقت دعا کیوں فرماتے؟ اس سے قبل دعا کی نہ بعد۔۔۔۔۔امام ابن تیمیہ نے نقل فرمایا:

"اما نفس التوسل و التوجه الی اللہ و سواله بالاعمال الصالحة التی امر بها، کدعا الثلاثة الذین آووا الی الغار باعمالهم الصالحة، و بدعآء الانبیاء و الصالحین و شفاعتهم فهذا مما لا نزاع فیه بل هو من الوسیلة التی امر اللہ بها فی قوله تعالیٰ')۵:۳۵) یایها الذین امنوا اتقوا اللہ و ابتغوا الیه الوسیلة، و قوله سبحانه '(۱۷،۵۷)' اولٰئک الذین یدعون الی ربهم الوسیلة اقرب و یرجون رحمته، و یخافون عذابه" (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۴۱۰)

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ پیش کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا اعمال صالحہ کی وساطت سے جن کا اللہ تعالیٰ نے خود حکم فرمایا ہے، جیسے غار میں پھنسنے والے تین اشخاص نے اپنے اپنے عمل صالح کی وساطت اور وسیلہ سے دعا مانگی تھی، انبیاء کرام، صالحین سے دعا کرانا، اور ان کی سفارش پیش کرنا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں، بلکہ یہ جملہ اُمور وسیلہ ہیں، اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ کیطرف وسیلہ پکڑو (۵۔۳۵) یہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ان میں سے اللہ کے زیادہ قریب کون ہے؟ وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور

اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔امام ابن تیمیہ کی شخصیت غیر مقلدین، اہل حدیث کے نزدیک ایک حجت ہے، اوران کا فرمان ان کیلئے حرف آخر ہے، امام ابن تیمیہ کے مذکورہ بالا قول کے مطابق حاجت برآری کیلئے اعمال صالحہ، انبیاء، صالحین کا وسیلہ پیش کرنا حکم الٰہی ہے جب حکم الٰہی ہے تو یہ شرک کیسا؟ اور کیوں ہے، پھر امام مذکور کے ہمنوا اور متبعین مسلمانوں کو اس امر الٰہی پر چلنے، اور روبعمل لانے سے روکتے اور منع کیوں کرتے ہیں؟

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۳۷ پر موٹی سرخی جمائی کہ مخلوق بے بس ہے، اور اس کو ثابت کرنے کیلئے سورۃ حج کی آیت (۷۳) نقل کی: "**یا یھا الناس، ضرب مثل فاستمعوا لہ، ان الذین تدعون من دون اللہ، لن یخلقوا ذبابا، و بوا جتمعوا لہ، و ان یسلبھم الذباب شیاء لا یستنقدوہ منہ ضعف الطالب، و المطلوب**"

ترجمہ: اے لوگو ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے، اسکو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، وہ ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، گو سب کے سب بھی کیوں نہ جمع ہو جائیں، اور پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ ایسے عاجز ہیں کہ اگر ان سے مکھی کچھ چھین کر لے جائے اس کو تو اس سے چھڑا ہی نہیں سکتے، ایسا عابد بھی لچر ایسا معبود بھی لچر ، فائدہ کے تحت لکھا کہ اس آیت نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ اختیارات سب کے سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، دوسروں کو تو اتنا اختیار بھی نہیں کہ مکھی جیسی ناقص مخلوق کو پیدا کر دیں، پیدا کرنا تو درکنار مکھی کی چھینی ہوئی چیز بھی اس سے واپس نہیں کر سکتے، جو اتنے معمولی کام کی قدرت نہیں رکھتے وہ مختار کل کیسے بن سکتے ہیں، ہمارے بڑے بڑے کام کیسے کر سکیں گے۔

اقول: مؤلف کے عقل و دانش اور علم قرآن پر رونا اس لئے نہیں آتا، کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی دشمنی اور بغض اوّلیاء میں یہ بلند پایہ، نورانی، عرفانی صلاحیات ان سے سلب کر لی

ہیں، ایک سادہ ترجمہ جاننے والا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ یہ آیت بتوں، اور بتوں کے بچاریوں کی حماقت اور کمزوری میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ مشرکین بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں سفارشی اور وسیلہ کے طور پر پیش نہیں کرتے تھے، بلکہ معبود حقیقی، مستحق عبادت گردان کران کی عبادت کرتے اور تمام اختیارات اور تصرفات کا مالک سمجھ کران سے حاجات طلب کرتے تھے، اور وجود باری تعالیٰ کے منکر تھے، کیا اوٗلیائے کرام کو ماننے والے مسلمان اوٗلیاء کی عبادت کرتے ہیں؟ معبود حقیقی سمجھ کران کو سیاہ وسفید کا مالک جانتے ہیں؟ ان کو موت وحیات کا خالق مانتے ہیں؟ ان کے مزارات پران کا حق شرعی مان کر جاتے ہیں، اہل سنت وجماعت ان نظریات پر لعنت بھیجتے اور ایسا کرنے والے کو دائرہ ایمان سے خارج جانتے اور مانتے ہیں، اور ان مشرکانہ اور کفریہ عقائد کو اہل سنت وجماعت کی طرف منسوب کرنے والے کو دین سے دور اور بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔

انبیائے کرام، صالحین، دعا کی قبولیت کا ایک ذریعہ، اور وسیلہ ہیں، قرآن مجید نے ان کو وسیلہ کہا اور ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، امام ابن تیمیہ کا عقیدہ ان کی تالیف اقتضاء الصراط المستقیم سے پہلے نقل ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کے خالق کل، مالک کل، مختار کل ہونے میں کس کو اختلاف یا انکار ہے؟ ایک مومن بھول کر بھی کہہ یا سوچ سکتا ہے۔

مؤلف اور ان کے پیشروں نے مشرکین اور بتوں کی مذمت میں نازل ہونے والی آیات کو مومنین اور صالحین پر چسپاں کرتے وقت ذرہ بھر علمی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور نہ خوف خدا کو مشعل راہ بنایا، کروڑوں، رحمتیں نازل ہوں ان اکابرین اُمت کے مزارات پر انوار پر جنہوں نے علمی تحقیقات، اور مسلمہ تفسیرات کے ایسے چراغ جلائے جن کی روشنی سے قیامت تک امت مسلمہ فیضیاب ہوتی رہے گی، انہوں نے حق وصداقت کے ایسے بلند مینار تعمیر کئے، باطل شعلہ سامان ہونے کے باوجود ان سے ٹکرا کر ہمیشہ پاش، پاش ہوتا رہا ہے، آئیے دیکھیں اس آیت کا مخا

طب کون ہے، مکھی جیسی چھوٹی چیز چھین کر اڑے تو واپس کرنے کی طاقت کس کو نہیں؟ امام رازی نے فرمایا: ''**فکانہ سبحانہ قال ان ھذہ الاصنام وان اجتمعت لن تقدر علی خلق ذبابۃ علی صنمھا**'' ضعت الطالب والمطلوب پر فرمایا:

''**المرادمنہ الصنم والذباب، الصنم کاالطالب والذباب بمنزلۃ المطلوب، ان الطالب من عبدالصنم، والمطلوب نفس الصنم**'' (کبیر۔جز۔۲۳۔۶۸۔ص ۶۹)

ترجمہ: گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا،، بلاشبہ یہ بت سارے کے سارے اگر جمع ہو جائیں، مکھی جیسی کمزور شیء کو ہرگز پیدا نہیں کرسکیں گے، یعنی نہ اب اور نہ آئندہ، طالب سے مراد بت ہے جو انتہائی کمزور ہے، اوراس سے مراد مکھی بھی ہے، بت طالب کے قائم مقام اور مکھی مطلوب کے قائم مقام ہے، طالب وہ ہے جس نے بت، بتوں کی پوجا کی ہے، اور مطلوب صرف بت ہے بت ہیں، حافظ ابن کثیر نے فرمایا:

''**ای لو اجتمع جمیع ماتعبدون من الاصنام والانداد علی ان یقدروا علی خلق ذباب واحدماقدرواعلی ذالک**'' (ابن کثیر جلد ۳، ص ۲۳۵)

ترجمہ: یعنی تمام وہ بت جنکی تم عبادت کرتے ہو، اکھٹے ہو کر ایک مکھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے پھر فرمایا: ''**قال ابن عباس الطالب الصنم والمطلوب الذباب، واختارہ ابن جریر ھو ظاھر السیاق**'' (ابن کثیر ایضا)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: الطالب سے مراد بت ہیں اور المطلوب سے مراد مکھی ہے، سیاق کے حوالے سے امام ابن جریر نے اسی کو اختیار فرمایا ہے:

ان مستند اور بلند پایہ تفاسیر سے معلوم ہوا کہ مؤلف کی نقل کردہ آیت مشرکین اور بتوں کی مذمت اور بے بسی پر نازل ہوئی ہے، انسان بتوں کی طرح بے شعور، لاعلم، نابینا، بدوں حیات پتھر محض نہیں وہ سنتا، دیکھتا، عقل رکھتا اور صاحب دل ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھ، سن، اور سمجھ کر،

کائنات ارضی اور سماوی میں غور وفکر کرنے کی تلقین کی اور دعوت دی ہے، زمین، آسمان، چاند، ستارے سورج، روشنی، دن، رات، بارش، ہوا، مشارق ومغارب کی پہنائیوں پر محیط سینہ ارض پراُ گی نباتات، اور باغات، پانی کے اُبلتے چشمے، بہتی نہروں اور دریاؤں کی بپھری موجیں، سمندر کا خوفناک منظر، اسکی سطح پر پہاڑوں ایسی کشتیاں اور جہاز، گھنے سایہ دار اشجار، گنگناتی ندیاں، اور گرتے آبشار، فلک بوس، غیر متناہی کوہسار، چہکتے اڑتے پھرتے پرندتے اور جانور دلائل توحید ہیں اللہ تعالیٰ نے پوری زمین اور اسکے اوپر، اور اندر موجود خزانوں کا بندہ انسان کو مالک بنا کر افادہ اور استعفادہ کا کلی اختیار دے کر فرمایا کہ:

''لآیات لقوم یعقلون''(۲۔۱۶۴)

پھر اپنے رسول ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:''قل ھو الذی انشاء کم و جعل لکم السمع والا بصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون''(ملک، ۲۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت فکر، دی اور فرمایا کہ تمہیں نظام کائنات کے ارتباط اور انضباط سے توحید باری تعالیٰ پر استدلال کرنا چاہئیے کہ یہ نظام، تمہارے دیکھنے سننے اور سمجھنے کے لائق ہے، بلکہ اگر تم اپنی پیدائش پر غور کرو کہ کس چیز سے ہوئی، اور کن کن مراحل، اور کیسے کیسے ادوار سے گزر کر شکل انسانی دنیا میں جلوہ گر ہوئی، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ وحدت، علم محیط اور دیگر صفات ذاتیہ پر ایمان لانے کیلئے سب سے بڑی دلیل خود تمہارا اپنا عدم سے معرض وجود میں آنا ہے، غرضیکہ انسان مجبور، بے بس، نہیں جیسا کہ فرقہ جبریہ کا کہنا ہے۔

اور''خلق لکم ما فی الارض جمیعا''کے فرمان سے بااختیار بنایا ہے،، اور جو انسان دنیا سے چلا گیا ہے، وہ بھی پتھر محض نہیں، اگرچہ کافر ہی کیوں نہ ہو؟ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:''بنیا رسول ﷺ فی حائط لبنی النجار علی بغلۃ لہ و نحن معہ از حارت بہ فکادت تلقیہ و اذا اقبر ستۃ او خمسۃ من یعرف اصحاب ھذا الاقبر، قال

رجل انا قال فمتی ماتو اقال فی الشرک فقال ان ھذا الامۃ تبتلی فی قبورھا فلو لا ان لا تدافنو الدعوت اللہ ان یسمعکم من عذاب القبر الذی اسمع منہ، "الحدیث، رواہ مسلم ، مشکوٰۃ باب اثابت عذاب القبر" (۲۵)

ترجمہ: رسول ﷺ بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے، اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، اچانک پانچ یا چھ قبروں کا انکشاف ہوا۔ ان کی وجہ سے خچر بھدک گیا اور رسول ﷺ قریب تھا کہ گر پڑیں ، آپ ﷺ نے فرمایا ان قبور والوں کی نسبت کسی کو علم ہے کہ وہ کس دین پر مرے؟ ایک شخص بولا میں جانتا ہوں فرمایا یہ لوگ کب مرے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ زمانہ شرک میں فرمایا، انکو قبروں میں عذاب ہو رہا ہے، تم ان کو دوبارہ دفن نہیں کر سکو گے، ورنہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا قبر کا عذاب جو میں سنتا ہوں اللہ تعالیٰ تمہیں بھی سناتا ، رسول ﷺ کا ایک ایسے مقام پر گذر ہوا جہاں یہودی اکٹھے ہو کر ایک یہودی عورت کی وفات پر رو رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "

، انھم یبکون علیھا و انھا لتعذب فی قبرھا (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

یہ اس یہودی عورت کو رو رہے ہیں، اور ان کے رونے سے اسکو قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے،، ہر دو احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ کافر، یہودی نصرانی، اور فاسق و فاجر بھی قبر میں نیست و نابود ہوئے نہ محض پتھر کی مانند ہیں، چہ جائیکہ اوّلیائے کرام اور صلحائے عظام نیست و نابود ہو گئے ہوں یا بتوں کی طرح پتھروں کی مانند ہوں،، نہ سن سکیں، نہ جواب دیں، اور نہ پہچانیں، اور نہ فیوض و برکات سے نوازیں، ان کی قبور تو باغ ہائے جنت ہیں، عذاب کے گڑھے نہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا مومن کی قبر جنت کی کیاریوں میں سے ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی

توحید کے اقرار اور اتباع رسول ﷺ کے اظہار میں بسر ہوئی ،قبر میں گئے تو فرشتوں نے

توحیداوررسالت کی نسبت سوال کیا،تو" اشھدان لا الہ الا اللہ و ان محمد عبدہ و رسولہ" پڑھ کرجواب دیا جس پر ساٹھ یا ستر ہاتھ چوڑی اور لمبی ،نور سے معمور قبر میں "نم کنوم العروس" کااعزاز حاصل کیا(مشکوٰۃ) اوّلیائے کرام صلحائے عظام پتھر کی طرح فضول اور بیکار پڑے ہوئے نہیں وہ اپنی قبور میں زندہ ہیں،اورجنت کے باغیچہ میں سو رہے ہیں۔اس عنوان پر تفصیلی بحث حضرت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فیصلہ کے تحت پہلے ہو چکی ہے، یہاں مزید طوالت سے گریز کیا جاتا ہے۔

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۵۷ پر بشریت رسول ﷺ کا عنوان قائم کیا، اوراعلیٰ حضرت احمدرضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ایک حوالہ نقل فرمایا کہ،اجماع اہل سنت ہے کہ بشر میں انبیاء کے سوا کوئی معصوم نہیں جو دوسرے کو معصوم جانے اہل سنت سے خارج ہے۔

فائدہ کے تحت کہا کہ اس میں تصریح نہیں کہ تمام انبیائے کرام بشر ہیں اور ایسے بشر ہیں ان سے گناہ صادر نہیں ہوتا۔

اقول: مؤلف نے اعلیٰ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی تحریر سے صرف یہ ثابت کیا ہے، کہ حضور ﷺ بشر ہیں، جبکہ اعلی حضرت کی یہ تحریر تین اُمور کو ثابت کر رہی ہے۔

(۱) نبی گناہ سے معصوم ہوتا ہے،اور کوئی فرد معصوم نہیں، جو کسی اور کو بھی معصوم جانے وہ اہل السنتہ سے نہیں، یہ شیعہ کے فرقہ امامیہ کا رد ہے، جو بارہ امام مانتے اور ان کو معصوم کہتے ہیں۔

(۲) انبیاء کرام کی بشریت یعنی صورت ظاہرہ کا بیان ہے، کیونکہ ہر نبی صورت بشری میں ہی آتا ہے، بلکہ ملکی رسول بھی صورت بشری میں ہی آئے ہیں، قرآن حکیم میں پوری تفصیل موجود ہے۔

(۳) کہ نبی کی بشریت، دیگر نوع انسانی کی بشریت سے ممتاز،اور برتر ہوتی ہے نبی بشر ہونے کے باجود گناہ اور معصیت کی قدرت نہیں رکھتا، جبکہ دیگر افراد انسانی گناہ کی قدرت رکھتے اور

معصیت کا عملی طور پر ارتکاب بھی کرتے ہیں، انبیاء کی بشریت، بشریت معہ نبوت ہوتی ہے، یہ بشریت مخصوص اور بقید نبوت ہے، اور عام لوگوں کی بشریت من بحیث البشر ہے، دونوں میں مطلق، مقید، مخصوص اور عام کا فرق ملحوظ ہے، اعلیٰ حضرت کی تحریر میں بشریت من حیث النبوۃ ہے جیسا کہ انہوں نے انبیاء کو معصوم کہا، اور بشر معصوم وہی ہوسکتا ہے، جو نبی ہو، نبی کے علاوہ کوئی فرد بشر معصوم نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام کے بشر محض ہونے کے قائل نہیں۔ بلکہ بشریت سے مراد من حیث النبوۃ کے قائل ہیں، اور یہی مضمون ان کی تحریر ثابت کرتی ہے، مؤلف کا انبیاء کرام کے بشر محض ہونے پر اس تحریر کو پیش کرنا غلط ہے، اگر نبی بشر محض ہوتے تو ان سے گناہ کا صدور ناممکن کیوں ہوتا؟ انبیائے کرام کو عصمت دلانے والی بشریت نہیں بلکہ نبوت ہے، جس کا محل بشریت ہے، اور یہ وہ بشریت ہے جو منصب نبوت پر فائز ہے، فتدبر، وتفکر، معلوم ہونا چاہیے انبیائے کرام کی حقیقت ماہیت، اور دوسرے افراد انسانی کی حقیقت اور ماہیت، میں کوئی قدرے مشترک نہیں، امام رازی نے نقل فرمایا:

"وذکر الحلیمی فی کتاب المنہاج ان الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لابدوان یکونوا مخالفین لغیرھم فی القوی الجسمانیۃ والقوی الروّحانیۃ، اما القوی الجسمانیۃ فھو امامدرکۃ، وامامحرکۃ"

ترجمہ: مفسر حلیمی نے اپنی کتاب المنہاج میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء کرام کیلئے لازمی ہے کہ وہ جسمانی اور روحانی قوی (قوتوں استعداد) کے اعتبار سے دیگر انسانوں کے مخالف اور ان سے مختلف ہوں، جسمانی قوتوں کی دو قسمیں ہیں،

(۱) حواس ظاہرہ (۲) حواس باطنہ

حواس ظاہرہ: یہ پانچ ہیں، **احدھا القوۃ الباصرۃ ولقد کان الرسول** ﷺ **مخصوصًا**

بکمال هذه الصفة، ویدل علیه وجهان، الاوّل قوله ﷺ ذویت لی الارض فاریت مشارقها ومغاربها، والثانی: قوله ﷺ اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظهری،،

ترجمہ: حواس خمسہ میں پہلی قوت باصرہ یعنی دیکھنے کی قوت ہے یہ صفت نبی کریم ﷺ کو خصوصا کامل اور مکمل طور پر دی گئی ہے اور اس پر دو وجہیں دلالت کرتی ہیں۔

(۱) آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ میرے لئے زمین سمیٹی گئی اس کے مشارق اور، مغارب مجھے دکھائے گئے۔

(۲) تم اپنی صفیں سیدھی کرو، اور کندھے سے کندھا ملاؤ، بے شک میں تمھیں پیٹھ کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں،، اسکی مثال وہ قوت باصرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’**وکذالک نری ابراهیم ملکوت السمٰوٰت والارض،،** مفسرین نے اسکی تفسیر میں فرمایا: ’’**انه تعالیٰ قوی بصره حتی شاهد جمیع الملکوت من الاعلیٰ والاسفل**‘‘

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابرہیم علیہ السلام کو دیکھنے کی اسقدر قوت عطا فرمائی کہ انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کے تمام طبقات یعنی حصوں کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھ لیا۔ پھر فرمایا:

’’فلا یبعد ان یکون بصر النبی ﷺ اقوی من بصرها‘‘

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کی قوت بصر کا ان کی قوت بصر سے زیادہ طاقت ور ہونا کوئی بعید نہیں۔

دوسری سننے کی قوت ہے: ’’**وکان ﷺ اقوی الناس فی هذه القوة ویدل علیه وجهان**‘‘

ترجمہ : تمام نوع انسانی سے رسول ﷺ کی قوت سماعت زیادہ تھی، اور اسکی دو دلیلیں ہیں،

’’احدها قوله ﷺ اطت السمآء وحق لها ان تئط ما فیها موضع قدم الا وفیه ملک ساجد لِلّٰہ تعالیٰ، فسمع اطیط السمآء‘‘

ترجمہ: رسول ﷺ کا فرمان ہے، آسمان آوازیں نکال رہا ہے، اور یہ اس کا حق ہے، اسلئے کہ ہر قدم کی جگہ پر فرشتہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے آپ ﷺ نے آسمان کے چڑ چڑ کرنے کی آواز سنی ایک عجیب آواز سماعت فرمائی گئی۔

دوسری دلیل "ذکر انہ ھوی صخرۃ قذفت فی جھنم فلم تبلغ قعرھا الی الان"

ترجمہ: یہ آواز ایک پتھر کی ہے جو جہنم میں پھینکا گیا ہے مگر ابھی تک اسکی تہہ میں نہیں پہنچا ،، امام رازی فرماتے ہیں اس قوت سماعت کی مثال حضرت سلیمان علیہ السلام اور چیونٹی کی گفتگو

حضرت سلیمان علیہ السلام اور چیونٹی کا واقعہ ہے کہ چیونٹی نے ساتھی چیونٹوں سے کہا کہ اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ، اللہ تعالیٰ نے چیونٹیوں کی گفتگو سلیمان علیہ السلام کو سنائی، جانوروں کی بولیاں سمجھنے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حد درجہ دے رکھی تھی، جیسا کہ بھیڑیئے، اور اونٹ نے آپ ﷺ سے کلام کیا۔

تیسری قوت شامہ: یعنی سونگھنے کی قوت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص اتاری، اور قافلے والوں کو دی کہ میرے والد کے چہرے پر ڈالنا اس سے ان کی بینائی لوٹ آئیگی قافلہ روانہ ہوا تو کئی دنوں کی مسافت سے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: "انی لاجد ریح یوسف علیہ السلام، مجھے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آرہی ہے۔

چوتھی قوت ذائقہ ہے: یہ قوت بھی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو بدرجہ اتم دے رکھی تھی، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ان ھذا الذراع یخبرنی انہ مسموم"

ترجمہ: بکری کا یہ پاؤں مجھے بتا رہا ہے کہ مجھ میں زہر ملا ہوا ہے،،

(کلھا من الکبیر۔ الجز الثامن ص ۲۳، ۲۲)

مندرجہ بالا تفسیری عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیھم السلام بشر ہوتے ہیں مگر ان کے حواس ظاہرہ اور حواس باطنہ اتنے قوی اور بلیغ ہوتے ہیں، کہ دیگر انسانوں کے حواس کا ان

کے قریب سے گزر تک نہیں ہوتا۔امام رازی فرماتے ہیں:

”واعلم ان تمام الکلام فی ھذا الباب ان النفس القدسیة البنویة مخالفة بماھیاتھا لسائر النفوس،،

ترجمہ:۔خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیھم السلام کے نفوس مقدسہ اپنی حقیقت اور ماہیت میں دوسرے افراد انسانی سے مختلف اور مغائر ہوتے ہیں۔صرف ظاہری شکل وصورت میں دیگر انسانوں کے مماثل ہوتے ہیں،اوراسی کا نام بشریت ہے۔

ان تمام دلائل،اور توضیحات کو پڑھ کو بھی یہ کہا جائے کہ انبیائے کرام علیھم السلام بشمول رسول ﷺ عام بشر تھے،تو کہنے والے کی اپنی مرضی،ہم تو اس کیلئے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ اسکو ہدایت عطا فرمائے۔

علم غیب کے عنوان کے تحت نقل کیا کہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ رسول ﷺ کیلئے علم محیط اور علم غیب عطائی کلی کے قائل نہ تھے،آپ رقمطراز ہیں،کہ ہم نہ علم الہی سے مساوات مانیں،اور نہ غیر کیلئے علم بالذات جانیں اور عطاء الہی سے بھی بعض علم ہی مانتے ہیں،نہ کہ جمیع،فائدہ کے تحت مؤلف نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ ان کی سوچ اوران کا ہی عندیہ ہے ہم من کل الوجوہ اسکی تائید کرتے ہیں نہ توثیق۔

اقول :اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے اہل سنت وجماعت کا اصولی موقف بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں،ص ۲،نبی کریم ﷺ کا عطائی علم،علم باری تعالیٰ کے مساوی نہیں،علم الہی کے مقابل رسول اللہ ﷺ کا علم عطائی بعض بلکہ اس سے بھی کم ہے،اس عبارت میں علم غیب جاننے کا انکار ہے،اور نہ دعوٰی مساوات،،اللہ کا علم کلی،ذاتی،ازلی،ابدی اور سرمدی ہے،اوراگر ما کان وما یکون کے علم کو،علم کلی تسلیم کیا جائے تو بھی،یہ علم الہی کے مقابل بعض ہے،اسلئے کہ علم الہی غیر متناہی بالفعل ہے،اور ما کان وما یکون کا علم متناہی بالفعل ہے

، کیونکہ یہ صرف موجودات کا علم ہے، مگر اجمالی اور عطائی ہے، اللہ تعالیٰ کا علم موجودات معدومات پر حاوی، ذاتی اور تفصیلی ہے، رسول اللہ ﷺ کا علم حادث ہے، قدیم نہیں، جبکہ اللہ کا علم قدیم ہے، رسول اللہ ﷺ کا علم، حصول صورت کی وجہ سے حصولی ہے، اور اللہ کا علم قدیم اور حضوری ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''لا یعزب عنه مثقال ذرة،، و ما تسقط من ورقة الا و هو یعلمها،، ازل سے لے کر ابد تک ہر ہر ذرہ اپنے وجود، ماہیت اور خاصیت کے ساتھ اسکے سامنے حاضر ہے،، اتنے امتیازات اور فصولات کو نظر انداز کر کے اگر کوئی یہ کہے کہ اہل سنت وجماعت علم رسول ﷺ کو علم باری تعالیٰ کے مساوی قرار دیتے ہیں تو یہ جہالت اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

امام رازی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول نقل فرمایا:

''قال علی علیه السلام، علمنی رسول ﷺ الف باب من العلم، و استنبطت من کل باب الف باب، فاذا کان حال الولی هکذا فکیف حال النبی ﷺ (کبیر۔جز، ۸ ص ۲۳)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ رسول ﷺ نے مجھے علم کا ہزار باب سکھایا۔ اور میں نے آگے ہر باب سے، علم کے ہزار، ہزار باب کا استنباط کیا، جب ایک ولی کے علم کا یہ حال ہے تو نبی کریم ﷺ کے علم کا کیا حال ہوگا؟ یعنی نبی کریم ﷺ نے ایک ہزار قسم کے علوم سکھائے اور پھر میں نے ہر ایک علم سے آگے ہزار، ہزار کا مزید استنباط اور استخراج کیا،، امام رازی نے فرمایا جب ولی اتنے علوم کا عالم ہے تو نبی کریم ﷺ کے علم کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے؟ علمائے اُمت اور محققین ملت نے حضور ﷺ کے علم کو کلی اور جزی کے پیمانے پر ناپا نہ تولا بلکہ یہ فرمایا کہ:

اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے مگر آج کی دنیا کے لوگ اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ کو علم غیب تھا ہی نہیں، اگر تھا تو بس اتنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

: ''حفظت من رسول ﷺ وعائین، فاما احدھا فبششته، فیکم و اما الاخر فلو بششة قطع، ھذا البلعوم یعنی مجری الطعام رواہ البخاری مشکوٰۃ ص ۳۷''

ترجمہ : میں نے رسول اللہ ﷺ کے علم کے دیئے ہوئے دو برتن محفوظ کئے ہوئے ہیں، ایک برتن تمہارے سامنے تم میں کھول دیا ہے، اور اگر دوسرا برتن کھول دوں تو میری شہ رگ کاٹ دی جائے،، شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی نے تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''المراد بالاول علم الاحکام و الثانی علم الاسرار المصئون عن الاغیار ، المختص بالعلماء باللہ من اھل العرفان و اراد بہ اخبار الفتن و قساد الذین علی ید اغلمۃ من قریش و کان ابو ھریرہ یکنی عن بعض و لا یصرح بہ خوفا علی نفسہ ، الخ

''(اشعۃ اللمعات، حاشیہ مشکوٰۃ ص ۳۷)

ترجمہ: پہلے برتن سے مراد، علم الاحکام، یعنی علم شریعت ہے، اور دوسرے برتن سے مراد علم الاسرار ہے، جو غیر محرم سے چھپایا جاتا ہے، اور یہ علم مخصوص ہے علمائے عارفین کیلئے، اس سے مراد وہ فتنے اور فساد ہیں جو بعد میں دین میں پیدا ہونے والے تھے، اور جن کے بانی مبانی قریش کے لونڈے تھے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اشارتاً ان کا ذکر کرتے تھے، جان کے خوف کی وجہ سے بر ملا ان کا اظہار نہیں فرماتے تھے،

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا کہ رسول ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو علم شریعت کے ہمراہ علم الاسرار بھی عطا فرمایا، علم الاسرار کیا ہے؟ مستقبل میں ہونے والے حالات و واقعات کا علم جو حواس خمسہ، اور عقلی دسترس سے باہر ہے، اور یہی علم غیب ہے، جیسا کہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ اور امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ علم کس نے دیا اور سکھایا رسول اللہ ﷺ نے اگر بعطائے الٰہی رسول ﷺ کو خود علم غیب نہ ہوتا تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو امور غاکہ مستقبلہ کا علم کیسے سکھاتے ؟

مؤلف نے کتابچہ کے ص ۷۶ پر تحریر کیا کہ اعلیٰ حضرت علم غیب کو کمال ہی نہیں سمجھتے،

اقول: مؤلف نے پہلے اعلیٰ حضرت کا اقتباس دربارۂ علم غیب نقل کیا، اور کہا کہ وہ علم غیب کلی کے قائل نہیں عطائی جزی سے بھی کم مانتے ہیں، اور صفحہ مذکور پر نقل کیا کہ اعلیٰ حضرت علم غیب کو صفت کمال ہی نہیں سمجھتے، یہ کہنا اور تحریر کرنا غلط ہے، اعلیٰ حضرت کا یہ عقیدہ نہیں، اگر کمال نہ سمجھتے ہوتے تو جزی عطائی کا قول کیوں کرتے؟ مؤلف نے جو گدھے کا واقعہ تحریر کیا ہے اسکی تردید فرمائی ہے کہ گدھے کی یہ صفت علم غیب میں نہیں آتی، کیونکہ جانور کی صفت کو انسانی کمال نہیں کہا جا سکتا، چہ جائیکہ جانور کی کسی صفت کو نعوذ باللہ ذات نبوت کیلئے تسلیم کیا جائے، ذہن میں رکھنا چاہیے کہ غیب کا علم معجزات میں سے ہے، اور معجزہ ماہیت نبوت کو لازم ہے، اور معجزہ (علم غیب) نبی کیلئے مختص ہے، اور یہ بلند پایہ کمال ہے اگر اخبار عن الغیب کمال اور معجزہ نہ ہوتا اور ماہیت نبوت کو لازم نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو **یا ایھا النبی** کے عالی لقب، اور عظیم المرتبت منصب اور مقام کے حوالے سے کیوں مخاطب فرماتا۔ اگر علم غیب کمال نہ ہوتا اللہ تعالیٰ **تلک من انبآء الغیب نوحیدالیک** کے ذریعے وحی کیوں فرماتا؟ مزید **ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب و لکن یجتبی من رسلہ من تشآء فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول الایہ**'' کے ارشادات کیوں فرماتا؟ اعلیٰ حضرت نے تو گدھے کی اس صفت کو صفت انسانی سے خارج کیا ہے؟ جس کے تحت وہ گدھا اس مخفی شی کی تلاش کرتا تھا، گدھے کے اس فعل کا نام جو بھی ہو علم غیب کے زمرہ میں نہیں آتا اس لئے کہ یہ اس کی حس تھی جس کے تحت وہ نشاندہی کرتا تھا، جس کے ذریعے جانور اور پرند، بلکہ چیونٹی غلہ کے دانوں تک پہنچ جاتی

ہے، روغنی اور میٹھی اشیاء جہاں بھی ہوں پہنچ جاتی ہے، گدھ مردار کی بو سونگھ کر جہاں بھی ہو پہنچ کر نوالہ بنالیتی ہے، خواہ وہ مردار، گھاٹی، جنگل، غار یا کسی نامعلوم جگہ پر کیوں نہ پڑا ہو؟ موجودہ دور میں چوری، ڈکیتی، اور قتل کا سراغ لگانے کیلئے سراغ رساں کتوں سے کام لیا جاتا ہے، کتے انہی راہوں سے گزر کر قاتل، چور، اور مال مسروقہ تک پہنچ جاتے ہیں، یہ علم کا کمال نہیں بلکہ حس کا کمال ہے، گدھا اپنی حس کے ذریعے مخفی چیز تک پہنچتا تھا، غیب ایک ایسا علم ہے، جو حواس اور عقل کی پرواز سے بالاتر ہے، اور یہ نبوت کا خاصہ ہے، مزید کشف اور اشیاء غائبہ کا معائنہ انسان اور بالخصوص مومن کا خاصہ ہے، رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور اللہ"

ترجمہ: مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، ملا علی قاری نے نقل فرمایا: "قال ابو سلیمان الدارنی الفراسة مکاشفة النفس, و معاینة الغیب"

(شرح فقہ اکبر ص ۹۵)

ترجمہ: فراست نفس کے مکاشفہ، یعنی کشف نفس اور مخفی چیز کے معائنہ کا نام ہے، الفاظ حدیث کی روشنی میں کشف اور معائنہ غیب کیلئے انسان، ایمان اور ایمان پر مرتب اور نازل ہونے والے نور کا ہونا ضروری ہے، جانور اور دیگر پرندے چونکہ ان صفات سے محروم ہیں لہذا ان کی وہ صفت جس سے وہ مخفی چیز تک رسائی حاصل کرتے ہیں کشف ہے نہ علم غیب، بلکہ وہ حس حیوانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھی ہے جو ان کی روزی اور خوراک کا ذریعہ بنتی ہے، یہ سائنسی دور ہے، سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہر مشکل کو آسان اور بہت ہی دور کی چیز کو قریب تر کر دیا ہے، مثلاً موبائل فون نے مشرق و مغرب کا فاصلہ سمیٹ دیا ہے، ٹی۔وی کے آلات نے نہ صرف طویل ترین فاصلہ مٹایا بلکہ انسان، اسکی ہر ہر حرکت، اور آواز کو اسی لمحہ دکھایا جس لمحہ وہ عمل کر رہا ہے، الٹراساونڈ مشین نے پیٹ کے جملہ اعضائے رئیسہ ان پر بیماری

کے حملہ اوراس کے اثرات چن چن کر دکھائے ،عورت کے پیٹ کا حمل بچہ ہے یا بچی نکھار کر دکھایا بلکہ مہینوں ،ہفتوں کا تعین بھی کیا کہ اتنے ہفتوں یا مہینوں کا حمل ہے؟ کیا کوئی ذی شعور انسان ان حقائق سے انکار کرسکتا ہے؟ ماننا پڑیگا کہ انسانی اورسائینسی ایجادات سے کائنات کی کوئی شی

پوشیدہ نہیں رہی سب کچھ ہونے کے باوجود یہ کرشمہ ہائے علم سائنس تو ہیں مگر علوم غیبیہ نہیں ،کیونکہ یہ صفت ذاتی طور پرشان خداوندی ہے،اورعطائی طور پر نبوت کی آن اوراسکی پہچان ہے مؤلف اعلیٰ حضرت کی تحریر نہیں سمجھ سکے اس لئے وہ غلط راہ پر چل پڑے،،

اسیطرح مولانا سید دیدارعلی شاہ بریلوی کا یہ تحریر فرمانا کہ ’’لفظ حاضرو ناظر سے اگر حضور ﷺ ونظور بالذات مثل حضور ونظور باری تعالیٰ ہر وقت ولحظہ مراد ہے تو یہ عقیدہ محض غلط اور مفضی الی الشرک ہے، الااہل اسلام میں یہ عقیدہ کسی جاہل،اجہل کا بھی نہ ہوگا،،

اس تحریر کے بعد مؤلف نے جو کچھ فائدہ کے تحت لکھا کہ حضور ﷺ کی ذات گرامی ہر وقت ہر لحظ حاضرو ناظر سمجھنا شرکیہ عقیدہ ہے،،

اقول: شاہ صاحب مرحوم ومغفور کی عبارت سیدھی سیدھی اورسورج کی طرح واضح اورروشن ہے،آپ نے مطلقاً حاضرو ناظر ماننے کو شرکیہ عقیدہ نہیں فرمایا،مؤلف نے خیانت کا مظاہرہ کیا

ہے،شاہ صاحب نے واضح تحریر فرمایا ہے کہ جسطرح اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر وقت اور ہر لحظہ حاضرو ناظر ہے، اگراس طرح رسول ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرح آپ ﷺ ذاتی طور پر ہر وقت اور ہر لحظ حاضرو ناظر ہیں تو یہ عقیدہ شرکیہ ہوگا،لیکن بعد میں خود بتا دیا کہ ایسا عقیدہ جاہل اوراجہل مسلمان کا بھی نہیں،مؤلف نے کمال جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب کی عبارت کو غلط رنگ دیا اورغلط مفہوم میں پیش کیا ہے،